ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مُرتّبہ

سعید احمد اکبر آبادی

ندوۃ المصنفین کی دینی اور اجتماعی کتابیں

اسلام کا اقتصادی نظام

وقت کی ایک انقلاب انگیز کتاب، جس میں اسلام کے معاشی نظام کا جامع نقشہ پیش کیا گیا ہے، چوتھا ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں۔

قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

اسلام کا نظامِ مساجد

نظامِ مساجد کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث اور اس کی منفعتوں اور برکتوں کی تفصیل۔

قیمت [illegible] مجلد [illegible]

اسلام کا نظامِ عفّت وعصمت

عفّت وعصمت اور اُن کے لوازم پر بصیرت افروز بحث اور نظامِ عفّت کی اسلامی خصوصیتوں کی دل پذیر تشریح۔ لائق مطالعہ کتاب، قیمت [illegible] مجلد [illegible]۔

اسلام کا زرعی نظام

اسلام کے نظامِ زراعت پر ایک جامع کتاب، زمین کی تقسیم کے اصول اور خلافت راشدہ کے زمانے میں کاشتکاروں کے لئے جو سہولتیں فراہم کی گئی ہیں ان کی تفصیل

قیمت [illegible] مجلد [illegible]

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی کی تحقیق پر معرکۃ الآرا کتاب جس میں انفرادی اور اجتماعی غلامی کے ایک ایک پہلو پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔

(قیمت [illegible] مجلد [illegible])

قرآن اور تعمیر سیرت

ایک عظیم الشان اصلاحی کتاب

قرآن مجید کی تعلیم وتربیت کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور اس کے ذریعہ سے اس سیرت وکردار کا کس طرح ظہور ہوتا ہے؟ یہ متبرک کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔

قیمت [illegible] مجلد [illegible]

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق

علم الاخلاق پر مبسوط اور محققانہ کتاب، جس میں اصول اخلاق، فلسفہ اخلاق اور انواعِ اخلاق کی دل پذیر تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ جس سے اسلام کے مجموعۂ اخلاق کی برتری دوسری ملتوں پر ثابت ہوتا ہے۔ نظر ثانی کیا ہوا تازہ ایڈیشن۔

قیمت [illegible] مجلد [illegible]

ارشاداتِ نبوی کا لاثانی ذخیرہ

اردو زبان میں

ترجمان السنہ:- ہماری زبان میں ایسی جامع اور مستند کتاب آج تک وجود میں نہیں آئی تھی، اس میں حدیثوں کا عربی متن مع اعراب بھی ہے اور صاف وسلیس ترجمہ بھی، ساتھ ہی تشریحی اور تحقیقی نوٹ بھی ہیں۔ ترتیب میں کتاب التوحید کو پہلے رکھا گیا ہے اور پھر اسی مناسبت سے پوری کتاب کی ترتیب قائم کی گئی ہے، پہلی جلد کے شروع میں کئی سو صفحات کا ایک بصیرت افروز مقدمہ ہے۔

جلد اوّل قیمت [illegible] مجلد [illegible] جلد دوم قیمت [illegible] مجلد [illegible]

فہم قرآن قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں، کلام ربّانی کا قطعی منشاء معلوم کرنے کے لئے آنحضرت کے ارشادات واقوال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ یہ اس موضوع پر ایک بہترین تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے۔

قیمت [illegible] مجلد [illegible]

وحی الٰہی مسئلہ وحی کے تمام گوشوں کی دل پذیر تشریح، وحی کی حقیقت اور اس کی صداقت سمجھنے کے لئے لاجواب کتاب، نہایت نفیس۔ جدید ایڈیشن۔

قیمت [illegible] مجلد [illegible]

منیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرھان

جلد ۳۵ شمارہ ۱

جولائی ۱۹۵۵ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۷۴ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیوبند ہو یا کوئی اور ادارہ اور درس گاہ۔ بہر حال جہاں کہیں بھی چراغ سے چراغ روشن رہا اور از سلف تا خلف نامور علماء و فضلا پیدا ہوتے رہے ہیں اس کی بڑی وجہ یہ رہی ہو کہ شاگرد نے مدرسہ سے رسمی طور پر سندِ فراغ حاصل کرنے کے بعد بھی باکمال استاذ کی صحبت و معیت میں (جس کو متقدمین کی اصطلاح میں ملازمتِ شیخ کہتے ہیں) برسوں گذارے ہیں موٹا جھوٹا کھا پہنکر گذارہ کیا ہے اور استاد کے زیر سایہ تعلیم و تربیت رہ کر اپنا علمی ذوق پختہ اور ہموار کیا ہے علوم و فنون کا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں دقتِ نظر اور بصیرت پیدا کی ہے۔ یہاں تک کہ سالہائے دراز کی محنت و ریاضت کے بعد وہ اس لائق بن گیا ہے کہ اگر ضرورت ہوئی تو اس نے استاد کی جانشینی کا حق ادا کیا ہے۔ راقم الحروف کو دار العلوم دیوبند کا تجربہ ہے۔ حضرتنا الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہؒ کا عہدِ میمنت مہد تھا اللہ اکبر! یہ کیا مبارک دور تھا جس میں حضرت شاہ صاحب کے علاوہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولانا حبیب الرحمن عثمانی۔ مولانا محمد اعزاز علی مولانا محمد ابراہیم بلیاوی۔ مولانا رسول خاں۔ مولانا عبد السمیع۔ مولانا سراج احمد رشیدی علم و فضل تدبر و سیاست تقوی و طہارت اور شریعت و طریقت کے آسمان کے سب ہی چاند ستارے ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ اس دور میں ہزاروں ہی طلبا فارغ التحصیل ہو کر دار العلوم سے نکلے اور عالم اسلام کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔ لیکن ان سب میں علم و فضل کے اعتبار سے آج جن کو ہندو پاکستان میں نمایاں امتیاز حاصل ہے اور جن کو ان کے علمی کارناموں کی وجہ سے ملک کا نامور اور جید عالم سمجھا جاتا ہے وہ کون ہیں؟ مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی مولانا بدر عالم۔ مولانا حفظ الرحمن۔ مولانا عتیق الرحمن عثمانی۔ مولانا محمد طیب۔ مولانا محمد یوسف بنوری یہ سب وہ حضرات تھے جو مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد بھی برسوں تک دار العلوم میں ان ہی

بعض وہ ہیں جو دیوبند اور ڈابھیل دونوں جگہ رہے ہیں اور بعض وہ ہیں جو صرف دیوبند یا صرف ڈابھیل میں رہے ہیں) پڑے رہے اور حضرات اساتذہ سے عموماً اور حضرت شاہ صاحب سے خصوصاً استفادۂ علمی کرتے رہے ہیں، اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے مولانا حبیب الرحمن کو۔ نہایت مدبر اور بے انتہا دور اندیش تھے اور ساتھ ہی مدرسہ سے عشق رکھتے تھے۔ وہ ہونہار طلبا پر برابر نگاہ رکھتے تھے اور انہوں نے ایسے طلبا کی مزید تعلیم و تربیت کے لئے "معین المدرسین" کے نام سے ایک مستقل شعبہ قائم کر رکھا تھا۔ یہ ہونہار طالب علم جہاں درسِ نظامی سے فارغ ہوا اور مولانا مرحوم نے پچیس ۲۵ تیس ۳۰ روپے اور مطبخ کا کھانا مقرر کر کے اس کو اس شعبہ میں لے لیا۔ اوپر جن حضرات کے نام لئے گئے ہیں یہ سب معین المدرس رہ چکے ہیں۔ ان کا کام یہ تھا کہ تین چار سبق ادنیٰ اور متوسط درجہ کے پڑھاتے تھے اور اس کے علاوہ سارا وقت اس طرح گذارتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کے ہاں بخاری کا مسلسل سماع کر رہے ہیں۔ صبح و شام حضرت شاہ صاحب کی علمی مجلسوں میں پابندی سے شریک ہو رہے ہیں جن میں مختلف علمی و دینی مسائل پر مذاکرہ ہو رہا ہے۔ شاہ صاحب ہیں کہ علوم و فنون اسلامیہ کے موتی لٹا رہے ہیں۔ چار کا دور چل رہا ہے۔ اکڑوں بیٹھے ہیں چار کی پیالی منھ کو لگی ہوئی ہے یا پان چبا رہے ہیں اور اپنی میخانہ بر دوش آنکھوں کو گھما گھما کر تقریر فرما رہے ہیں۔ حافظ ابن حجر۔ ابن دقیق العید۔ حافظ ابن تیمیہ۔ حافظ ابن قیم۔ غزالی۔ رازی۔ جنید و شبلی۔ تفتازانی و زمخشری سب کا ہی تذکرہ ہو رہا ہے اور ہر ایک مسئلہ زیر بحث پر دادِ تحقیق دی جا رہی ہے خود کتابوں کے حوالے دیتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ان حوالوں کی طرف مراجعت کرنے کی ہدایت فرما رہے ہیں۔ نماز عصر کے بعد حضرت مولانا عزیز الرحمن عثمانی اور مغرب کے بعد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہما کے ہاں روزانہ باقاعدہ نشست ہوتی تھی۔ یہ حضرات ان مجلسوں میں بھی پہونچتے تھے اور ان سے مکمل استفادہ کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ آج ملک کے سامنے موجود ہے۔ اس طرح یہ صحبتیں اور مجلسیں کیا تھیں ایک بھٹی تھیں کہ مسِ خام بھی اس میں پڑا تو کندن بن کے نکلا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ ان کی سیر چشمی بھی بنیں اور علمی ذوق بھی پختہ ہوا۔ ان کی زندگیاں دین کے رنگ میں رنگی گئیں اور اسلامی مسائل و مباحث پر

ان کی نگاہِ تحقیقی کبھی ہوگئی۔

آج مدارس عربیہ پر شدید ترین انحطاط و تنزل کا جو دور طاری ہے اور علمی و دینی دونوں اعتبار سے حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے اس کا سب سے بڑا اور اہم سبب یہی ہے کہ اب صحبتِ شیخ کا یہ دستور باقی نہیں رہا۔ طالب علم فارغ التحصیل ہوا اور کھانے کمانے کے لئے مدرسہ سے نکل گیا۔ درسِ نظامی کی تکمیل علوم و فنون کے آئندہ مطالعہ کے لئے صرف ایک استعداد پیدا کرتی ہے گویا یہ خود کوئی مقصود نہیں ہے بلکہ حصولِ مقصد کا ذریعہ ہے۔ اگر کوئی شخص اسی کو مقصد سمجھ کر اپنی طلب علم کی جدوجہد کو اسی پر ختم کر دے اور اس کو اس استعداد کے پروان پڑھانے اور اس سے کام لینے کا موقع نہ ملے تو ایسا شخص ہرگز صحیح معنی میں عالم کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ عالم وہی ہے جو اپنی حاصل کردہ استعداد سے کام لے کر اپنے علم میں برابر اضافہ کرتا رہے اور درس و مطالعہ کے ذریعہ مسائل و مباحث میں پختہ اعتقادی اور تحقیقی نظر پیدا کرنے میں ساعی رہے۔

آج کل اقتصادی زبوں حالی عام ہے اور اب وہ پہلی سی ہمت اور حوصلہ بھی نہیں ہے اس بنا پر معیاری علما پیدا کرنے کے لئے لامحالہ نئے طریقے اور ان طریقوں میں نئی قسم کی کشش پیدا کرنی ہوگی۔ انہی سب باتوں کے پیشِ نظر ہم نے گذشتہ نظرات میں تجویز کی تھی کہ دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء ایسی عظیم درس گاہوں کو چاہئے کہ وقت کی نزاکت اور حالات کے مطالبہ کا احساس کریں اور جہاں وہ لاکھوں روپئے درسِ نظامی کی تعلیم و تعلم پر خرچ کر رہے ہیں ان کو ایک معتد بہ رقم ذی استعداد اور ہونہار فارغ التحصیل طلبا کی مزید تعلیم و تربیت پر خرچ کرنی چاہئے تاکہ ملک میں معیاری علما اور ماہرینِ علوم و فنون اساتذہ کا قحط نہ ہونے پائے اور جب کبھی کسی مدرسہ یا کسی ادارہ میں کوئی پرانی مسند خالی ہو تو وہ خالی ہی نہ پڑی رہے۔

تصحیح

گذشتہ سے پیوستہ پرچہ میں آثم صاحب کی جو غزل شائع ہوئی ہے اس کے آخری شعر کا دوسرا مصرعہ یوں پڑھا جائے گا۔ نظر تیری بہ اندازِ کلیمانہ نہیں اٹھی۔

حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

ابن الندیم (م ۳۸۵ھ) کی فہرست کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط کبھی کتابی شکل میں مرتب نہیں ہوئے - پہلی، دوسری اور تیسری صدی ہجری میں ابتدائی سو سال کی سیاسی شخصیتوں کی زندگی کے مختلف گوشوں پر بہت کچھ لکھا گیا جس طرح فتوحات اور سیاسی فتنوں پر بہت سے کتابچے تصنیف ہوئے اور یہ بات حیرت کا باعث ہی نہیں بلکہ دل میں بھی نہیں کھٹکتی کہ حضرت عمرؓ جیسی ممتاز اور مقبولِ عام شخصیت کے سرکاری خطوط کسی مصنف نے یک جا نہ کئے ہوں جب کہ ان کی سیاست و انتظام کے دیگر شعبوں پر مستقل رسالے لکھے گئے ہوں اور نسبتہً کم اہم یا غیر اہم موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہو - ابن الندیم نے تصریح کی ہے کہ مورخ مدائنی (م ۲۲۵ھ) نے رسول اللہ کے عہد ناموں، ان کے بادشاہوں کے نام خطوط، ان کے صلحناموں، اور اُن کی تقریروں پر مستقل رسالے لکھے تھے، اور اسی طرح حضرت علیؓ کی تقریروں اور سرکاری خطوط کو بھی جمع کیا تھا - یہ تو خیر اہم موضوع تھے، ایسے کم اہم موضوع جیسے خلفاء کی مہریں، رسول اللہ کی عطا کردہ جاگیریں، رسول اللہ کی ظرافت پر بھی کتابچے لکھے گئے تھے، اور یہ کتابچے دس بیس نہیں بلکہ سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں چند در چند موضوعات پر چوتھی صدی ہجری میں ابن الندیم کی کتاب گھر واقع بغداد میں موجود تھے - بنابریں یہ باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کسی مصنف کی توجہ تاریخ اسلام کے اس بڑے ہیرو کے خطوط مرتب کرنے کی طرف مبذول نہ ہوئی ہو -

حضرت عمر کے خطوط جمع کرنے کی میں نے کوشش کی ہے اور میرا مرجع ہے وہ تاریخی، ادبی اور فقہی سرمایہ، جو ہم تک پہنچا ہے۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ حضرت عمر کے سارے موجودہ خطوط کا استقصار کر لیا گیا ہے، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے موجودہ خطوط کا بڑا اور اہم ترین حصہ سیاق و سباق کی ترتیب کے ساتھ جمع ہو گیا ہے۔

یہ خطوط زیادہ تر قدیم ترین عربی کتابوں سے لئے گئے ہیں، یہ کتابیں فتوح الشام واقدی کو چھوڑ کر بالعموم مستند خیال کی جاتی ہیں، اِن کے ماخذ وہ رسالے اور کتابچے تھے جو پہلی یا دوسری صدی ہجری میں تصنیف ہوئے تھے یا وہ اہلِ علم تھے جنہوں نے پہلی اور دوسری صدی میں اپنے شیوخ سے زبانی معلومات فراہم کر کے سینہ میں محفوظ کر لی تھیں۔ تاریخ طبری میں حضرت عمر کے متعدد خطوط بصیغۂ متکلم ان کی طرف منسوب کئے گئے ہیں اور ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کا محض خلاصہ بصیغۂ غائب بیان کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے تیرہ سالہ اور انتہائی مصروف وواقعات سے بھرپور دورِ حکومت کے سرکاری خطوط کا بہت سا حصہ ہم تک پہنچا ہی نہیں ہے۔ اس نوع کے خطوط یعنی جن کا ملخص بصیغۂ غائب بیان ہوا ہے جس جس کتاب میں ملے ہیں نظر انداز کر دئے گئے ہیں اور صرف وہ خط لئے گئے ہیں جو بصیغۂ متکلم وارد ہوئے ہیں۔

واقدی (م ۲۰۷ھ) کی فتوح شام و مصر میں بھی حضرت عمر کے خطوط کی خاصی تعداد ہے بہت سے ناقدوں کی نظر میں یہ کتاب میزانِ اعتبار سے گری ہوئی ہے کیوں کہ اس میں ایسی تفصیلات ہیں جن میں افسانوی رنگ جھلکتا ہے، جو روایت کے اصولِ اِیجاز سے ٹکراتی ہیں، جن میں بعض افراد اور سنین تاریخ کے مسلمہ افراد اور سنین سے بہت مختلف ہیں، بایں ہمہ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ فتوح الشام نامی کتاب واقدی کی تصنیف نہیں ہے کیوں کہ ایک سے زیادہ قدیم مصنف نے اُس کی تصنیفات میں اس کتاب کا نام لیا ہے، اور اس کا وہ حصہ جو عام تاریخوں سے بعض تفصیلات و تصریحات میں مطابقت رکھتا ہے۔

غیر مطابق حصہ سے مقدار میں زیادہ ہے، بہت ممکن ہے کہ اس کی بعض تفصیلات موضوع ہوں یا راویوں کی رنگ آمیزی اور مذہبی جوش کی مرہون۔ اس میں حضرت عمر کے جو خط بیان ہوتے ہیں وہ شاید جعلی نہیں ہیں، البتہ ان میں لفظی و معنوی تصرف ضرور کیا گیا ہے، کیوں کہ ان میں حضرت عمر کا مخصوص لہجہ اور انداز بدلا ہوا نظر آتا ہے۔

حضرت عمر کے ایسے خطوط کی تعداد بھی کم نہیں جو ایک سے زیادہ کتابوں میں مذکور ہیں اور جن کے نسخے ہر کتاب میں کیا لفظاً اور کیا معنیً مختلف ہیں اور کہیں کہیں یہ اختلاف بہت زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ اس فرق کا سبب کہیں تو کاتبوں کی بے توجہی اور دراندازی ہے اور کہیں راویوں کی بھول چوک اور خاص میلان کو اس میں دخل ہے۔ جیسا کہ حدیث کے باب میں ہم دیکھتے ہیں۔ ایسے مشترک خطوط جن کا متن ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے الگ الگ بیان کر دیئے گئے ہیں۔

خلیفہ ہو کر حضرت عمر کا پہلا خط

(الف) بروایت طبری (تاریخ الملوک مصر ۴/۵۴)

ابو عُبیدہ بن جرّاح کے نام

"میں تم کو اس خدا سے ڈرنے کی تلقین کرتا ہوں جو ہمیشہ رہنے والا ہے اور جس کے سوا ہر شے فانی ہے، جس نے ہم کو گمراہی سے نکال کر سیدھا راستہ دکھایا اور جہالت کے اندھیرے سے ہٹا کر علم کی روشنی میں لا کھڑا کیا۔

(۲) میں تم کو خالد بن ولید کے لشکر کا سپہ سالار مقرر کرتا ہوں، مسلمانوں کی بہبودی اور سربراہ کاری میں لگ جاؤ جو تمہارے اوپر بحیثیت امیر کے عائد ہوتی ہے۔

(۳) غنیمت کی امید میں مسلمانوں کو جان جوکھوں کی کسی مہم پر نہ بھیجو۔

(۴) ان کو کہیں بھیجنے سے پہلے جاسوسوں کے ذریعہ مقامی حالات اور راستہ کے بارے پوری تحقیق کر لو۔

(۵) جب کہیں رسالہ بھیجو تو اس بات کا خیال رکھو کہ اس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کافی ہو۔

(۶) تمہارا کوئی فعل یا فوجی پالسی ایسی نہ ہو جس سے مسلمان تباہ ہو جائیں۔

(۷) خدا کی طرف سے یہ آزمائش ہے کہ میں تمہارا حاکم اور تم میرے ماتحت ہو گئے ہو، لہذا میری تاکید ہے کہ دنیا کے ٹھاٹ باٹ سے اپنی نظر ہٹائے رکھو اور دنیا کی محبت دل میں نہ آنے دو، خبردار کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی محبت تم کو ہلاک کر دے جس طرح پچھلی قوموں کو ہلاک کیا، تم نے ان کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہے

(ب) پہلا خط بقول ابن عساکر (تاریخ الکبیر، مصر، ۱/۱۵۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ عبد اللہ عمرؓ امیر المومنین کی طرف سے **ابو عبیدہؓ ابن جراح** کو سلام علیک۔

میں اس معبود کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، تم کو معلوم ہو کہ ابو بکر صدیق رسول اللہ کے جانشین رحلت کر گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون، خدا کی رحمت اور برکتیں ہوں ابو بکر پر جو عامل بالحق، آمر بالقسط اور آخذ بالعرف تھے جو پاکباز اور صلح جُو تھے، نرم مزاج اور بُردبار تھے۔

(۲) میری تمنا ہے کہ تقوی کے ذریعہ برائی سے بچ کر خدا کی رحمت کا مستحق بنوں، جب تک زندہ ہوں اس کی اطاعت میں لگا رہوں، مرنے کے بعد جنت سے بہرہ ور ہوں، بے شک خدا ہر بات پر قادر ہے۔

(۳) مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے دِمَشق کا محاصرہ کر لیا ہے۔

(۴) میں تم کو مسلمانوں کا سالار مقرر کرتا ہوں۔

(۵) تم حمص اور دمشق کے نواحی نیز شام کے دیگر علاقوں میں رسالے پھیلا دو مگر اس باب میں اپنی رائے اور دوسرے مسلمانوں کی رائے سے کام کرو، صرف میرے لکھنے سے اپنا لشکر خطرہ میں نہ ڈال دینا جس سے دشمن کو تمہیں نقصان پہنچانے کا حوصلہ ہو۔

۶۔ جو لوگ تمہارے پاس زائد ہوں، انھیں میرے پاس بھیج دو، اور جو محاصرہ میں تمہارے لئے ضروری ہوں ان کو پاس رکھو، خالد بن ولید کو بھی روک لو، کیوں کہ ان کے بغیر تمہارا کام نہیں چل سکتا۔

(ج) پہلا خط بسند اعثم کوفی (تاریخ فتوح، بمبئی ص ۲۵-۲۶)

شام کے مسلمانوں کے نام

عمر بن خطاب کی طرف سے شام کے مسلمانوں کو سلام علیک۔

ابو بکر کی وفات سے رسول اللہ کی امت پر ایک سنگین مصیبت نازل ہوئی ہے۔ ابو بکر جو حق گو، حلیم، متواضع، رحیم اور راستباز تھے، جن کی روش بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، جو خدا ترس اور پاکباز تھے، جن کو دنیا سے لگاؤ نہ تھا۔

۲۔ رسول اللہ کی امت ایسے رہبر سے محروم ہوئی اور خلافت کے معاملات میں ان کی وفات سے سخت خلل پیدا ہوا، مگر خدا کو یہی منظور تھا، ہر شخص کو موت کا پیالہ پینا ہے، انسان کے لئے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ صبر سے گردن جھکا دے۔

(۳) اس سخت حادثہ کے رونما ہونے سے پہلے انھوں نے ممتاز مہاجر و انصار صحابہ کے سامنے مجھے اپنا خلیفہ مقرر کیا، اور اس سنگین امانت کا بار میرے کندھوں پر رکھا۔ میں نے اس بھاری ذمہ داری کو لینے سے بہت گریز کیا مگر مجھے کامیابی نہ ہوئی، مجبوراً مجھے سر جھکانا پڑا، اب ضروری ہے کہ مسلمانوں کی بہبودی اور ان کی مہموں کی ترتیب

و تنظیم میں جہاں تک میرے امکان میں ہے، کوشش کروں۔

۴۔ مصلحت کا تقاضہ ہے کہ خالد بن ولید شامی فوجوں کی سپہ سالاری سے الگ ہوں اور یہ عہدہ ابو عبیدہ بن جراح کو سپرد کیا جائے۔

۵۔ آپ لوگ جب اس خط کے مضمون سے واقف ہوں اس وقت سے ابو عبیدہ آپ کے سالار ہیں، اپنے سارے معاملات میں ان کی طرف رجوع کیجئے، دشمن سے جنگ میں ان کی رائے اور حکم کے مطابق عمل کیجئے۔

اس خط کے ساتھ ذیل کا خط ابو عُبیدہ کو لکھا۔

ابو عُبیدہ بن جرّاح کے نام

"بحمد اللہ تمہارے پاس اتنی فوج ہے کہ دمشق کا محاصرہ بخوبی کر سکتے ہو۔

۲۔ یہ خط پڑھ کر افسرانِ فوج کو جمع کرو اور ان کے سامنے ساتھ والا خط پڑھ کر سناؤ، تاکہ ان کو تمہاری سپہ سالاری اور خالد کی معزولی کا علم ہو اور وہ ان کی بجائے تمہارے حکم کی تعمیل کریں۔

۳۔ جن فوجی افسروں کی تم کو ضرورت نہ ہو ان کو میرے پاس بھیج دو اور جن جن کے بغیر تمہارا کام نہ چلتا ہو ان کو اپنے پاس رکھو، خالد ایسے لوگوں میں ہیں جن کے بغیر تمہارا گذارہ نہیں ہو سکتا، اس لئے ان کو ساتھ رکھو

(د) پہلا خط بسند واقدی (فتوح الشام کلکتہ ۲/۲)

ابو عُبیدہ بن جرّاح کے نام

"میں تم کو شام کا گورنر اور مسلمانوں کی فوج کا سپہ سالار مقرر کرتا ہوں اور خالد کو معزول کرتا ہوں، والسلام"

ابو عبیدہ بن جراحؓ کے نام

[1] شام کا سفیر خالد کی طرف سے جب دمشق کی فتح کا خط لے کر مرکز خلافت آیا تو اس خط میں خالد نے حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کیا تھا، سفیر سے معلوم ہوا کہ شام کے مسلمانوں کو نہ تو حضرت ابوبکرؓ کی وفات کا علم ہے نہ ابو عبیدہ کے تقرر اور خالد کی معزولی کا، (ابو عبیدہ نے حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا خط کا مضمون جس میں ان کو سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا، مخفی رکھا تھا)

عبداللہ عمر امیر المؤمنین کی طرف سے ابو عبیدہ بن جراح کو سلام علیک

میں اس خدا کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، میں نے تم کو مسلمانوں کا حاکم مقرر کیا ہے، اس عہدہ کو لینے سے شرماؤ نہیں، خدا حق بات سے کبھی نہیں شرماتا، میں تم کو خدا سے ڈرنے کی تاکید کرتا ہوں - میں نے تم کو خالد کے لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا ہے، لشکر اپنی نگرانی میں لے لو، اور لشکر کی کمان سے خالد کو معزول کر دو، مسلمانوں کو غنیمت کی توقع میں کسی ایسی مہم پر نہ بھیجو جو ان کی تباہی پر منتہی ہو۔ نیز کوئی رسالہ دشمن کی ایسی فوج کی طرف نہ بھیجو جو تعداد میں بہت زیادہ

---

[1] واقدی اور ابن عساکر کے منقولہ خطوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابو عبیدہ بن جراح کے تقرر کا خط دمشق کے محاصرہ کے وقت آیا، نیز یہ کہ حضرت عمر کا یہ پہلا خط تھا - تاریخ کے تتبع سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی، کیوں کہ دمشق کی فتح رجب سنہ ۱۴ھ میں بتائی گئی ہے اور حضرت عمر جمادی الآخر سنہ ۱۳ھ میں خلیفہ ہوئے اور خلیفہ ہونے کے بعد فتح دمشق سے پہلے دو بڑی لڑائیاں ہوئیں، ایک فحل اور دوسری مرج الصُفر، فحل ذوالقعدہ سنہ ۱۳ھ میں فتح ہوا اور مرج الصُفر محرم سنہ ۱۴ھ میں۔ ان دونوں جنگوں میں ابو عبیدہ سپہ سالار تھے۔ بنا بریں واقدی اور ابن عساکر کی یہ تصریح کہ ابو عبیدہ کا تقرر دمشق کے محاصرہ کے دوران میں ہوا مانی نہیں جا سکتی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عساکر کے خط میں دمشق کا ذکر سہواً ہو گیا ہے، رہا واقدی کا منقولہ خط تو اس میں دمشق کے محاصرہ کی تصریح کے علاوہ غالباً حضرت عمر کے دوسرے خطوں کے بعض جملے گڈ مڈ کر دیئے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس باب میں اعثم کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے۔

ہو۔ مسلمانوں سے یہ نہ کہو کہ مجھ کو فتح کی امید ہے، کیوں کہ فتح امید سے نہیں، یقینِ محکم اور خدا پر بھروسہ سے حاصل ہوتی ہے۔ خبردار اپنے کسی فعل یا پالیسی سے مسلمانوں کو ہلاکت میں نہ ڈال دینا، دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لو۔ اور اس کی محبت دل میں نہ آنے دو۔ خبردار، ایسے کام نہ کرنا جن کی پاداش میں تم ہلاک ہو جاؤ جس طرح پچھلی متمدن قومیں تباہ ہو چکی ہیں، تم نے ان کی تباہی دیکھ لی ہے اور ان کے باطنی امراض پر کھ چکے ہو۔ تمہارے اور حیات بعد الموت کے درمیان ایک ہلکا ہلکا سا پردہ ہے، تمہارے سلف آخرت کی طرف کوچ کر چکے ہیں، اور تم اس بے رونق دنیا سے کوچ کے منتظر ہو، بڑا ہوش مند ہے وہ جو کوچ کے لئے ہر وقت تیار رہے اور "خوفِ خدا" جس کا زادراہ ہو۔ جس قدر ممکن ہو مسلمانوں کی دیکھ بھال کرتے رہو۔ جَو اور گیہوں جو دِمشق کی فتح پر تمہارے ہاتھ لگا اور جس کے بارے میں تم سب جھگڑے تو وہ مسلمانوں کا حق ہے، اس کے علاوہ جو سونا چاندی ملا اس میں سے خُمس (مرکزی حصہ) نکال کر باقی آپس میں بانٹ لو۔ رہا تمہارا اور خالد کا صلح اور جنگ کے بارے میں اختلاف تو اس باب میں تمہارا فیصلہ ناطق ہے کیوں کہ تم سپہ سالار ہو۔ والسلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ علیک وعلی جمیع المسلمین۔

خالد سے بڑی کوتاہی ہوئی کہ انھوں نے ہِرَقل کی لڑکی کو پکڑا اور پھر ہدیۃً اس کے باپ قیصر کو لوٹا دیا، وہ فِدیہ کے طور پر بڑی رقم وصول کر سکتے تھے جو کمزور مسلمانوں کے کام آتی۔

ابو عبیدہ بن جرّاح کے نام

(یہ خط ابو عبیدہ کے اس خط کے جواب میں ہے جس میں انھوں نے رومیوں (بازنطینی حکومت) کے ایک بڑے لشکر کی اُردُن کے مقام فِحل میں جمع ہونے کی مرکز کو خبر دی تھی اور اپنے خط میں اس وعیدی پیغام کا ذکر کیا تھا جو رومیوں نے مسلمانوں کو ملک سے نکلنے کے لئے بھیجا تھا۔ فِحل کا اہم معرکہ ذوالقعدہ ۱۳ھ میں واقع ہوا۔

عبداللہ امیر المومنین کی طرف سے ابو عبیدہ بن جراح کو سلام علیک - میں اس خدا کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں - تم نے اپنے خط میں رومیوں کی فوج کشی، ان کے موجودہ پڑاؤ (فحل) ان کے دعیدی پیغام کا ذکر کیا ہے اور وہ جواب بھی لکھا ہے جو اس دعیدی پیغام کے زیر اثر تم نے رومیوں کو بھیجا، تمہارا جواب اور دلیلیں جو تم نے اپنی لشکر کشی کے حق میں پیش کیں دانش مندی اور راستبازی پر مبنی ہیں -

۲ - میرا یہ خط اگر تم کو دشمن پر فتح پانے کے بعد ملے تو اس فتح کو بھی منجملہ ان بہت سے احسانات و عنایات کے خیال کرنا جن سے خدا ہمیں اور تمہیں نوازتا رہا ہے اور جن کا ہم کو گہرا احساس ہے، اور اگر اس خط کو پانے سے پہلے تم کو کسی معرکہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہو، تو ہراساں نہ ہونا، نہ دشمن کے سامنے بے بسی کا اظہار کرنا کیوں کہ بالآخر تم ہی فاتح ہوگے، سرزمین شام خدا کا ملک ہے خدا تمہارے ہاتھوں سے اس کو فتح کرائے گا اور اپنے نبی کی پیش گوئی پوری کرے گا -

۳ - صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو، خدا صبر کرنے والوں کی مدد کرتا ہے، یاد رکھو کہ دشمن کے مقابلہ میں اگر تم نے سچے دل سے خدا سے مدد مانگی تو وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا -

۴ - جب تم دشمن سے معرکہ آرا ہو تو یہ دعا مانگنا :-

"مالک اب تک ہر موقعہ پر تو نے ہی اپنے دین کی مدد کی ہے اور تو نے ہی اپنے وفاداروں کو عزت و کامرانی عطا فرمائی ہے، مالک آج بھی دشمن کے مقابلہ میں تو ان کی مدد کر، تو ہی ان کو فتح دلا، ان کو اپنے بل بوتے پر مت چھوڑ، کیوں کہ وہ کمزور ہیں، تو ہی ان کی کامیابی کی صورت نکال، اور اپنی رحمت سے دشمن کے مقابلہ میں ان کی دستگیری فرما، بے شک تو سب سے بڑا محافظ ہے[1] -"

[1] فتوح الشام ازدی، کلکتہ، ص۱۱۱

ابو عبیدہ بن جراح کے نام

یہ خط ابو عبیدہ کے اُس خط کے جواب میں ہے جو انھوں نے فحل کے معرکہ میں رومیوں کی شکست اور علاقہ اُردن پر مسلمانوں کے بزور شمشیر قابض ہونے پر لکھا تھا اس خط میں ابو عبیدہ نے اُس اختلاف کا ذکر کیا تھا جو صحابہ کے درمیان اس علاقہ کی اراضی کے بارے میں ہوا کہ آیا اس کو فاتحین آپس میں بانٹ لیں یا سابق مالکوں کے پاس رہنے دیں اور ان سے خراج (لگان) وصول کریں[1]۔

عبداللہ عمر امیر المومنین کی طرف سے ابو عبیدہ بن جراح کو سلام علیک۔ اس خدا کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، تمہارا خط ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ خدا نے اہلِ دین کی عزت بڑھائی اور نافرمانوں کو خوار کیا اور ہمارے دشمنوں کو ٹھکانے لگا کر ہماری مشکل آسان کی۔ بہت بہت شکر ادا کرتا ہوں اس خدا کا جس کی عنایتیں ماضی اور حال میں ہمارے شامل رہی ہیں، جس نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو سلامت رکھا اور دوسری کو شہادت سے نوازا، خدا ان کو اپنی خوشنودی اور مکرمت سے نوازے، خدا سے التماس ہے کہ ان کی قربانی کا اجر ہم کو عطا کرے، اور اُن کے بعد ہم کو سخت آزمائشوں سے محفوظ رکھے، وہ خلوص کے ساتھ مالک کے وفادار رہے اور اپنی ذمہ داریاں بوجہ احسن انجام دیں۔

۲۔ تم نے لکھا ہے کہ جس سرزمین (علاقہ اردن) کو مسلمانوں نے بزور تلوار فتح کیا ہے، اس کے بارے میں مسلمانوں کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ وہاں کے باشندوں کو بحال رکھا جائے اور ان پر جزیہ لگایا جائے اور زمین کی کاشت ان کے ذمہ رکھی جائے، اور دوسری جماعت کی رائے ہے کہ چونکہ یہ علاقہ تلوار سے فتح ہوا ہے اس

---

[1] فتوح الشام ازدی، ص ۱۲۱-۱۲۳

کو مسلمانوں پر تقسیم کر دیا جائے۔

۳۔ اس معاملہ پر میں نے خوب غور کیا اور میری رائے ہے کہ مفتوحہ علاقہ کے باشندوں کو بحال رکھو، ان پر جزیہ (حفاظتی ٹیکس) لگا دو اور جزیہ کی آمدنی مسلمانوں پر بانٹ دو، باشندے حسب معمول زمین کی کاشت کرتے رہیں، کیوں کہ اُن کو زمین کا مسلمانوں سے بہتر علم ہے اور کاشت کا کام اجنبی لوگوں کی نسبت وہ زیادہ عمدہ انجام دے سکتے ہیں۔

۴۔ اگر ہم نے باشندوں کو غلام بنالیا تو ہمارے بعد آنے والی نسلوں کا کون کفیل ہوگا؟ بخدا یہ عجب کس مپرسی اور بدحالی کے عالم میں ہوں گے، نہ ان سے کوئی بات کرنا روا رکھے گا اور نہ وہ کسی سے بات کرنے کے لائق ہوں گے، نہ کسی ذمّی کی دولت یا جائداد سے اُن کو کوئی فائدہ پہنچ سکے گا۔ جب تک یہ مسلمان جوان باشندوں کو غلام بنائیں گے زندہ ہیں، ان غلاموں سے نفع اٹھائیں گے، جب یہ اور ان کے غلام مریں گے تو ان کی اولاد غلاموں کی اولاد سے متمتع ہوگی اور یہ سلسلہ تاقیامت چلتا رہے گا، اور یہ لوگ ہمیشہ اہلِ اسلام کے غلام بنے رہیں گے۔ لہٰذا تم جزیہ لگاؤ اور غلام بنانے سے باز رہو۔

۵۔ کڑی نظر رکھو کہ کوئی مسلمان اُن پر ظلم نہ کرے، نہ اُن کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے، نہ ان کے مال و دولت سے ناجائز طریقہ پر متمتع ہو[1]۔

اِس خط کا دوسرا نسخہ

[قاضی ابو یوسف نے اپنی کتاب الخراج میں اس سے ملتا جلتا خط نقل کیا ہے جس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے لیکن کتاب الخراج کے خط کا سیاق سباق مذکورہ بالا خط

[1] فتوح الشام، ابو اسماعیل اَزدی بصری کلکتہ ص۱۲۴

کے سیاق سباق سے مختلف ہے، مذکورہ خط کا تعلق جیسا کہ بیان ہوا اُردُن اور اس کے دیہاتی علاقہ کی مفتوحہ اراضی سے تھا، کتاب الخراج کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قضیہ یرموک کی فتح کے بعد پیدا ہوا، نیز یہ کہ ابو عبیدہ نے اس بارے میں مرکز کو خط شام کا اکثر حصہ فتح ہونے کے بعد لکھا تھا۔ ایک اور بات جو کتاب الخراج کے خط میں ہے اور جس کا ذکر مذکورہ خط میں بالکل نہیں وہ (جیسا کہ ہم مضمون خط میں ابھی دیکھیں گے) عیسائیوں کے تہوار میں صلیبیں نکالنے کے بارے میں ہے۔]

ابو عُبیدہ بن جرّاح کے نام

"میں نے اُن فتوحات کے بارے میں جو خدا نے تم کو عنایت کیں، اُن صلحوں کے بارے میں جو تم نے شام کے لوگوں سے کیں اور اراضی کے بارے میں صحابہ کے مابین جو اختلاف رائے ہے، جیسا کہ تم نے ذکر کیا، غور کیا۔ اس سلسلہ میں میرا موقف قرآن کے ان فرمودات کے مطابق ہے:- وما أفاء الله على رسوله منهم فما أوجفتم عليه من خيل ولا ركاب ولكن الله يسلط رسله على من يشاء والله على كل شيء قدير. . . وما أفاء الله على رسوله من أهل القرى فلله وللرسول ولذي القربى واليتامى والمساكين وابن السبيل كي لا يكون دولة بين الأغنياء منكم . . . . وما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا واتقوا الله، إن الله شديد العقاب . . . . للفقراء المهاجرين الذين أخرجوا من ديارهم وأموالهم يبتغون فضلا من الله ورضوانا وينصرون الله ورسوله أولئك هم الصادقون یہ لوگ مہاجرین اولین ہوئے، والذين تبوءوا الدار والإيمان من قبلهم

یحبون من ھاجر الیھم ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا ویؤثرون علی انفسھم ولوکان بھم خصاصۃ، ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون، یہ لوگ ہوئے انصار، والذین جاء وا من بعدھم، یہ لوگ ہیں آدم کی اولاد، ان میں سفید، کالے، سرخ سب شامل ہیں، خدا نے ان کو مفتوحہ اراضی میں قیامت تک کے لئے شریک کر دیا ہے۔

(۲) پس مفتوحہ زمینوں کو ان کے مالکوں کے پاس رہنے دو اور ان پر اس قدر جزیہ لگا دو جو وہ آسانی سے ادا کر سکیں، اور یہ جزیہ مسلمانوں میں بانٹ دو، زمینوں کے مالک زمینوں پر کاشت کرتے رہیں، کیوں کہ وہ اس کام سے زیادہ باخبر ہیں اور تم سے زیادہ بہتر طریقہ پر اس کو انجام دے سکتے ہیں۔

(۳) چوں کہ تم نے ان سے صلح کر لی ہے اور ان کی بساط کے مطابق جزیہ لگا دیا، تمہارے یا مسلمانوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ ان کی زمینوں کو غنیمت قرار دے کر آپس میں بانٹ لیں۔ خدا نے اس معاملہ میں صاف صاف طریق کار ہمارے سامنے بیان کر دیا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:- قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون پس جب تم نے ان پر جزیہ لگا دیا تو تم ان سے اور کچھ نہیں لے سکتے، نہ اُن کو کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتے ہو۔

(۴) سوچو، اگر ہم غیر مسلموں کو غلام بنا کر آپس میں بانٹ لیں تو ہمارے بعد آنے والے مسلمانوں کے لئے کیا بچے گا، بخدا ان کی حالت تو ایسی خستہ ہو جائے گی کہ کوئی ان سے بولنا تک گوارا نہ کرے گا اور نہ ذمی کی کسی چیز سے وہ متمتع ہو سکیں گے۔ ان غلاموں سے جب تک وہ زندہ ہیں مسلمان فائدہ اُٹھاتے رہیں گے، جب یہ

غلام اور ان کے مالک ختم ہو جائیں گے تو ان کی اولاد سے آقاؤں کی اولاد متمتع ہوتی رہے گی اور اس طرح یہ لوگ جب تک اسلام کا بول بالا ہے غلام بنے رہیں گے اور چونکہ اسلام کا منشا غلام رکھنا نہیں ہے، تم ان پر جزیہ لگا دو اور ان کو ذمی بناؤ۔

(۵) اور ان سے تم نے معاہدوں میں جو وعدے کئے ہیں ان کو پورا پورا وفا کرو۔

(۶) اس بات کا خاص خیال رکھو کہ مسلمان ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کریں نہ اُن کو کسی طرح کا نقصان پہنچائیں، نہ ناجائز طریقوں سے ان کے مال و دولت سے فائدہ حاصل کریں۔

(۷) رہا صلیبوں کے نکالنے کا معاملہ (یہ عیسائیوں کا بڑا تہوار تھا) تو میری رائے یہ ہے کہ اگر یہ لوگ بلا جھنڈوں کے شہر سے باہر صلیبیں نکالیں جیسا کہ انھوں نے اجازت مانگی ہے تو تم ان سے تعرض نہ کرو، البتہ شہر کے اندر مسلمانوں کے محلوں یا مسجدوں کے پاس سے صلیبیں نہ نکالی جائیں۔"[۱]

ابو عبیدہ بن جراح کے نام

فتح دمشق کے بعد مسلمانوں کی ایک جماعت شراب نوشی کی مرتکب ہوئی، ابو عبیدہ نے اس کی شکایت مرکز خلافت کی تو حضرت عمر نے جواب میں لکھا

"جو شخص شراب پیئے اس کو اسّی کوڑے مارے جائیں، ایمان کی قسم، عربوں کے لئے فقر و تکلیف کی زندگی ہی مناسب ہے، ان کا فرض تھا کہ نیت درست رکھتے، خدا کی رضا جوئی کرتے، اس پر جان و دل سے ایمان لاتے اور اس کی نعمتوں کے شکر گذار ہوتے، اگر کوئی دوبارہ شراب پیئے تو اس کو بھی حد لگا دو۔"[۲]

---

[۱] کتاب الخراج، ابو یوسف، مصر، صفحہ ۱۴۰ - صفحہ ۱۴۱

[۲] فتوح الشام واقدی، مصر، (۱/۶۱)

ابو عبیدہ بن جرّاح کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم، عبداللہ عمر امیر المؤمنین کی طرف سے امین الامۃ (ابو عبیدہ) کو سلام علیک، میں اس آقا کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اس کے بنی محمد پر درود بھیجتا ہوں، خدا کے حکم اور منشار کو کوئی طاقت نہیں بدل سکتی اور جو لوح محفوظ میں کافر لکھ دیا گیا ہے اس کو ایمان نصیب نہیں ہو سکتا، تم کو معلوم ہو کہ جَبَلہ بن اَیہم غسانی اپنے چچازاد بھائیوں اور خاندانی اکابر کے ساتھ ہمارے پاس آیا تھا، میں نے ان کی آؤ بھگت کی، سب نے میرے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، ان کے اسلام سے مجھے خوشی ہوئی، کیوں کہ ان کے ذریعہ اللہ نے اسلام اور مسلمانوں کو قوت عطا کی، مگر پردۂ غیب میں جو چھپا تھا اس کا حال مجھ کو معلوم نہ تھا۔ ہم حج کے لئے مکہ گئے، جَبَلَہ نے بیت الحرام کے سات طواف کئے دورانِ طواف میں اس کا ازار ایک فزاری عرب کے پیر تلے آگیا اور ازار کھل کر کندھے سے گر پڑا۔ جَبَلَہ نے بڑھ کر فزاری کو دیکھا اور کہا: تیرا برا ہو تو نے خدا کے حرم میں مجھے ننگا کر دیا۔ فزاری نے کہا: خدا کی قسم میں نے قصداً ایسا نہیں کیا۔ تاہم جَبَلَہ نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ اس کی ناک زخمی ہو گئی اور اس کے اگلے چار دانت ٹوٹ گئے۔ فزاری میرے پاس فریاد لے کر آیا، میں نے جَبَلَہ کو بلوایا اور کہا: تم نے اپنے فزاری بھائی کے کیوں تھپڑ مارا اور اس کے اگلے چار دانت توڑ دیئے اور اس کی ناک زخمی کر دی۔" جَبَلَہ نے کہا: اس نے پیر کے نیچے میری ازار دبا کر کھول دی، خدا کی قسم اگر بیت اللہ کی حرمت کا مجھے خیال نہ ہوتا تو اس کو مار ڈالتا۔" میں نے کہا تم نے جرم کا اقبال کیا ہے، اب یا تو وہ تم کو معاف کر دے یا میں اس کا تم سے قصاص لوں گا۔" جَبَلَہ نے کہا: مجھ سے قصاص لیا جائے گا حالانکہ میں بادشاہ ہوں اور وہ ایک معمولی عرب ہے!" میں نے کہا: تم دونوں مسلمان ہو

میں تمہارے اور اس کے درمیان اسلامی قانون کے بموجب فیصلہ کر دوں گا، جبلہ نے مجھ سے اگلے دن تک مہلت مانگی، میں نے مہلت کے لئے فزاری سے پوچھا اور وہ تیار ہو گیا۔ جب رات ہوئی تو وہ اپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ اونٹوں پر سوار ہو کر شام کی طرف کلب الطاغیہ (رومی قیصر) کے پاس نکل بھاگا، مجھے امید ہے کہ خدا نے چاہا تو وہ تمہارے ہاتھ آئے گا۔ حمص میں خیمہ زن رہو، آگے پیش قدمی نہ کرو، اگر حمص کے باشندے صلح کریں تو صلح کر لو، اگر صلح نہ کریں تو ان سے لڑو، اور اپنے جاسوس انطاکیہ بھیجو اور شام کے نصرانی عربوں سے چوکنا رہو، والسلام علیک وعلیٰ جمیع المسلمین[1]"۔

ابو عبیدہ بن جرّاح کے نام

ابوعبیدہ نے ضلع حمص کی (جو استحکام و وسائل کے لحاظ سے شام کا بہترین ضلع تھا) فتح کی خوش خبری کا خط مرکز کو لکھا (۱۵ھ) اور یہ خبر دی کہ حلب کے علاقہ میں جو اس وقت رومی قیصر اور اس کی فوجوں کا مستقر تھا، جارحانہ حملے کے لئے رسالے بھیج دئے ہیں۔

اس خط کے جواب میں حضرت عمرؓ نے لکھا:-

"تمہارا خط ملا جس میں تم نے تلقین[2] کی ہے کہ میں ان علاقوں اور قلعوں کی فتح اور اس عنایت پر جس سے خدا نے ہم کو نوازا ہے سپاسگذار رہوں، میں خدا کا بہت بہت شکر ادا کرتا ہوں

(۲) تم نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ روم کے اس علاقہ میں جہاں اس کا لشکر ہے، رسالے روانہ کر دیئے ہیں میری رائے ہے کہ تم ایسا نہ کرو، سارے رسالے واپس بلا لو، اور جہاں اس وقت ہو وہیں ٹھہرے رہو یہاں تک کہ یہ سال گذر جائے، اس کے بعد جیسا مناسب ہوگا تم کو ہدایت کی جائے گی، خدائے ذوالجلال سے اپنے تمام معاملات میں مدد کا طالب ہوں[3]"۔

---

[1] فتوح الشام، واقدی، مصر، ۱/۶۱ [2] ابوعبیدہ کے خط میں (جو فتوح الشام ازدی میں منقول ہے اور جس کی طرف اس خط میں اشارہ ہے) کوئی کلمہ ایسا نہیں جس سے ظاہر ہو کہ انھوں نے حضرت عمرؓ کو خدا کا شکر ادا کرنے کی تلقین کی ہے، یہ تلقین اس خط میں ضرور ہے جو فحل (علاقہ اردن) کی فتح پر ابوعبیدہ نے حضرت عمرؓ کو لکھا ملاحظہ ہو فتوح الشام ازدی ص۱۲۳ خط ابوعبیدہ، [3] فتوح الشام، ازدی، ص۱۲۹

(باقی آئندہ)

حکمراں طبقہ اسلام کی نظر میں

از

(جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی)

موجودہ دور میں ظلم و جور کی جیسی فراوانی ہے، وہ کسی انسان سے پوشیدہ نہیں، اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص پریشان ہے، کسی کو ایک لمحہ کے لئے چین نہیں، اسلامی ممالک کا حال اس نقطۂ نظر سے اور بھی زیادہ قابلِ صد افسوس ہے، دنیا کی یہ ساری پریشاں حالی انجام ہے خدا سے رشتہ توڑنے اور اس کے احکام سے روگردانی کا، انسان سمجھتا ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کر کے سارے معاملات کو سلجھا سکتے ہیں، اپنا یقین اور دنیا کا تجربہ ہے کہ یہ خام خیالی ہے۔

ربّ العالمین نے جہاں تمام شعبہ جات زندگی کے لئے قوانین بنائے ہیں، وہاں اس گوشۂ زندگی کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا ہے، بلکہ اس شعبۂ زندگی کا بھی پورا قانون مرتب فرمایا ہے، اور رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشفی بخش وضاحت فرمائی ہے۔

ملک میں امن و امان کی ذمہ داری حکمراں طبقہ پر ہے، ٹیکس وصول کرنے کا مطلب یہ ہے، کہ حکومت ذمہ داری قبول کرتی ہے کہ ملک کے تمام انسانوں کی عزت و آبرو، مال و دولت اور جان و جسم کی حفاظت حکومت کا فریضہ ہے، جس حکومت کے افراد اپنی ان ذمہ داریوں کا احساس نہ رکھیں، وہ نااہل اور حکومت کے دشمن ہیں، جتنا جلد ممکن ہو، ایسے افراد کو حکومت کی ذمہ داریوں سے علیحدہ کر دیا جائے، اور ان کی جگہ دوسرے لائق آدمی بحال کئے جائیں۔

اسلام نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ افرادِ حکومت کے کیا فرائض ہیں، اور جو

اپنے فرائض بجا نہ لائے، وہ اسلامی قانون میں عند اللہ کتنا بڑا مجرم ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی،

اس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآن پاک کی اس آیت کو پڑھیں، رب العالمین فرماتے ہیں

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا (النساء-۴)

بلا شبہ اللہ تعالیٰ تم کو اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم اہل حقوق کو ان کے حقوق پہنچا دیا کرو اور جب لوگوں میں تصفیہ اور انصاف کرنے بیٹھو تو انصاف کے ساتھ تصفیہ کرو اللہ تعالیٰ جس بات کی تم کو نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہے اور اللہ سننے دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں حکومت کے ذمہ دار افراد کو ان کی ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ اہلِ حکومت کے فرائض کیا ہیں، اس آیت کا تفسیری ترجمہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانِ قلم سے ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں،

"اے اہل حکومت خواہ تھوڑوں پر حکومت ہو، خواہ بہتوں پر، بے شک اللہ تعالیٰ تم کو اس بات کا حکم دیتے ہیں، کہ اہلِ حقوق کو ان کے حقوق جو تمہارے ذمہ ہیں، پہونچا دیا کرو، اور تم کو یہ بھی حکم دیتے ہیں کہ جب محکوم لوگوں کا تصفیہ کیا کرو، ایسے حقوق میں جو ان میں باہم ایک دوسرے کے ذمہ ہیں، تو عدل و انصاف سے تصفیہ کیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ جس بات کی تم کو نصیحت کرتے ہیں، وہ بات بہت اچھی ہے دنیا کے اعتبار سے بھی، کہ اس میں بقارِ حکومت ہے، اور آخرت کے اعتبار سے بھی، کہ موجب قرب و ثواب ہے، بلاشک اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال کو، جو دربارۂ امانت و تصفیہ کے تم سے صادر ہوتے ہیں، خوب سنتے ہیں، اور تمہارے افعال کو، جو اس باب میں تم سے واقع ہوتے ہیں، خوب دیکھتے ہیں، تو اگر کمی و کوتاہی

کروگے، مطلع ہوکر تم کو سزا دیں گے۔[1]

اس مختصر سی آیت میں رب العزت نے جو معجزانہ پیرایہ اختیار کیا ہے، اور جس طرح حکمراں طبقہ کے فرائض کو بیان کیا ہے اس کا آپ کو اندازہ ہوا ہوگا، اور آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اسلام کے قانون میں اہلِ حکومت کی کیا ذمہ داری ہے، اور ذمہ داری میں کوتاہی اور غفلت کرنے پر کیسی وعیدِ شدید ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے ان میں سے بھی یہ چند حدیثیں سامنے رکھ کر سوچئے اور فیصلہ کیجئے، کہ اسلام نے خلیفہ اور حکمراں طبقہ پر کیا فرائض عاید کئے ہیں، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

مامن عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ	اللہ جس بندہ کو بھی رعیت کا نگراں بنائے
فلم یحطھا بنصیحۃ الالم یجد رائحۃ	اور وہ اپنی خیر خواہی سے رعیت سے ظلم دور
الجنۃ متفق علیہ (مشکوۃ کتاب الامارۃ)	نہ کرے، تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔

ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا بدترین فرمانروا وہ ہے جو پبلک پر ظلم کرے اور اوران پر رحم وکرم نہ کرے[2]، ایک حدیث میں ہے کہ سید الکونین نے فرمایا تم جانتے ہو قیامت کی گرمی جب شباب پر ہوگی اور اللہ کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا تو تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے سایہ کی طرف کون لوگ پناہ لینے کے لئے بڑھیں گے، صحابہ کرام نے فرمایا کہ اللہ اور اس کا رسول بہت علم رکھتا ہے آپ نے فرمایا وہ افرادِ حکومت کہ جب ان سے کلمۂ حق کہا جاتا ہے تو بے چون وچرا قبول کرتے ہیں، جب کوئی ان سے اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ اس پر اس کا حق خرچ کرتے ہیں، اور جب وہ لوگوں میں فیصلہ کرنے کے لئے عدالت کی کرسی پر بیٹھتے ہیں، تو، اپنے حق میں انصاف کرنے کی طرح لوگوں میں انصاف کرتے ہیں[3] (جیسا کہ قرآن

---

[1] بیان القرآن ج ۱۲۶/۲ [2] و [3] مشکوۃ کتاب الامارۃ

میں رب العالمین کا ارشاد ہے کہ اے ایمان والو اللہ کے واسطے انصاف کرو گو اپنے خلاف یا والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے)

حضرت معقل بن یسارؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو حکمران کسی رعیت پر ظلم کرے گا، یا اس کے حق میں خیانت کرے گا تو اللہ تعالیٰ ایسے حکمراں پر جنت کی بو حرام کر دے گا[1] ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت کا کوئی فرد لوگوں کی کسی چیز کا والی بنایا جائے اور وہ پبلک کی اسی طرح حفاظت و نگرانی نہیں کرے جس طرح وہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی حفاظت و نگرانی کرتا ہے تو ایسا شخص جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔[2]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے۔

اے اللہ! جو میری امت کے کسی معاملہ کا ذمہ دار اور نگراں بنایا جائے، اور وہ ان پر ناحق) سختی کرے، تو تو بھی اس پر سختی فرما اور جو میری امت کے کسی شعبۂ زندگی کا ذمہ دار ہو، اور وہ ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے، تو تو بھی نرمی فرما۔[3]

اسی طرح ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ بہترین افرادِ حکومت کون ہیں اور بدترین کون؟ ارشاد فرمایا بہترین افرادِ حکومت تم میں وہ لوگ ہیں، جن سے تم کو محبت ہو اور ان کو تم سے محبت و پیار ہو، تم ان کے حق میں دعا کرو، اور وہ تمہارے لئے دعا گو ہوں اور بدترین افرادِ حکومت وہ ہیں جن کو تم مبغوض رکھو اور وہ تم کو مبغوض رکھیں، تم ان کو لعنت کرو وہ تم کو لعنت کریں۔[4]

جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے غور سے پڑھیں اور سوچیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ حکومت پر کیا ذمہ داری عاید کی ہے اور پھر ان ذمہ داریوں میں کوتاہی پر اسلام

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ عن البخاری و مسلم صفحہ ۳۲۱ و جمع الفوائد صفحہ ۳۱۶ ج ۱ [2] جمع الفوائد ج ۱ ص ۳۱۶
[3] جمع الفوائد ج ۱ ص ۳۱۶ [4] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ عن مسلم

نے کتنی گرفت کی ہے، پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا

من ولی من امر الناس شیئا	کوئی لوگوں کے کسی محکمہ کا ذمہ دار ہو اور وہ
ثم اغلق بابہ دون المسلمین	مسلمان، یا مظلوم اور یا حاجت مند پر اپنا
او المظلوم اوذی الحاجۃ اغلق	دروازہ بند کرے، تو رب العالمین بھی اس پر
اللہ دونہ ابواب رحمتہ عند	اپنی رحمت کا دروازہ اس وقت بند کرلیں گے
حاجتہ وفقرہ افقر مایکون الیہ	جب اس کو ضرورت یا محتاجی پیش آئے گی۔

(مشکوٰۃ کتاب الامارۃ)

اس حدیث کے راوی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اسی وجہ سے دستور تھا کہ انھوں نے ایک آدمی ہی مقرر کر رکھا تھا، جو لوگوں کی ضرورتیں لاکر ان کے سامنے پیش کرتا، تاکہ کوئی حاجت مند ایسا باقی نہ رہے جس کی حاجت نہ پہنچ سکے، یا وہ اپنی کسی مجبوری سے خود حاضر نہ ہوسکے۔

دوسری حدیث میں اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ اگر افرادِ حکومت میں سے کسی نے ایسا وطیرہ اختیار کیا جس سے ضرورت مند اپنی حاجت روائی نہ کرسکیں اور خلیفہ اور والی تک نہ پہنچ سکیں، تو رب العالمین ایسے فرد کی دعا قبول نہیں کرتا، اور اس کی آرزو کے پورا ہونے میں رب العزت کی رحمت دستگیری نہیں کرتی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ اپنے گورنروں کو ہدایت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ گورنر کسی طرح پبلک پر سختی نہ کرنے پائیں، اور نہ ان کا مال غصب کرنے کی سعی کریں، پھر آپ نے پبلک کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا

"تم میں سے جس کے ساتھ حکومت کے آدمی ناجائز سختی سے پیش آئیں، ان کا مقدمہ میرے یہاں پیش کیا جائے میں ان سے بازپرس کروں گا، اور پورا بدلہ اسے چکھاؤں گا۔"

آپ کے اس خطاب کو سن کر حضرت عمرو بن العاص رضی نے کہا

"کیا آپ ایسے شخص سے بدلہ اور قصاص لیں گے، جو اپنی رعیت کو ادب دے؟"

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر جواب دیا

ای والذی نفسی بیدہ لا اقصہ وقد رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقص من نفسہ (جمع الفوائد ص ۲۱۷ ج ۱)	ہاں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ وقدرت میں مری جان ہے یقینا بدلہ لوں گا (اور کیسے نہ لوں گا) جب کہ میں نے خود آنحضرت صلعم کو اپنے آپ سے بدلہ لیتے دیکھا ہے۔

الفاظ نقل کرنے کا منشا یہ ہے کہ غور کریں، جواب کا لب ولہجہ کتنا تیز اور برجستہ ہے اور ساتھ ہی کس قدر مدلل اور ٹھوس ہے، کہیں سے کوئی کمزوری اور خواہ مخواہ حکام کی پاسداری کا کوئی جذبہ نکلتا ہے؟ اور وہ کیسے گورنروں کی ناجائز پاسداری کرتے، جس کی زندگی کا نقشہ یہ ہو، کہ اس کی نگاہ میں پبلک اور عوام کی جو عزت ہے وہ کسی اور کی نہیں۔

اسلام میں جو سب سے بڑا مرتبہ رکھتا ہے، وہ بھی قانون میں ایک معمولی انسان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، اسی کی ترجمانی ایک دفعہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے (جو ایک جلیل القدر صحابی ہیں) قیصر روم کے دربار میں کی تھی، فرمایا تھا

"ہمارا سردار ہم میں کا ایک فرد ہے، اگر ہمارے مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی پیروی کرے، تو ہم اس کو اپنا سردار باقی رکھیں گے، اور اگر ان کے سوا وہ کسی اور چیز پر

ؔ یہی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دفعہ جب قحط پڑا تھا تو آپ نے قسم کھالی تھی، جب تک قحط دور نہ ہو جائے گا گھی اور شہد نہ کھاؤں گا، قحط کے زمانہ میں آپ روٹی زیتون کے تیل کے ساتھ استعمال کرتے رہے، حتیٰ کہ آپ کا معدہ خراب ہوگیا، آپ کا غلام یہ حالت دیکھ کر بازار سے کچھ گھی اور شہد خرید لایا اور عرض کیا، یا امیر المومنین! اپنی قسم کا کفارہ دے دیجئے، اور اسے استعمال کر لیجئے، حضرت عمرؓ نے فرمایا، یہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ جب تک میں خود تکلیف نہ اٹھاؤں، دوسروں کی تکالیف کا اندازہ کیسے کر سکتا ہوں، پھر آپ نے اس گھی اور شہد کو صدقہ کرنے کا حکم دیا (تاریخ ملت ص ۱۰۵ ج ۲)

عمل کرے، تو ہم اس کو معزول کر دیں گے، اگر وہ چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں، اگر زنا کرے تو سنگسار کریں، اگر وہ کسی کو گالی دے تو وہ بھی اس کو اسی طرح گالی دے، اور اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو اس کا بدلہ دینا پڑے، وہ ہم سے چھپ کر پردے میں نہیں بیٹھتا، وہ ہم سے غرور نہیں کرتا، مال غنیمت میں اپنے آپ کو ہم پر ترجیح نہیں دے سکتا، وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا رتبہ رکھتا ہے[1]"

یہی وجہ ہے اسلام نے حکمراں طبقہ کے صدر اعظم کو خصوصیت سے انصاف کی تاکید کی ہے اور بار بار اسے دہرایا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد اقوال میں بتایا ہے کہ عدل و انصاف امام وقت کا کتنا اہم فریضہ ہے، اور اس کی خلاف ورزی اس کے لئے دین و دنیا میں کس قدر نقصان اور خسران کا سبب ہے، اوپر آپ یہ آیت پڑھ آئے ہیں۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء - ۸)	جب تم لوگوں میں تصفیہ کرنے لگو تو انصاف سے تصفیہ کیا کرو۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"سلطان روئے زمین پر اللہ کا سایہ ہے، (اس معنیٰ میں کہ رب العالمین نے اسے زمین پر اقتدار بخشا ہے) ہر مظلوم، بندگان خدا میں سے اس کی طرف پناہ لینے کی سعی کرتا ہے، پس اگر سلطان نے انصاف برتا تب تو اس کے لئے اللہ کے یہاں بدلہ اور اجر ہے اور رعیت کا فریضہ ہے کہ اپنے منصف سلطان کا شکریہ ادا کرے، اور اگر سلطان نے جور و ظلم سے کام لیا تو اس پر بار گناہ ہے اور رعیت کو صبر سے کام لینا چاہیے[2] (خود رب العزت منتقم حقیقی ہے)

ایک موقع سے سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل حکومت کو عدل و انصاف کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا

"قیامت کے دن اللہ کو سب سے پیارا، اور سب سے زیادہ نزدیک مجلس والا منصف امام ہے،

---

[1] آئینہ حقیقت نما صـ۲۳ [2] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ۔

اور قیامت کے دن رب العالمین جس کو سخت ترین عذاب میں مبتلا کرے گا اور اپنے سے دور جگہ دے گا، وہ ظالم امام ہے۔[1]

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھے اپنی امت پر تین چیزوں کا خطرہ ہے، ان میں ایک یہ بھی فرمایا

"سلطان کا جور و ظلم کو پیشہ بنانا"[2]

حضرت معاویہؓ کا بیان ہے کہ ایک بار مجھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"اے معاویہ! اگر تم کسی کام کے ذمہ دار بنائے جاؤ، تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور انصاف کرنا"[3]

حضرت عمرؓ بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"قیامت کے دن اللہ کے بندوں میں سے اللہ کے دربار میں سب سے بڑے مرتبہ والا انصاف دوست امام ہے جو رعیت کے حق میں نرم خو اور مہربان ہو، اور لوگوں میں سب سے بدترین اللہ تعالیٰ کے یہاں ظالم امام ہے جو درشت خو اور تند مزاج ہو"[4]

ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلعم نے فرمایا

"جو ذمہ دار حکومت اپنی حدود اختیار میں عدل کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے اپنے بغل میں نور منبر عطا فرمائے گا"

ان چند حدیثوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عدل و انصاف کی کس قدر تاکید کی ہے اور ظلم و جور سے کس کس طرح روکا ہے۔

یہ عدل و انصاف کی تاکید بے وجہ نہیں، یہی چیز امن و امان کی بنیاد ہے، اور قوم و ملک کے اطمینان و سکون کی ضامن کیوں کہ اگر عدل و انصاف نہ رہا، تو پھر زندگی کے تمام شعبہ جات پبلک پر تنگ ہو جائیں گے، اور خلیفہ کو من مانی کارروائی کرنے کا موقع

---

[1] مشکوٰۃ عن الترمذی ص۳۲۲ [2] مشکوٰۃ کتاب الامارہ [3] ایضاً [4] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ والقضاء ۳۲۳

مل جائے گا، اگر عدل وانصاف کی کچھ بھی قدر ہے تو حکمراں کا فریضہ ہوگا، کہ وہ حکومت کے تمام شعبوں میں ان آدمیوں کو بحال کرے جو اس کے واقعی مستحق اور اہل ہوں، ایک لمحہ کے لئے اس کی گنجائش نہیں نکلتی کہ وہ قرابت داری کا لحاظ کرے یا خاندان ونسل کا پاس، اپنی ذاتی خواہش کو بیچ میں لائے، یا اپنے حرص وہوس کی غلامی کرے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من ولی امر المسلمین شیئاً فولی رجلاً وھو یجد من ھو اصلح للمسلمین منہ فقد خان اللہ ورسولہ (السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہ ص۳)

جو شخص کسی کو مسلمان کے معاملوں میں کسی معاملہ کا ذمہ دار بنانے لگے اور ایسے شخص کو بنائے کہ اس کو مسلمان کے حق میں دوسرا لائق ترین شخص مل رہا تھا اس کو چھوڑ دیا تو اس نے اللہ اور اس کے رسول سے خیانت کی

ایک دوسری روایت ہے کہ آپ نے فرمایا

من قلد رجلاً عملاً علی عصابۃ وھو یجد فی ملک العصابۃ ارضی منہ فقد خان اللہ ورسولہ وخان المومنین رواہ الحاکم فی صحیحہ (السیاسۃ الشرعیۃ ص۳)

جو شخص کسی کو کسی قومی کام کا ذمہ دار بنائے حالانکہ اس قوم میں اس کو اس سے زیادہ اچھا آدمی اس کام کے لئے مل رہا تھا، تو اس نے اللہ، اس کے رسول اور مومنوں سے خیانت کی،

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

من ولی امر المسلمین شیئاً فولی رجلاً لمودۃ اوقرابۃ بینھما فقد خان اللہ ورسولہ والمسلمین (السیاسۃ الشرعیۃ ص۳)

مسلمانوں کے کسی اہم شعبہ کا کسی کو ذمہ دار بنانا ہو، اور وہ کسی کو صرف اس بنیاد پر اس شعبہ میں رکھ دیا، کہ اس سے دوستی یا قرابتداری تھی، تو اس نے اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی۔

ان حدیثوں سے کتنی صراحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہوئی کہ حکومت کے کسی شعبہ میں اگر کام کرنے والوں کی ضرورت ہو تو حکمراں طبقہ آزاد نہیں ہے کہ جس کو چاہے اس جگہ پر رکھ دے، بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ جستجو اور تلاش کرکے جو اس کا صحیح لائق ہے اس کے حوالہ کرے، یہ اللہ تعالیٰ اور پبلک کی ایک ضروری امانت ہے اور حکمراں طبقہ امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی امانت داری کا تقاضا ہے کہ وہ کوتاہی اور غفلت سے کام نہ لے، اقرباپروری، دوست نوازی اور ناجائز پاسداری کا خیال دل کے کونے کونے سے

نکال پھینکیے، انھی حدیثوں کے پیش نظر علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے

"حکومت کے تمام محکموں کے لئے ایسے آدمیوں کا انتخاب ضروری ہے، جو اس کے لائق اور صحیح معنی میں اس کی صلاحیت رکھتے ہوں، . . . اور تمام شعبہ جات کے ذمہ داروں کا فریضہ ہے کہ اپنا نائب اور عامل ان لوگوں کو بنائیں جو ان میں سب سے زیادہ باصلاحیت اور مستحق ہوں[1]"

کسی کو اس وجہ سے جگہ دینے میں ترجیح ہرگز نہ دی جائے، کہ اس نے پہلے درخواست دی ہے، یا اپنی خدمت پیش کی ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ یہ وجوہ تو جگہ نہ دینے کے ہیں اور دلیل میں صحیحین وغیرہ کی ان حدیثوں کو پیش کیا ہے، جن میں آپ نے حرص و ہوس رکھنے اور درخواست دینے والوں کو جگہ نہیں دی، چنانچہ حدیث میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ مجھے فلاں جگہ عطا کی جائے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا۔

انا واللہ لا نولی ھذا العمل احداً سالہ او احدا حرص علیہ (مشکوٰۃ کتاب الامارۃ)

بخدا میں کسی ایسے شخص کو اس کام کا ذمہ دار نہ بناؤں گا، جو مجھ سے اس کا سوال کرے گا، یا جو اس کے لئے لالچ کا اظہار کرے گا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا

"امارۃ کی ہوس نہ کرو، اور نہ اس کے لئے درخواست دو، اگر درخواست اور التجا پر تمہارے سپرد یہ کام ہوا، تو تم اس اہم کام کو نباہ نہ سکو گے اور نہ تمہاری مدد ہو سکے گی، ہاں اگر بغیر سوال یہ خدمت تمہارے حوالہ کی جائے تو بلا شبہ امداد و اعانت کی امید ہے[2]"

اس طرح ایک دفعہ حضرت ابو ذرؓ نے درخواست کی تو فرمایا اور شفقت و محبت کے لب و لہجہ میں فرمایا

---

[1] السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ ص۳ لابن تیمیہ [2] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ عن البخاری ومسلم

"ابو ذر تم کمزور ہو، اور یہ کام ذمہ داری کا ہے، قیامت کے دن رسوائی اور باعث ندامت ہوگا (لہذا پرہیز کرو) ہاں وہ شخص ایسی ذمہ داری قبول کر سکتا ہے، جو پورے طور پر ذمہ داری کے حقوق کو ادا کر سکے[1] اور کسی کا اپنے کو اس لایق سمجھنا زیبا نہیں)

ایک مرتبہ رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

"تم دیکھو گے کہ جو بہترین لوگ ہیں وہ اس طرح کی ذمہ داری کے کام کو بہت ہی ناگوار سمجھتے ہیں ہاں وہ خواہ مخواہ اس ذمہ داری میں پکڑے جائیں وہ الگ بات ہے[2]"

ان حدیثوں کو سامنے رکھتے ہوئے ماننا پڑے گا کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں حکومت سے متعلق کاموں سے اپنے آپ کو وسعت بھر بچانا ہی اچھا ہے، اور یہ کہ کہ آپ کا یہی دستور تھا کہ جو لوگ حرص و ہوس کا شکار ہو کر خود حکومت کے کسی شعبہ میں رہنا چاہتے تھے، ان کو آپ کسی قیمت پر نہیں رکھتے تھے، اور اس کی وجہ یہی بیان فرماتے تھے کہ ایسی حالت میں مولیٰ کی دستگیری اور پبلک کی اعانت جیسی چاہیے، ہونے کی امید نہیں، ہاں بغیر خواہش کوئی طاقت رہنے پر مجبور کر دے، تو خدا کے بھروسہ پر قبول کر لے، کیوں کہ ایسی حالت میں رب العزت کی طرف سے نصرت کی توقع ہے، حدیث میں آیا ہے

من طلب القضاء واستعان علیہ	جو شخص شعبہ قضا کا طالب ہو اور اس پر امداد
وکل الیہ ومن لم یطلب القضاء	کا خواہاں تو اس کو بے سہارا چھوڑ دیا جائے
ولم یستعن علیہ انزل الیہ ملکا	گا، اور جو نہ اس کا طالب ہو اور مدد کا خواہاں
یسدد کا رواہ اھل السنن	تو اس کی فرشتہ کے ذریعہ راہ نمائی کی جائے گی۔

(السیاسۃ الشرعیہ ص۲۰)

بہرحال عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ حکومت کے مختلف شعبوں میں ان لوگوں کو رکھا جائے جو ان کے اہل ہوں اور رکھنے والے کا فریضہ ہے کہ اصلح اور مستحق کو تلاش کر کے لائے اور

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ عن البخاری [2] ایضاً عن البخاری ومسلم

جگہ دے، غیر اہل کو کسی صورت میں ذمہ داری کا کوئی کام حوالہ نہ کیا جائے، اگر کوئی اس کے خلاف کرتا ہے، تو وہ امانت کا حق ادا نہیں کرتا، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

فان عدل عن الاحق الاصلح الی غیرہ لاجل قرابۃ بینھما او ولاء عتاقۃ او صداقۃ او موافقۃ فی بلد او مذھب او طریقۃ او جنس کالعربیۃ والفارسیۃ والترکیۃ والرومیۃ او لرشوۃ یاخذھا منہ من مال او منفعۃ او غیر ذالک من الاسباب او لضغن فی قلبہ علی الاحق او عداوۃ بینھما فقد خان اللہ ورسولہ والمؤمنین ودخل فیما نھی عنہ فی قولہ تعالی یا ایھا الذین امنوا لا تخونوا اللہ والرسول ولا تخونوا امانا تکم وانتم تعلمون (السیاسۃ الشرعیۃ صـ۲)	(حکمراں طبقہ میں) کسی نے اگر اپنی قرابتداری رشتہ آزادی، دوستی، یا شہر، مذہب، طریقہ اور یا جنس کی موافقت کی وجہ سے اصلح اور لایق ترین کو چھوڑ دیا، جیسے عربی نے عربی کو، یا فارسی نے فارسی کو یا رومی نے رومی کو جنس کی وجہ سے ترجیح دیا، یا رشوت میں مال وغیرہ لے کر اس نے ناانصافی کی، یا اس لئے حقدار اور با صلاحیت کو نظر انداز کیا کہ اس سے عداوت یا کینہ وغیرہ تھا ان تمام صورتوں میں اس نے اللہ تعالی، اس کے مقدس رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی، اور اس آیت کے تحت داخل ہو گیا جس سے اس سے روکا گیا ہے، اللہ تعالی نے فرمایا ہے اے ایمان والو! اللہ تعالی اور رسول سے خیانت نہ کرو، اور نہ اپنی امانت میں تم خیانت کرو، حالانکہ تم جانتے ہو۔

حکومت کی ذمہ داری اہل حکومت کے ہاتھوں میں امانت کی حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے قرآن پاک اور حدیثوں میں عموماً ایسے موقع کے لئے امانت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، شروع مضمون میں جو آیت میں نے نقل کی ہے اس میں آپ پڑھ آئے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ (النساء - ۸) بلاشبہ اللہ تعالی تم کو اس بات کا حکم دیتا ہے کہ حقوق ادا کرو

(باقی آئندہ)

بزم مملوکیہ

از

(مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی لکچرر تاریخ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

فن تاریخ اور تاریخ نویسی کے متعلق عصری رجحانات اور بدلتے ہوئے ظروف و احوال کے تقاضوں کے پیش نظر آج اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے کہ اپنے ملک کے اسلامی عہد کی تاریخ تمدنی، ثقافتی اور علمی و ادبی نقطۂ نگاہ سے از سرِ نو مرتب کرکے پیش کی جائے۔ اور ان تمام تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے جو اگلے مؤرخین کے عام رجحانات کے مطابق فن تاریخ کے ثانوی ابواب سمجھے جاتے تھے۔

اس خاص سلسلہ کی تاریخی کتابوں کی تدوین کا کام بہت دشوار اور صبر آزما ہے جس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے قلتِ مآخذ کے باوجود قدیم و جدید مطبوعات کی ایک معتدبہ تعداد کی مدقق گردانی سے گذر کر قلمی کتابوں کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات سے جستہ جستہ فقروں کو جمع کرنا ضروری ہے پھر کہیں ان منتشر ریزوں کو قرینہ سے سجانا اور اور سلیقہ سے نظم دے کر بساطِ علم و تحقیق پر پیش کرنا ممکن ہوتا ہے۔

ملک کے وہ ادارے ہماری تحسین و آفریں کے واقعی حقدار ہیں جن کے رفقا اپنے ملک و قوم کی موجودہ پود اور آئندہ نسل کی خاطر سلف کی تاریخ کا مطالعہ اس زاویۂ نگاہ سے کرتے ہیں اور ان اوراقِ پارینہ کو اپنی محنتِ شاقہ کے ذریعہ نئی روشنی میں ترتیب دینے کی فکر میں مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ مشہور علمی ادارہ دار المصنفین اعظم گڈھ (یوپی) کے لائحہ عمل میں اس قسم کے تاریخی سلسلوں کو نمایاں اہمیت حاصل ہے، چنانچہ علمی و ادبی تاریخ کے سلسلہ کی ایک قابل قدر کتاب بزم تیموریہ اسی ادارہ کی طرف سے شائع

ہو کر علمی حلقوں میں متعارف ہو چکی ہے۔ زیر بحث کتاب اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ جواد الذکر کتاب ہی کے فاضل مؤلف جناب سید صباح الدین عبد الرحمن ایم۔ اے کے قلم سے نکلی ہے اور سالِ رواں میں دار المصنفین کی طرف سے منظرِ عام پر آئی ہے۔

کتاب میں عہدِ ممالیک ہند یعنی قطب الدین ایبک (۶۰۲ھ تا ۶۰۷ھ) کی تخت نشینی سے معز الدین کیقباد (۶۸۶ھ تا ۶۸۹ھ) کے عہدِ سلطنت تک کل چوراسی سال کی علمی و ادبی تاریخ، محققانہ پیرایۂ بیان میں پیش کی گئی ہے اسی مناسبت سے کتاب کا نام بزم مملوکیہ رکھا گیا ہے۔

ٹائیٹل پیج کے بعد ہی زیرِ بحث سلاطین اور ان میں سے ہر ایک کے عہدِ حکومت سے متعلق ذیلی عنوانات کی فہرست چھ صفحوں میں ملتی ہے۔ پھر کتاب کا پیش لفظ معروف صاحب قلم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے قلم سے اور اس کے بعد خود مؤلفِ کتاب کا دیباچہ کل چھ صفحوں کو محیط ہے۔ اصل کتاب ۳۴۹ صفحوں پر پھیلی ہوتی ہے اخیر میں ایک غلط نامہ بھی شامل ہے۔

کتاب کو پڑھ کر انصاف پسند طبائع کے لئے یہ باور کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ اسلامی ہند کے یہ تاجدار جن کی غلامانہ زندگی عظیم الشان سلطنتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تھی اُن کی شخصیتیں کچھ ملک گیری و تیغ آزمائی ہی کے لئے وقف نہیں تھیں بلکہ علم و فن، حکمت و دانش، شعر و ادب کی سرپرستی، تمدنی و ثقافتی قدروں کے تحفظ و بقاء اور ذہنی و دماغی ارتقار کے اسباب مہیا کرنے میں بھی غیر معمولی طور پر سرگرم کار رہی تھیں۔

کتاب کی ترتیب عام تذکروں اور طبقاتی کتابوں کے نہج پر نہیں ہے بلکہ سیاسی تاریخ کے اعتبار سے رکھی گئی ہے لہذا کتبِ تراجم کی طرح کسی ایک شخص کا مکمل تذکرہ ایک جگہ نہیں لکھا گیا ہے۔ کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شعرار کے کلام اور بعض

مشہور مصنفوں کے اسلوبِ نگارش پر تبصرہ کرتے ہوئے مؤلف کے قلم سے ادبی مباحث و فوائد کے سلسلہ میں کار آمد باتیں نکل گئی ہیں۔ بہر حال دہلی کے مملوک سلاطین کے عہد میں قصرِ سلطانی سے نکل کر ایک طرف اچہ اور دوسری طرف لکھنوتی تک وزرار، امرار، والیانِ ملک اور اقطاعداروں کے درباروں میں علمی و ادبی بزم آرائیوں کی جہل پہل جس حد تک کہ مستند ماخذوں سے فاضل مؤلف کو معلوم ہو سکی ہے اس کی عکاسی بزم مملوکیہ کے صفحات میں کی گئی ہے۔

دار المصنفین کا نام کتاب کے مستند و معتبر ہونے کی ضمانت ہے۔ اس ادارہ کی دوسری کتابوں کی طرح زیر بحث تالیف بھی عصری طرز تحقیق پر لکھی گئی ہے اور تاریخی روایات کو قبول یا رد کرنے کے سلسلہ میں ممکنہ بحث و تحیص سے کام لیا گیا ہے، لائق مؤلف کی کاوش و دقتِ نظر کا اعتراف کرنا ہمارا علمی و اخلاقی فریضہ ہے لیکن ان کی توجہ ان مواقع کی طرف مبذول کرانا ضروری ہے جہاں راقم آثم کو ان کی پیش کردہ تحقیق سے اتفاق نہیں ہو سکا۔

(۱) فاضل مؤلف نے قطب الدین ایبک کے درباری شعرار کے تذکرہ میں الصدر الاجل افتخار الملک افضل العصر جمال الدین محمد بن نصیر کا ذکر عوفی کی کتاب لباب الالباب کے حوالہ سے کیا ہے (ص ۱۱-۱۳) ان کو کامل یقین ہے کہ جمال الدین محمد کو ایبک کے دربار سے تعلق رہا تھا اور اس نے ایبک کی شان میں مدحیہ قصائد کہے تھے۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی شہادت مؤلف کو ملی تھی تو اس کا ذکر کرنا اور ماخذ کا حوالہ دینا ضروری تھا۔ اور اگر انھوں نے یہ نتیجہ صرف عوفی کی لباب الالباب سے اخذ کیا ہے تو میں ان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ عوفی کے بیان میں ایسا اشارہ بھی موجود نہیں جس سے یہ سمجھا جائے کہ ایبک کے دربار میں جمال الدین محمد کبھی رہا تھا یا اس نے ایبک کی شان میں قصیدہ خوانی کی تھی۔ عوفی نے اس شاعر کے جو اشعار نقل کئے ہیں وہ بھی کسی قسم کی داخلی شہادت مہیا نہیں کرتے۔ اس شاعر کے متعلق عوفی کے صرف یہ الفاظ ملتے ہیں جو سلاطینِ غور کے دربار سے شاعر کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں — "در دولت

ملوک جبال قوی حال بود واز اقبال سلطان سعید با علیشے حمید روز گذاشت ۔ (لباب الالباب ج ۱ ص ۱۷۱) مؤلف نے اسی عبارت کا آخری فقرہ اپنے مندرج ذیل دعوی کے ثبوت میں نقل کیا ہے :

"قطب الدین ایبک نے جمال الدین محمد کے علم کی بھی پوری قدردانی کی اور اس کی التفات شاہانہ سے جمال الدین کی زندگی عیش و عشرت میں گذری"۔ (ص ۱۲)

مؤلف کے نظریہ میں عوفی نے "سلطان سعید" سے قطب الدین ایبک ہی کو مراد لیا ہے علی ہذا القیاس ان کے زعم میں وہ مدحیہ قصائد گویا ایبک ہی کی شان میں تھے جن کے منتخب اشعار عوفی نے شاعر کے ترجمہ میں درج کئے ہیں ۔ میرا خیال ذاتی طور پر یہ ہے کہ فاضل مؤلف نے جمال الدین محمد اور اسی طرح ظہیر الدین تاج الکتاب السرخسی (ص ۱۴) کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری کا احساس مطلق نہیں کیا ۔ السرخسی کے ذکر میں کسی حد تک ان کو انتباہ ضرور ہوا ہے لیکن جمال الدین محمد کی بابت تو ان کے بیان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے نظریہ کی غلطی کا انھیں احساس نہیں ۔ راقم کے عقیدہ میں مرحوم محمد خاں بن عبدالوہاب قزوینی کی بات مسلّم ہے وہ "سلطان سعید" سے متعلق حواشی میں تحریر فرماتے ہیں ۔
"سلطان سعید یعنی سلطان غیاث الدین غوری . . . . . و در طبقات (طبقات ناصری) نیز غالباً از سلطان غیاث الدین غوری بہ سلطان سعید تعبیر میکند واز برادر او سلطان شہاب الدین غوری بہ سلطان شہید" ۔ (دیکھو لباب الالباب تعلیقات میرزا محمد قزوینی ص ۳۲۶) قزوینی کا عندیہ قوی قرینہ پر مبنی ہے چنانچہ جمال الدین محمد کے بعد ہی عوفی نے فرید الکاتب کے ترجمہ میں غیاث الدین غوری کو "سلطان سعید" کہا ہے (لباب ج ۱ ص ۱۲۱) پھر فخر الدین مبارک شاہ مرورودی کے تذکرہ میں اس کا اعادہ کیا ہے (لباب ج ۱ ص ۱۲۶) عوفی نے صریح لفظوں میں فرید الکاتب اور جمال الدین محمد کے درمیان مکاتبہ و مشاعرہ کا ذکر کیا ہے ۔ غرض قرین صواب تنہا یہی شق ہے کہ جمال الدین

محمد کے ترجمہ میں سلطان سعید سے غیاث الدین غوری کو اور سلطان شہید سے شہاب الدین غوری کو مراد لیں نہ کہ قطب الدین ایبک کو اس کے بعد بزم مملوکیہ کے صفحات میں جمال الدین محمد کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

(۲) امام صاغانی کا ذکر حسن تفصیل سے کیا گیا ہے (ص ۲۹ - ۳۴) اس کا تقاضہ یہ تھا کہ چند دوسرے ماخذ سے بھی استفادہ کیا جاتا اس طرح مؤلف کے بیان میں زیادہ جامعیت پیدا ہو جاتی میں یہاں جن ماخذوں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں ان میں سے یاقوت کی ارشاد الاریب (گب میموریل و دار المامون مصر) ابن ابی مخرمہ کی تاریخ ثغر عدن (طبعۂ اوسکر لوفغرین)، الکتبی کی فوات الوفیات (النہضہ، مصر) اور ابن الفوطی کی کتاب تلخیص مجمع الآداب فی معجم الالقاب (اورنٹیل کالج میگزین، شیرانی نمبر) کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے۔ یاقوت خود صاغانی سے ملا تھا اس کے مختصر بیان میں بعض مفید اطلاعات درج ہیں (ج ۹ ص ۱۸۹ مصر) ابن الفوطی کو بھی امام کی رویت کا شرف حاصل ہے لیکن وہ کم عمر تھا پھر بھی اس کا دعویٰ ہے کہ صاغانی سے اس کو جملہ مصنفات ومرویات کی اجازت ملی تھی (تلخیص مجمع الآداب ص ۵۶) اسی طرح الکتبی کی اختصار پسندی کے باوجود اس کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں۔ ابن ابی مخرمہ کی تاریخ میں زیادہ تفصیل ملتی ہے۔ لیکن اس نے تاریخ وفات ۶۶۵ھ بتائی ہے جو ناقابل تسلیم ہے اسی تاریخ میں قاضی مجد الدین الصدیقی کی سند صاغانی تک نقل کی گئی ہے جس سے امام موصوف کے نسب نامہ میں علی کے والد کا نام معلوم ہوتا ہے یہ واضح رہے کہ عام طور پر صاغانی کا نسب نامہ علی پر ختم کر دیا جاتا ہے۔ قاضی مجد الدین دو واسطوں سے صاغانی کے شاگرد ہیں ان کی سند تصانیف ابو داؤد سجستانی کی اجازت سے متعلق ہے سند میں صاغانی کا ذکر اس طرح آیا ہے ...... الشیخ الامام الصالح ابوالفضائل الحسن بن محمد بن الحسن بن حیدر بن علی بن

اسمعیل القرشی العدوی العمری الصغانی الخ (تاریخ ثغر عدن ج ۲ ص ۵۳

لائیڈن ۱۹۳۶ء)

یاقوت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنن ابی داؤد کی بے نظیر شرح معالم السنن اور اس کے جلیل القدر مؤلف الخطّابی سے صاغانی کو بڑی عقیدت تھی، عدن میں ان کا خاص مشغلہ اس کتاب کا درس دینا تھا، خطابی کی نسبت اکثر یہ جملہ فرمایا کرتے تھے:

اِنَّ الخطّابی جمع لهذا الکتاب جرامیزه ۔ اس کے علاوہ ابو عبید القاسم بن سلّام کی کتاب غریب کو حفظ کرنے کی ترغیب اپنے تلامیذ کو دلاتے، وہ خود بھی اس کتاب کے حافظ تھے ۔ یمن کا سفر کئی بار کیا، یاقوت کے بیان سے ظاہر ہے کہ حج سے مشرف ہونے کے بعد ۶۰۱ھ میں عدن پہنچے دوبارہ ۶۱۳ھ میں حرمین کی زیارت کی اور یمن کو لوٹ آئے صحیح واقعہ یوں ہے کہ ۶۱۳ھ کے بعد ہی شاید پہلی دفعہ بغداد پہنچے یہاں سے خلیفہ وقت (الناصر ۶۲۲ھ) کی طرف سے سندھ جانے پر مامور ہوئے اس سفر کی تاریخ الھون نے العباب الزاخر میں ۶۱۷ھ بتائی ہے ۔ (معارف ج ۶۹ ع ۲ ص ۲۲۵) اسی سفر میں ان کو دوبارہ یمن سے گذرنے کا موقع ملا ہوگا جس کا ذکر یاقوت نے کیا ہے ۔ ابن ابی مخرمہ اور ابن الفوطی کے یہاں ورودِ بغداد کی تاریخ ۶۱۵ھ ہے جس کے بعد ابن الفوطی کے بیان کے بموجب ان کو پیام دے کر بادشاہ ہند کے پاس بھیجا ۔ اس موقع پر بغداد سے نکل کر دوبارہ خلیفہ المستنصر کے عہد (۶۲۳ھ) سے پہلے نہیں لوٹے ۔ بہر حال یمن کئی بار گئے اور ان کا قیام زیادہ تر عدن میں رہا جہاں طُلّابِ علم کو درس دینے کے علاوہ کئی نسخے صحیح بخاری کے اپنے قلم سے لکھ کر وقف کئے ان کی مجلس تحدیث الوزیر یاسر بن بلال کی تعمیر کردہ مسجد میں منعقد ہوتی تھی جو مسجد ابن البصری کے نام سے مشہور ہو گئی تھی ۔

صغانی کے ممتاز تلامذہ میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نام عام طور پر مشہور نہیں مثلاً ابو اسحق ابراہیم بن ادریس الازدی السُردی نے صغانی سے ان کی جملہ مرویات کو اخذ کیا

(تاریخ ثغر عدن ج ۲ ص ۲) قاضی ابراہیم ابن محمد القریظی نے الخطب النباتیہ کی اجازت حاصل کی (الیضاح ۲ ص۹) ابو الربیع سلیمن ابن الفقیہ بطال محمد الرکبی مختص تلامذہ میں تھے (الیضاح ۲ ص۹۷) ابو الربیع مذکور کے والد فقیہ بطال صغانی کے ہمسر تھے ہر ایک نے دوسرے سے اخذ کیا (الیضاح ۳ ص۲۰) محمد بن الحسن التیمی الفارسی نے لغت کا فن حاصل کیا (الیضاح ۳ ص۲۰۹) منصور بن حسن بن منصور الفرسی نے مقامات حریری اور دوسری کتابیں پڑھیں (الیضاح ۳ ص۲۳۶) احمد بن علی السُرددی نے ۶۳۰ھ کے بعد جب صغانی کا ورود تعز میں ہوا تو اخذ علم کیا اور احمد بن محمد بن عمر بن اسمٰعیل الشہر زوری کو بھی تلمذ کا شرف حاصل تھا جنھوں نے صغانی کے مرثیہ میں یہ ابیات کہے

اقول والشمل فی ذیل النوی عثرا ــــ الخ

صغانی کے کلام کا جو نمونہ سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ میں ملتا ہے اس کے علاوہ یاقوت کی ارشاد الاریب میں چار اشعار ہیں جن پر اپنی تالیف مناسک الحج ختم کی تھی:

شوقی الی الکعبۃ الغراء قد زادا ــــ الخ

احمد بن علی السرددی کے حوالہ سے الجندی نے دو شعر درج کیے ہیں: تعلمت اسباب القناعۃ یا فعا ــ الخ

ابن ابی مخرمہ نے الخزرجی کے حوالہ سے ایک پورا قصیدہ نقل کیا ہے جو ۹۰ ابیات پر مشتمل ہے یہ قصیدہ ابن ابی مخرمہ کے عہد ہی میں عزیز الوجود ہو چکا تھا اسی کا مطلع ہے:

أنسانی الدھر أعطانی واوطانی   وحطنی وھا والخسف اوطانی

قصیدہ میں صاغانی اپنی سرگذشتِ حیات کی طرف اشارات کرتے ہیں ہند، سند، مکران کا ذکر کرتے ہیں لیکن لاہور، بداؤں یا غزنہ کا ذکر نہیں کرتے قصیدہ کے آخری ابیات میں ایک جگہ اپنا عمری ہونا واضح کرتے ہیں:

فقلت یا دھر سالمنی مسالمۃ   فاننی عمریٌ ثم صاغانی

فوائد الفواد کی روایت میں صغانی کا تعلق غیر مبہم طور پر بداؤں سے ثابت ہے لیکن اسے مولد قرار دینے کے لئے روایت کے الفاظ کافی نہیں ہیں جیسا کہ مؤلف کا خیال ہے

(صہ ۳۲)۔ فوائد الفواد کی یہ روایت بلاشک امام صغانی ہی سے بحث کرتی ہے اور حسن سجزی کی مسامحت کا جو احتمال ظاہر کیا گیا ہے اسے تسلیم کرنے کو راقم آمادہ نہیں۔ سجزی کے قربِ زمانی کو دیکھتے ہوئے ان کی طرف تخلیط کی نسبت قرینِ قیاس نہیں، اگر صاحب نزہۃ الخواطر فوائد الفواد کے رضی الدین صغانی کا ذکر زیر بحث صغانی کے ترجمہ سے علیحدہ کرتے ہیں تو اس سے حسن سجزی کے بیان کو مشتبہ قرار دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

صغانی کی تصانیف کو شمار کراتے ہوئے مؤلف نے لکھا ہے: — "حدیث میں ان کی اور دوسری تصانیف یہ ہیں۔ التکملہ علی الصحاح، یا التکملہ والذیل والصلہ، الدار (؟) الملتقط فی تبیین الغلط، رسالہ فی الاحادیث الموضوعہ" الخ (صہ ۳۲)

التکملہ علی الصحاح کے نام سے مؤلف کو سخت دھوکا ہوا ہے صحاح کے لفظ سے ان کا خیال یقیناً حدیث کے مشہور مجموعے صحاح ستہ کی طرف منتقل ہو کر رہ گیا اور وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ حدیث کی کتب ستہ کے تکملہ کے طور پر امام صغانی کی یہ تالیف ہوگی۔ گو کہ لفظ صحاح سے اوّلاً انہی کتابوں کی طرف انتقالِ ذہن ہوتا ہے لیکن یہاں اس سے صحاح اللغۃ وتاج العربیۃ للجوہری مراد ہے جو لغتِ عرب کی معروف و متداول کتاب ہے۔ امام صاغانی کی کتاب فنِ لغت میں جوہری کی مذکورہ کتاب کا تکملہ ہے اسی کا نام الذیل والصلہ بھی ہے ابن ابی مخرمہ کا بیان ہے:

"وھما کتابٌ واحد ذکر فیہ ما اھملہ الجوھری فی صحاحہ وجعلھما الخزرجی کتابین"

اس ضخیم تالیف کے معتبر نسخے مصنف کی زندگی کے لکھے ہوئے بلادِ اسلامیہ کے بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں:۔ (تاریخ ثغر عدن ج ۲ صہ ۵۴)

الدر الملتقط کا موضوع بے شک حدیث ہے لیکن رسالہ فی الاحادیث الموضوعہ کوئی علیحدہ کتاب نہیں ہے یہ ایک رسالہ ہے جس میں موضوع اور جعلی حدیثوں پر بحث ہے

اس کا پورا نام کتاب الدر الملتقط فی تبیین الغلط ونفی اللغط فی الاحادیث الموضوعہ ہے۔

لغت میں صغانی کی سب سے زیادہ ضخیم کتاب العباب الزاخر واللباب الفاخر ایک بے مثل کتاب سمجھی گئی ہے جو ادھوری رہی تھی، مؤلف نے یہ تصریح نہیں کی ہے کہ یہ کتاب ناتمام رہی اور مادہ "بکم" تک پہنچے تھے کہ صغانی کی شمعِ حیات گل ہوگئی۔ یہ کتاب آخری عباسی خلیفہ المستعصم کے وزیر مؤیدالدین ابن العلقمی کے خزانہ کے لئے لکھی گئی تھی اس کی پہلی جلد دار الکتب المصریہ میں محفوظ ہے ایا صوفیا اور کوپرلو میں اس کی مختلف جلدیں باقی ہیں، یہ واضح رہے کہ صغانی کے جسم میں اخیر عمر میں رعشہ پیدا ہوگیا تھا چنانچہ اپنے قصیدہ میں فرماتے ہیں:

فصار سھمی فی شیبی وفی کبری　　وفی ارتعاشی بعد الاول الثانی

اس غیر اختیاری حالت میں بھی ان کا قلم برابر رواں رہا کیا اور خط پر رعشہ کا جیسے کوئی اثر نہیں پڑا، ان کا خط ضبط واملائی خصوصیات کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کا مانا گیا ہے مجلہ معارف کے محولہ بالا صفحہ سے واضح ہوگا کہ امام موصوف الفاظ کے ضبط میں کس حد تک اہتمام فرمایا کرتے تھے۔

بعض کتابوں کے نام محرّف یا ادھورے ہیں مثلاً توشیح الدریدیہ کا صحیح نام نظم القلادۃ السمطیۃ فی توشیح الدریدیہ ہے، اسی طرح التراکیب، کتاب تراکیب مجمع البحرین اور الذئب کتاب اسماء الذئب ہے؛

(۳) تاج الدین ریزہ کی مشتبہ نظم سلطان رضیہ کی شان میں جس کے متعلق بہ قول مؤلف پروفیسر شیرانی مرحوم کو تردد لاحق رہا پھر اپنے اخیر نوشتہ میں گویا انھوں نے اسے تاج ریزہ ہی کا کلام قرار دیا (ص ۱۱۸-) اسی نظم کے متعلق میری گذارش درج ذیل ہے۔

یہ بات مؤلف تسلیم کرتے ہیں کہ زیر بحث نظم کلیات انوری کے نسخوں میں شامل ہے،

اور خود حافظ محمود شیرانی مرحوم نے ایک معتبر نسخہ میں اس نظم کو پایا تھا۔ لیکن ان کے نسخہ میں مخاطب کا نام "کریمۃ النسار رضیۃ الدین تھا اور مؤلف کے پیش نظر نسخہ میں "صفوۃ الدین مریم" ہے میری نظر سے بھی ایک معتبر نسخہ گذرا ہے جس میں سرخی کی جگہ خالی رہ گئی ہے لیکن اشعار میں "کریمۃ النسار" کے بجائے "زبدۃ النسار" کے الفاظ ہیں ابیات اس طرح ہیں:

سلطانت کہ زبدۃ النسا خواند		شد ذات شریف تو مکرم
راضی ز تو اے رضیۂ دین		جبار تو (؟) ذوالجلال اکرم

شعر میں صرف "رضیۃ الدین" یا "رضیۂ دین" کے الفاظ کی بنا پر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ رضیۃ بنت التمش کی شان میں یہ نظم ہو گی اس کے علاوہ اور دوسری شہادت کا ذکر نہ تو شیرانی مرحوم نے کیا ہے اور نہ مؤلف نے۔ راقم السطور کے خیال میں "صفوۃ الدین"، "زبدۃ النسار"۔ "کریمۃ النسار" اور "رضیۂ دین" صرف القاب و آداب ہیں اور شہزادی کا اصل نام مریم ہے جیسا کہ اسی نظم میں آتا ہے:

موجود شد از تو جود و احساں		چونانکہ مسیح شد ز مریم

میرے خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اسی معزز خاتون کو ایک اور نظم میں خطاب کیا گیا ہے جس کا عنوان "یمدح السلطان الخواتین صفوۃ الدین مریم گوید (؟)" ہے اس نظم کا مطلع حسب ذیل ہے:

اے نہاں گشتہ در بزرگی خویش		وز بزرگی ز آسماں شدہ بیش

اور ایک شعر جس سے اس معزز خاتون کا نام معلوم ہوتا ہے وہ بھی سن لیجئے:

شاد باش اے بمعجزاتِ کرم		مریمے از ہزار عیسی بیش

اس نظم میں رضیۃ الدین، کریمۃ النسار یا زبدۃ النسار کے الفاظ نہیں آتے ہیں اور یہ نظم مسلمہ طور پر انوری کی کہی جا سکتی ہے اس لئے کہ جن نظموں کی نسبت تاج ریزہ کی طرف کی جاتی ہے ان میں یہ داخل نہیں ہے۔ اب یہ بات یقین کی حد تک پہنچ جاتی

ہے کہ دونوں نظمیں کسی سلجوقی خاتون مریم کی مدح میں ہیں جس کی توصیف میں شاعر نے کبھی "رضیۃ الدین" اور کریمۃ النساء کے القاب بھی نظم میں پرو دیئے ہیں ان میں سے ظاہر ہے کہ اصل خطاب تو ایک ہی ہوگا باقی الفاظ اختلافِ نُسخ سے زیادہ نہیں ہیں۔ مؤلف نے بظاہر کماحقہ تأمل سے کام نہیں لیا اور نہ دوسری نظم کے متعلق غور کیا ورنہ زیر بحث نظم کی بابت ان کا رجحان تاج ریزہ کے حق میں نہ ہوتا میرے پیش نظر جو نسخے رہے ہیں وہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں (شمارہ: ۵۰۴ و ۵۱۴ ذخیرۂ سوسائٹی)

امیر فخر الدین عمید سنامی جس کو عمید تولکی بھی کہتے ہیں اس کے متعلق مؤلف نے تحریر فرمایا ہے:

"ملا عبد القادر بدایونی نے سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں امیر فخر الدین عمید کا تعارف ایک شاعر کی حیثیت سے کرایا ہے اور سلطان کی شان میں اس کا ایک قصیدہ نقل کر کے اس کو بھی اس کے مدح خوانوں میں شمار کیا ہے" (ص ۱۹۶)

میں اولاً یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں عمید کا جو تعارف کرایا ہے اس کی حیثیت کیا ہے اس تعارف کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے منتخب التواریخ کا سیاق و سیاق پیش نظر ہو تو آپ دیکھیں گے کہ بدایونی کے سلطان ناصر الدین محمود بن التمش کی وفات کا ذکر کرنے کے بعد شمس دبیر کے متعلق لکھا ہے کہ عہد ناصری کا شاعر تھا لیکن انہوں نے سلطان ناصر الدین محمود کے دربار سے اس کے روابط پر مطلق روشنی نہیں ڈالی ہے اور اپنی اختصار پسندی کی بنا پر گویا بطریقِ طفرہ یہ بیان کرنا شروع کر دیا ہے کہ عہد بلبنی میں شمس دبیر سلطان ناصر الدین محمود بغرا خان سلطان غیاث الدین بلبن کی ملازمت میں مملکت بنگالہ و کامرود کا منشی دبیر بنا دیا گیا ساتھ ہی ملا صاحب نے شمس دبیر کا ایک قصیدہ درج فرمایا ہے جس کی ردیف "خام" ہے اس قصیدہ کے منتخب اشعار کو ختم کرتے ہی غیر متوقع طور پر عمید سنامی کے قصیدہ کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

"و ملک الملوک (؟) و الکلام امیر فخر الدین عمید تولکی (؟) می فرماید در قصیدہ کہ

مطلعش اینست : چو بر دارد نگارم چنگ بند د زخمہ بر ناخن ـــ الخ

(منتخب التواریخ ج ۱ ص ۹۶ کلکتہ)

قصیدہ کے منتخب ابیات نقل کرنے کے بعد جیسے ملا صاحب کا جی چاہا کہ اس کے اور پسندیدہ قصائد بھی نقل فرمادیں چنانچہ انھوں نے متعدد قصائد حمد، نعت، مدائح وحبسیات نقل کردیئے ہیں اب یہ بیان کرنا شاید ضروری نہ ہو کہ عمید کا ذکر ضمناً آگیا ہے۔

فی الحال مجھے ردیف "ناخن" والے قصیدہ کی بابت یہ کہنا ہے کہ ملا صاحب نے خود کسی قسم کی صراحت نہیں کی ہے کہ عمید کا یہ قصیدہ سلطان ناصر الدین پسر التمش کی مدح میں ہے۔ اور نہ سیاقِ کلام کی دلالت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ البتہ اس قصیدہ میں "شہنشہ ناصر دنیا و دین محمود" کو خطاب کیا گیا ہے اور یہیں سے جناب مؤلف یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قصیدہ سلطان ناصر الدین محمود کی شان میں کہا گیا ہے لیکن میرے خیال میں اگر یہ کہا جائے کہ اس قصیدہ کا مخاطب ناصر الدین محمود بغرا خاں ہے تو اس کا قوی قرینہ موجود ہے۔ کہ ملا عبد القادر نے جس ترتیب سے شمس دبیر کے قصیدہ کے بعد عمید تولکی کا قصیدہ نقل کیا ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ شمس دبیر اور عمید دونوں کے قصیدوں کا مخاطب سلطان ناصر الدین محمود کے بجائے بلبن کا فرزند بغرا خان ہو۔ یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ شمس دبیر اور عمید دونوں کے قصیدے علی الترتیب کسی قریبی مناسبت کے بغیر نقل کردئے گئے ہوں۔ اور ان دونوں میں اگر کوئی مناسبت ہوسکتی ہے تو یہی کہ دونوں کا مخاطب ایک ہو۔ ورنہ اس کے کیا معنی کہ شمس دبیر کے قصیدہ کا مخاطب تو ناصر الدین بغرا خاں ہو اور عمید کے قصیدہ کا مخاطب سلطان ناصر الدین بن التمش کو قرار دیا جائے۔ ملا صاحب کے بیان سے واضح طور پر مترشح ہوتا ہے کہ خود ان کے خیال میں عمید کا ذکر برمحل نہیں آیا چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:۔

"چوں ذکر عمید کہ مستوفی جمیع ممالک ہندوستان بود درمیان آمد چیزے از اشعار او راکہ عزیز الوجود است ایراد نمودن ضروری بود" (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۹۹ کلکتہ)

"درمیان آمد" کے الفاظ پر غور فرمائیے میرے نزدیک تو ان لفظوں کا یہی مطلب

ہوا کہ عمید کا ذکر اصل موقع و محل میں نہیں کیا گیا ہے لیکن شمس دبیر کے قصیدہ کی مناسبت سے جب اس کا قصیدہ بھی نقل کر دیا گیا تو اسی جگہ دوسرے قصائد بھی درج کر دیئے گئے۔ بہر حال ملا عبد القادر کے سیاق و سباق کو دیکھتے ہوئے میرا خیال یہ ہے کہ عمید کا زیر بحث قصیدہ ناصر الدین محمود بغرا خاں کی شان میں ہے۔ اور ملا عبد القادر کے متعلق یہ کہنا کہ انھوں نے عمید کو سلطان ناصر الدین محمود کے مدح خوانوں میں شمار کیا ہے ہرگز صحیح نہیں۔

عمید کی تاریخِ ولادت اس کے ایک شعر سے نکلتی ہے۔ بہ قول مؤلف عرفات العاشقین میں اسی شعر سے تاریخِ ولادت ۶۵۵ھ نکالی گئی ہے اور مجمع الفصحار، گل رعنا در ریاض الشعراء میں ولادت کی یہی تاریخ بیان کی گئی ہے لیکن فاضل مؤلف نے ان تمام ماخذوں کی بتائی ہوئی تاریخ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے جس شعر سے عرفات العاشقین میں ۶۵۵ھ تاریخ نکالی گئی ہے اسی سے آپ ۶۰۱ھ تاریخ نکالتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے اس شعر کے مفہوم پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور منتخب التواریخ کے انگریز مترجم (Ranking) کی نکالی ہوئی تاریخ کو بدون تامل قبول کر لیا ہے۔ بہر حال پہلے عمید کے چند اشعار سن لیجیے پھر اس بحث پر غور فرمائیے:

یارب اگر چہ پیش ازیں بود مرا دل و جگر	خستہ دل پر چگل لبستہ گل رخِ یمک
در سر نون و دال عمر از پس خاد نون دبا	شکر کہ مرغ ہمتم رست بجہد زیں ترک
دست فشاندہ ام بریں، پائے کشادہ ام ازاں	جستہ زہر دو دام چوں گلِ خارۂ از نفک

بحث کا تعلق دوسرے شعر سے ہے جس سے تاریخِ ولادت نکلتی ہے۔ مؤلف کے الفاظ یہ ہیں:

"دوسرے شعر میں ن اور د کے تو ۵۴ - اور خ ن ہ کے ۶۵۵ ہوئے شعر میں "پس خاد نون دبا" ہے یعنی ۶۵۵ سے ۵۴ کو گھٹا لیا جائے پھر تعجب ہے کہ عرفات العاشقین نے ۶۵۵ھ کیسے تاریخِ ولادت بتائی ہے۔ ۶۰۱ھ ہونی چاہیے۔" (ص ۲۰۴)

جناب مولف نے اپنے خیال کے بموجب تاریخ نکالنے میں کامیابی تو حاصل کر لی ہے لیکن اس تاریخ سے دوسرے مصرعہ کے مفہوم کو کیا تعلق باقی رہتا ہے اور شعر کا اصل مطلب کیا ہے اس سے انھوں نے کچھ تعرض نہیں کیا۔ میرے نزدیک شعر کا صحیح مفہوم مقدم ہے تاریخ خواہ کچھ بھی نکلے۔ اور وہی تاریخ صحیح ہوگی جس سے شعر کا مفہوم خبط نہ ہو گیا ہو۔ مفہوم سیدھا سادہ یہ ہے کہ ۶۵۵ھ کے بعد اپنی زندگی کے ۴۵ ویں سال میں، شکر ہے، کہ ہمارے مرغ ہمت کو ہوا و ہوس کے دام سے رستگاری مل گئی۔ شاعر اپنی عمر کے گذشتہ سنین کا شمار ۶۵۵ھ سے کر رہا ہے جیسا کہ "از پس" کے لفظ سے واضح ہے۔ لہذا ۶۵۵ اور ۴۵ دونوں عددوں کو جمع کیجئے تو نظم کی تاریخ ۷۰۰ھ ہاتھ آئے گی جب کہ شاعر کی زندگی کا ۴۵ واں سال شروع ہو چکا تھا۔ پس عرفات العاشقین کے مولف نے جو تاریخ نکالی ہے وہی صحیح ہے اس شعر سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں، شاعر کی تاریخ ولادت ۶۵۵ھ، نظم کی تاریخ ۷۰۰ھ اور شاعر کی عمر۔ یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ ۷۰۰ھ کے اوائل میں شاعر یقیناً زندہ تھا۔ منتخب التواریخ کے مترجم Ranking اور اس کی تقلید میں جناب مولف نے لفظ "از پس" سے عمل تفریق کی طرف اشارہ کیسے سمجھ لیا میری فہم سے بالا ہے۔ ۶۵۵ سے ۴۵ کو گھٹا لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ شعر مہمل ہے۔ سخت تعجب ہے کہ عرفات العاشقین، ریاض الشعراء، گل رعنا اور مجمع الفصحا کی بتائی ہوئی تاریخ کو انھوں نے کیسے گوارا کر لیا کہ اس آسانی سے رد کر دیں۔ بظاہر یہ دعویٰ کہ عمید نے سلطان ناصر الدین محمود کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ پیش کیا (ص ۴۰۲) اسی کو ثابت کرنے کے لئے مولف نے عمید کی تاریخ ولادت سے متعلق رین کنگ کے غلط خیال کی تقلید کی۔ منتخب التواریخ جس کے بیان کے پیش نظر مولف نے ایسا دعویٰ کیا ہے سطور بالا میں اسی کتاب کے سیاق و سباق کے حوالہ سے میں واضح کر چکا ہوں کہ سلطان ناصر الدین محمود کو عمید کا ممدوح و مخاطب قرار دینا صحیح نہیں۔ اور ملا عبد القادر کا مقصد

اُس سے قطعاً جداگانہ ہے جو مؤلف نے سمجھا ہے۔

عمید کی عمر نو سال کی تھی کہ سلطان ناصر الدین محمود کی وفات واقع ہوئی وہ غیاث الدین بلبن کے عہد میں سن شعور کو پہنچا۔ ملا عبد القادر نے اس کے جتنے قصیدے نقل کئے ہیں اُن میں سے ایک قصیدہ بھی غیاث الدین بلبن سے براہ راست تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن مؤلف نے اس کے دو قصیدوں کے متعلق پوری شرح و بسط کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا مخاطب غیاث الدین بلبن تھا (ص ۲۰۴) ان میں سے ایک قصیدہ کے دو شعر یہاں درج ہیں:-

شاہ جہانکشائے نصیر الحق آنکہ ہست — چوں من بہ دور دولت ایں شہریار ہند
والا محمد بلبن کز کمند قہر — بر سر کشاں ہند بگہ کارزار ہند

دوسرے قصیدہ میں اس طرح خطاب کیا گیا ہے:

محیط فیض نصیر الحق آنکہ بکشادند — ز گرد سفرۂ اکرامش انس و جاں روزہ
قضا طلیعہ محمد کہ بند نیزۂ او — بجوں خصم کشاد از سر سناں روزہ

مختلف تذکرہ نگاروں کا جو بیان مؤلف نے نقل کیا ہے اس کی روشنی میں شہزادہ محمد پسر سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار سے عمید کا وابستہ رہنا ثابت ہوتا ہے۔ اور دونوں قصیدوں کے جو ابیات درج ہوئے ان سے تذکرہ نگاروں کے بیان کی تصدیق و توثیق ہوتی ہے۔ ایک قصیدہ میں شہزادہ کو نصیر الحق محمد بلبن اور دوسرے میں نصیر الحق محمد کہا گیا ہے۔ شہزادہ محمد، سلطان غیاث الدین کا فرزند اکبر تھا وہ بلند شخصیت کا مالک تھا بلبن نے اسے قاآن ملک کا خطاب دیا تھا، مغلوں سے جنگ کرتا ہوا ۶۸۳ھ میں شہید ہوا۔ اور خان شہید کے لقب سے اس کی یاد باقی رہ گئی۔ پہلے قصیدہ میں محمد بلبن بہ اضافت گویا عربی طریقہ کے مطابق محمد بن بلبن ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ دونوں قصیدے قاآن ملک محمد سے تعلق رکھتے ہیں۔ مؤلف نے محمد بلبن کو بلبن قرار دیا جو صریحاً غلط ہے۔

بلبن کو محمد بلبن کہنے کے متعلق انھوں نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے۔ نصیر الحق کو انھوں نے بلبن کی صفت قرار دی ہے پھر اپنی بے اطمینانی کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے: "مگر تعجب ہوتا ہے کہ شاعر نے بلبن کے لئے غیاث الدین کا لقب کیوں نہیں استعمال کیا" (ص ۲۰۵)

عمید اور سلطان بلبن کے ذیلی عنوان کے ماتحت انھوں نے جو تحقیق پیش فرمائی ہے وہ ایک ہی نقطہ کے گرد دائر و سائر رہتی ہے۔ یعنی ان کی پوری تحقیق اس خاص مسئلہ میں محمد بلبن کی اضافت سے لاعلمی کے گرد گردش کرتی ہے۔ چنانچہ عرفات العاشقین کی عبارت نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

"عرفات العاشقین میں معلوم نہیں قاآن ملک سلطان محمد بلبن ایک ہی ساتھ کیوں لکھ دیا گیا ہے۔ قاآن ملک محمد سلطان تو شہزادہ کا نام تھا اور بلبن اس کا باپ تھا" (ص ۲۰۵)

عرفات العاشقین کے علاوہ ریاض الشعرا اور مجمع الفصحا میں بھی سلطان محمد بلبن بہ اضافت ہی ہے صرف گل رعنا کے مؤلف نے عربی طریقہ کو اختیار کیا ہے۔ فاضل مؤلف کو شاید معلوم ہو کہ فارسی میں ولدیت کی تصریح عربی قاعدہ کے مطابق ضروری نہیں۔ فارسی کے معتبر اور قدیم مصنفین تک عموماً اضافت کے ذریعہ ابنیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مسعود سعد سلمان مشہور شاعر ہے۔ کیا مؤلف کے خیال میں یہ مجموعۂ اسما ایک ہی فرد کا نام ہے اسی طرح فخر مدبر اپنا نام محمد منصور سعید ابوالفرج (الخ) بتاتا ہے تو کیا مؤلف کے نزدیک یہ سلسلۂ دراز تنہا فخر مدبر کا نام ہوگا۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ فارسی کے مستند مصنفین مثلاً بیہقی، نظامی عروضی، منہاج، عوفی اور عطار وغیرہ عربی قاعدہ کے مطابق لفظ ابن کا استعمال کرنے کے بجائے اکثر و بیشتر اسی اضافت سے کام لیتے ہیں۔ عام طور پر بوعلی سینا، محمود سبکتگین لکھتے بولتے ہیں جو غلط نہیں بلکہ قطعاً صحیح طریقۂ تعبیر ہے محمد خان بن عبدالوہاب قزوینی کی تحریروں میں اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

بہرحال محمد بلبن کے متعلق مؤلف کو جس قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے وہ دوبارہ حسن سجزی کے ذکر میں نظر آتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ان کا اصل نام نجم الدین حسن تھا بعض تذکرہ نویسوں نے ان کا نام نجم الدین بن علار سجزی لکھا ہے علاران کے والد بزرگوار کا نام تھا اس لئے انھوں نے شاید والد کے اسم گرامی کی مناسبت ہی سے فوائد الفواد کے دیباچہ میں اپنے کو حسن علار سجزی لکھا ہے۔" (ص ۳۱۹)

اگر مؤلف کو اس اضافت سے واقفیت ہوتی تو یہ سوال پیدا ہی نہ ہوتا کہ حسن سجزی نے دیباچہ میں اپنا نام حسن علار سجزی کیوں لکھا اور حسن بن علار سجزی کیوں نہیں لکھا۔ نیز "مناسبت" کے پردہ میں انھوں نے جو تاویل فرمانے کی کوشش کی ہے اس کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

یہ خفیف سی لغزش اپنے نتائج کے اعتبار سے نہایت سنگین ہے میں جناب مؤلف کو باور کرانا چاہتا ہوں کہ محمد بلبن کے معنی عمید کے قصیدہ میں وہی ہیں جو محمد بن بلبن کے ہو سکتے ہیں۔

مؤلف نے اپنے دعوی کے ثبوت میں ایک اور قرینہ پیش کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

"یہ یقین کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ ستر اسی برس کی عمر میں اس نے ایک نوجوان شہزادہ کے دربار کی ناصیہ سائی کی ہو۔ شہزادہ محمد سلطان کا علمی دربار ملتان میں ۶۷۰ھ سے ۶۸۳ھ تک قایم رہا اگر ۶۷۰ھ سے پہلے عمید اس کے یہاں پہنچا تو بھی اس کی عمر ستر سے زیادہ تھی اس عمر میں ایک نوجوان شہزادہ کی ندیمی بظاہر قابل قبول نہیں معلوم ہوتی۔" (ص ۲۰۶)

اس تحریر کی بنیاد عمید کی تاریخ ولادت پر قایم ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ولادت کی وہی تاریخ صحیح ہے جو Ranking نے نکالی ہے اور جس پر مؤلف کو اصرار ہے تو بھی اس کہن سالگی میں عمید کا ایک نوجوان شہزادہ کے دربار سے جو علم و ادب کا زبردست سرپرست سمجھا جاتا تھا، وابستہ ہونا قابل قبول کیوں نہیں ہو سکتا حالانکہ اسی نوجوان شہزادہ کے متعلق مؤلف کا بیان ہے کہ اس نے سعدی شیرازی کو ان کے عہدِ پیری میں ملتان تشریف لانے کی دعوت بہ اصرار دی تھی (ص ۲۵۴)، وہ تو شیراز سے ملتان کی بعید مسافت تھی کہ پیری آڑے آئی ورنہ کیا عجب تھا کہ کہن سال سعدی کو بھی

اس نوجوان کا دربارِ علم وادب ملتان کھینچ لاتا۔ اس کے علاوہ سلطان غیاث الدین بلبن کے حضور میں شعراء کی وہ قدر و منزلت کہاں تھی جو ان کو قاآن ملک محمد کے دربار میں میسر آسکتی تھی۔ خود مؤلف کے الفاظ ہیں:

"بلبن کو علماء و مشائخ سے کچھ ایسی دلچسپی رہی کہ وہ شعراء کی طرف مائل نہ ہو سکا۔۔۔۔۔۔ وہ ذوق شعری سے کچھ ایسا عاری تھا کہ علماء کی طرح شعراء اس کے دربار میں رسوخ حاصل نہ کر سکے مگر اس زمانہ کے شعراء کو بلبن کے شہزادوں اور امراء کے درباروں میں ایسا ملجا و ماویٰ مل گیا تھا کہ ان کو بلبن کے عدمِ التفات کا احساس مطلق نہ ہوا۔" (ص ۲۴۴ - ۲۴۵)

مؤلف کی تحقیق میں جب بلبن کا یہ حال تھا تو اس کے بعد قاآن ملک محمد کے دربار سے عمید کا وابستہ ہونا خود بخود یقین کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔ گو کہ شاعر کی زندگی اس وقت ستراسی کے لگ بھگ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کی صحیح تاریخ ولادت معلوم کر لینے کے بعد تو مُعَمَّر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (باقی)

العلم والعلماء

یہ جلیل القدر امامِ حدیث علامہ ابن عبد البر کی شہرۂ آفاق کتاب "جامع بیان العلم و فضلہ" کا نہایت صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے۔ مترجم کتاب مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی اس دور کے بے مثال ادیب اور مترجم سمجھے جاتے ہیں موصوف نے یہ ترجمہ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا جو اب ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے۔ علم اور فضیلتِ علم کے بیان، اہلِ علم کی عظمت اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی، اس متبرک کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے، ایک زبردست محدث کی کتاب اور ملیح آبادی صاحب کا ترجمہ موعظتوں اور نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک دفعہ ضرور پڑھیے۔ صفحات ۳۰۰، بڑی تقطیع۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ مجلد پانچ روپے آٹھ آنے۔

"نورس" کا ایک اور نسخہ

از

(جناب سید نصیر الدین ہاشمی ممتاز منشن روڈ مکڑی کاپل (حیدرآباد دکن)

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اپنی کتاب "تحقیقی مطالعے" میں جو مضمون، کتاب نورس کے مخطوطات کے متعلق درج فرمایا ہے، اس میں "نورس" کے حسب ذیل نو نسخوں کی صراحت فرمائی ہے،

(۱) کتب خانہ دفتر دیوانی ومال (سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد)	ایک نسخہ
(۲) نواب سالار جنگ میوزیم حیدرآباد	تین نسخے
(۳) کتب خانہ پروفیسر حسین علی خاں (حیدرآباد)	ایک نسخہ
(۴) حیدرآباد میوزیم	ایک نسخہ
(۵) پرنس آف ویلز میوزیم بمبئی	ایک نسخہ
(۶) رضا لائبریری رام پور	ایک نسخہ
(۷) کتب خانہ خدا بخش خاں پٹنہ	ایک نسخہ
	جملہ (۹)

ڈاکٹر صاحب نے سالار جنگ میوزیم کے صرف تین نسخوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب کو کتب خانہ سالار جنگ کے نسخہ کا علم نہیں ہوا، کیوں کہ میوزیم کے علاوہ کتب خانہ میں بھی ایک نسخہ موجود ہے، اس طرح سالار جنگ میوزیم و کتب خانہ میں چار نسخے ہیں۔

چوں کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں اس کا تذکرہ نہیں ہے اس لئے یہاں ہم اس کی کسی

قدر صراحت درج کرتے ہیں، امید ہے کہ ارباب علم کی دل چسپی کا موجب ہوگا، یہ نسخہ کتب خانہ میں (۹۹ لم) نمبر پر موجود ہے اس کا سائز (۹×۵ ½) انچ ہے، (۵۲) صفحے ہیں اور ہر صفحہ میں (۹) سطریں نسخے میں لکھا ہوا ہے۔ مسطلا و مذہب ہے۔

آغاز

ام جات محمد کے پر چھیا ئیں پروردگار چھائیں کوں چھائیں تین یو بوجھی ستیار

دوہرا

بہو تیری جا د چھائیں ہوں مگر محمد روپ ہرار سب ہور کی بیار چھوڑ کو روپ اچھیں اد ر
...... جائیں سو سید کی باتیں کیا کرار ایک توں چھائیں ہو، تو ہی گر د ہووے بہار

اس نسخے کی کتابت اس طرح ہوتی ہے کہ ایک شعر کے ختم پر دوسرا مصرع اور شعر شروع کر دیا گیا ہے کوئی فصل درمیان میں نہیں ہے۔ اس سے راگوں اور راگیوں کی تعداد بلا خاص کوشش کے نہیں معلوم ہو سکتی۔ اور مجھے اس کی فرصت نہیں اس لئے ان کی تعداد ظاہر نہیں کی جا سکتی۔

اختتام

بھولی دس دھر رہی بیری یہاں بیتی پرتھم سبر بہات کی ستری بیاد
مانو ردھی اردھے ساس نورس کو یاری یادی سمی ہست ارکن پر دیکھ دبی
تم آچھی جب مورکینی دیجہ دینوی سکھ سگل دیوتا کہیں بھر آہن

سر سیتی پرسن بھیئ ابراہیم کنہ لبس
اوک ادکائیں دین دین

خاتمہ

"نورس کتاب تصنیف عالم پناہ سکندر جاہ سلیمان مکان، ظل سبحانی بکرم اللہ تعالیٰ، در شہر اعظم نورس پور، نوشتہ کمترین شاگرد سلیمان کہ در ملک الیشان یافت امان، من

نمانم این بماند در جہاں "

.. اس عبارت سے واضح ہے کہ اس نسخہ کا کاتب سلیمان ہے اور ابراہیم عادل شاہ کی زندگی میں لکھا گیا ہے، اگرچہ سنہ کتابت درج نہیں ہے، مگر خاتمہ کی اس عبارت سے واضح ہے کہ یہ نسخہ بھی شاہی کاتب کا لکھا ہوا ہے۔

امید ہے کہ اس صراحت سے اس نسخہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ادبیات

حریم نیم شبی

از

حضرت روش صدیقی

جدید ہندوستان میں حضرت روش صدیقی کا مقام ایک جانا پہچانا مقام ہے، موصوف ہمارے ملک کے بلند پایہ اور پاک باز و پاک نہاد ادیب و شاعر ہیں، "حریم نیم شبی" ان کے کمال کا قابل دید و شنید نمونہ ہے، روحانیت کے جذبۂ صادق میں ڈوبی ہوئی اس نظم کا ایک ایک بند پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، اس میں سورۂ مُزّمّل شریف کے مضامینِ عالیہ کا دل پذیر اور جامع خلاصہ نہایت سادہ اور اثر انگیز اسلوب میں انتہائی احتیاط اور دیدہ وری سے پیش کیا گیا ہے۔

"برہان"

(۱)

اے صاحبِ گلیم و ردا! اے مرے خلیل
یہ رات رات بھر تری بیداریِ طویل
تا صبح یہ قیام و عبادت، بجا، — مگر
آرام و خواب کا بھی کوئی وقتِ مختصر
بس ہے قیامِ نیم شب، اہلِ نیاز کا
یہ وقت ہے خشوع و خضوعِ نماز کا
کچھ کم ہو یا سوا تو سزاوارِ حال ہے
شایانِ حال، حسن رہِ اعتدال ہے

(۲)

شب کے لئے تلاوتِ قرآں ہے زندگی
بے ذکر و فکر خوابِ پریشاں ہے زندگی
طے اس طرح قیام کی راہِ دراز ہو
روشن کلامِ حق سے شبستانِ راز ہو
آراستہ ہو، خلوتِ قلبِ سلیم اب
نزدیک ہے تجلیِ امرِ عظیم اب

شب زندہ داریوں سے نکھرتی ہے زندگی بیداریِ یقیں سے سنورتی ہے زندگی
دشوار تر ہے سہل نہیں ہے قیامِ شب لیکن، فروغِ دانش ودیں ہے قیامِ شب

(۳)

دن بھر طویل شغلِ ھدایت ہے یا نبی شب کا سکوت حسنِ عبادت ہے یا نبی
مشغولِ ذکر حق ہو، کمالِ رضا کے ساتھ یادِ خدا ہو خدمتِ خلق خدا کے ساتھ
رازآشنائے ترک وطلب ہو نفس نفس سب سے جدا ہو، واصلِ رب ہو نفس نفس
ہر سانس سے فروغِ حیات دوام لے پروردگارِ مشرق ومغرب کا نام لے
کوئی نہیں ہے اس کے سوا خالقِ حیات وہ خالقِ حیات خداوندِ کائنات
آہنگِ روز وشب کا تسلسل اسی سے ہے شایانِ ہر مقام، توکل اسی سے ہے
وہ کارساز، ارض وسما کا وکیل ہے کیا ذکرِ شرق وغرب وہ سب کا کفیل ہے

(۴)

یہ گم نگاہ، تجھ سے جو غافل ہیں اے حبیب کب تیری بزمِ قدس کے قابل ہیں اے حبیب
کرتے ہیں تذکرہ ترا، وہم وجنوں کے ساتھ ہاں، اِن سے دور، عظمتِ صبر وسکوں کے ساتھ
ضد جاہلوں کو ہر سخنِ دل نشیں سے ہے اندیشۂ جنوں ترے عزم ویقیں سے ہے
ان کا ذہینِ عصر کا انجام ہے قریب پاداش اہلِ غفلت وآرام ہے قریب
اک مہلتِ قلیل ہے ان کے لئے ہنوز کچھ وقتِ قال وقیل ہے ان کے لئے ہنوز
پھر یہ ہیں اور حلقۂ نارِ جحیم ہے صد شعلہ درگلو وہ عذابِ الیم ہے
اُس دن زمیں کو زلزلہ آثار دیکھنا دشت وجبل کو ریت کا انبار دیکھنا

(۵)

بھیجا ہے ہم نے تم میں وہ پیغمبرِ انام شاہد ہے نیک وبد کا جو لاریب ولاکلام
جس طرح بہرِ مقصدِ تبلیغ ورہبری بھیجا تھا ہم نے جانبِ فرعون اک نبی

فرعون سرکشی سے نہ ایمان لا سکا نادان، گرفتِ حق سے نہ خود کو بچا سکا
تم بھی بھٹک گئے جو طریقِ صواب سے کیا بچ سکو گے سختیِ روزِ حساب سے

(۶)

وہ دن، وہ یومِ ہیبت و قہاری و جلال بچے ہیں جس کے خوف سے پیرِ شکستہ حال
پھٹ جائے گا خشیت و دہشت سے آسماں ہو کر رہے گا وعدۂ حق، برملا عیاں

(۷)

ہے پند راست، حرف و حکایت نہیں یہاں اے اہلِ راہ! گوشۂ فرصت نہیں یہاں
جو چاہے، آئے منزلِ محمود کی طرف راہیں کھلی ہیں کعبۂ مقصود کی طرف

(۸)

اے صاحبِ کلیم! ترا رب ہے باخبر یہ ذکر، یہ قیام ترا، رات رات بھر
باصد خشوع، تیرے رفیقانِ خاص بھی شب زندہ دارِ ذکر ہیں یا ایہا النبیؐ
تا نیم شب کبھی، کبھی دو ثلث رات تک اذکار اور نماز سے کرتے ہیں دل خنک
تا ثلثِ شب بھی ذوقِ سجود و قیام ہے بے شک یہ فائزینِ یقیں کا مقام ہے
ہے سخت تر، یہ طاعتِ جاں روز یا نبیؐ اللہ ہے علیمِ شب و روز، یا نبیؐ

تم میں سے کچھ مریض بھی کچھ ناتواں بھی ہیں کچھ از پئے معاش و تجارت رواں بھی ہیں
جن کو جہاں میں فضلِ خدا کی تلاش ہے حسنِ مآلِ فقر و غنا کی تلاش ہے
کچھ غازیانِ جادۂ دینِ خدا بھی ہیں کچھ طالبانِ مکتبِ صدق و صفا بھی ہیں
اس پر بھی ذوق و شوق کا یہ اہتمام ہے پاؤں پہ ہے ورم کہ سحر تک قیام ہے
کچھ حد بھی اس قیام کی ذکرِ شدید کی رحمت ہو تم پہ ربِ غنی و حمید کی
اس شانِ بندگی کا ہی اعتراف ہے امت کو اب نمازِ تہجد معاف ہے
کچھ دیر تک تلاوتِ قرآں سے، رات کو روشن کرو، حریمِ شعورِ حیات کو

کچھ دیر تک یہ خلوتِ ذکر و قیام بھی — بیداریٔ حیات کا کچھ اہتمام بھی

ہاں، ہر نمازِ فرض کرو، وقت پر ادا — حسنِ حضورِ قلب ہو سجدوں میں رونما

سرچشمۂ لطافت و عفت نماز ہے — معراج ذوق و شوق کی صورت نماز ہے

دیتے رہو زکوٰۃ، کہ ہے زادِ آخری — موقوف ہے زکوٰۃ پہ دل کی تونگری

قرضِ حسن، رضائے خدا میں، غنا یہ ہے — سب کچھ خدا کا، مسلکِ اہلِ وفا یہ ہے

"قرضِ حسن" ہے خدمتِ خلقِ خدا کا نام — بے لوث فیض و بخشش و جود و سخا کا نام

ان کی مدد قریب جو سب اقربا میں ہوں — ان کی مدد حبیب جو اہلِ صفا میں ہوں

اُن کی مدد جو دین میں "خیر العباد" ہوں — ان کی مدد جو عازمِ راہِ جہاد ہوں

ان کی مدد جو اہل "ہم المتقون" ہوں — ان کی مدد جو صبر و رضا کا ستون ہوں

اُن کی مدد شغف ہے جنھیں علمِ دیں کے ساتھ — ان کی مدد رواں ہیں جو شمعِ یقیں کے ساتھ

چشمِ کرم، مدام یتیم و اسیر پر — شفقت شکستہ دل پہ نوازش فقیر پر

لطف و عطا، بہ حالِ مساکین و بے نوا — جودِ تمام از پئے خوشنودیٔ خدا

ان کی مدد جو تنگ و زبوں ہوں، علیل ہوں — ان کی مدد جو شاملِ "ابن السبیل" ہوں

ان کی مدد، حزیں ہوں جو حالِ سقیم سے — مجبور ہوں جو قرض کے بارِ عظیم سے

ان کی مدد جو خود ہی سراپا سوال ہوں — ان کی مدد جو قیدیٔ حزن و ملال ہوں

مشکوٰۃ جلوہ گاہ زمین و زمن یہ ہے — یک لمعۂ تجلیٔ قرضِ حسن یہ ہے

بھیجو گے عاقبت کے لئے تم جو نیکیاں — پاؤ گے ان کو پیشِ خداوندِ دوجہاں

ہر کارِ خیر، صورتِ خیرِ کثیر سے — ہوگا قبول، فضلِ خدائے قدیر سے

دور از شمار رحمتِ ربِ کریم ہے — حسنِ عمل کو مژدۂ اجرِ عظیم ہے

لازم ہے ہر نفس، طلبِ بخشش و نجات — لا انتہا ہے فضلِ خداوندِ کائنات

جنت بھی ایک رشحۂ فیضانِ عام ہے — ہر ذرہ، زیرِ دامنِ لطفِ تمام ہے

جس سر خوشی کا نام بہشتِ نعیم ہے — خوشنودیٔ خدائے غفور رحیم ہے

شئون علمیہ

فضائی سفر طبی نقطۂ نظر سے

فضائی سفر اب احاطۂ امکان میں آگیا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ بیرونی فضا کا یہ سفر جوہری طاقت سے چلنے والی سپیچ گاڑی میں مسافر کا آخری سفر ہو۔ اس مسئلہ پر طبی تحقیقات عرصے سے جاری ہے۔ چنانچہ امریکہ میں انجمن طب فضائی (اسپیس میڈیسن ایسوسی ایشن آف امریکہ) عرصہ پانچ سال سے قائم ہے اور برطانوی بین نجمی انجمن (برٹش انٹر پلینیٹری سوسائٹی) نے بھی کافی تحقیق کی ہے۔

اس سارے کام کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ جسمِ انسانی پر لاکھوں برس گزرے ہیں جب جا کر وہ اس قابل ہوا ہے کہ زمینی ماحول سے مطابقت پیدا کر سکے۔

سب سے پہلی دقّت جس سے فضائی مسافر کو سابقہ پڑے گا وہ زمین سے پیچھا چھڑانا ہے۔ زمین کی کوشش پر غالب آنے کے لئے راکٹ جہاز کو زبردست رفتار سے اٹھنا پڑے گا۔ مسافر بغیر پناہ کے ہوگا تو اس کا چہرہ بیٹھ جائے گا کیوں کہ خون سر سے اسفل کی طرف چلا جائے گا۔ اس لئے اس کا زیریں حصّہ خون سے بھر کر آماس کر آئے گا۔ تاریکی سی چھا جائے گی اور پھر موت!

لیکن اگر مسافر کی صحت بہترین ہو اور وہ دباؤ دار سوٹ پہنے ہو تاکہ خون کی حرکت رک سکے اور وہ ربڑ کے گدّے پر لیٹا ہو تو شاید جہاز کے اٹھنے کی زبردست رفتار پر قائم رہ سکے۔

بیرونی فضا میں پہنچ جانے پر مسافر کو فوراً بدلے ہوئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنا پڑے گی۔ اور وہ ایک بے کشش خلا میں تیرتا پھرے گا۔ اس سے سمت اور توازن کا احساس جاتا رہے گا اس کو "اوپر" اور "نیچے" میں تمیز باقی نہ رہے گی۔

زمین پر مسافر ان حالات کی پیش بندی نہیں کر سکتا کیوں کہ یہاں مقام زمین کی کشش سے آزاد نہیں ہے۔ راکٹ کے اندر یا دباؤ دار سوٹ میں گردش نمائی ضابط لگا کر اور پیروں میں

مقناطیسی جوتے پہن کر شاید مسافر میں احساس سمت کو قائم رکھا جا سکے۔

مزید برآں جسم انسانی پر کونی (شعاعوں کا سمک ریز) کلے اثر کی پیش قیاسی نہیں کی جا سکتی بیرونی فضا میں یہ شعاعیں بلند توانائی والے ذرات کے دھارے میں جن کی رفتاریں بہت زبردست ہوتی ہیں۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ جوہری بم کی طرح یہ شعاعیں انسان کو عقیم کر دیں۔ علاوہ ازیں سماویے اور ذرات غبار فضا میں مہیب رفتاروں سے پھرتے رہتے ہیں۔

اگر یہ فضائی جہاز میں نفوذ کر جائیں تو اندر کے ہوائی دباؤ کو بدل دیں گی اور سارے مسافر خطرے میں آ جائیں گے۔ اس سے بچنے کے لئے ۲ تا ۱۰ انچ موٹی فولاد کی تہہ چڑھانی پڑے گی۔

راکٹ کے لئے اس بار کا اٹھانا مشکل ہوگا۔ بس لازمی ہے کہ فضائی جہاز ایسا بنایا جائے کہ وہ مسافرین کو ان آفاتِ سماوی سے محفوظ رکھ سکے۔ اس کو ایسا ہونا چاہیئے کہ ۱۵ پونڈ فی مربع انچ کے اندرون دباؤ کو برداشت کر سکے۔ پھر ہوا جو اندر ہوگی اس کو سانس لینے کے قابل بھی بنائے رکھنا ہوگا۔

سوٹ ایسا ہو کہ پسینہ جذب کر لے اور پہننے والے کو یکساں تپش (ٹمپریچر) پر قائم رکھ سکے، سورج جو ایک طرف سے نکلے گا تو ایسی تپش پیدا کرے گا جو یہاں زمین پر ممکن نہیں۔

اب مسافر کی جو منزل ہے وہاں اگر ہوا ایسی ہے کہ انسانی زندگی کو قائم رکھ سکتی ہے تو خبردار مسافر کو اپنے ساتھ آکسیجن کا آلہ رکھنا ہوگا اور وہ بھی ہر وقت۔ سوائے اس کے کہ وہ کھانا کھائے یا ایک خاص سیل بند گنبد کے مصنوعی ہوا میں سونے کے لئے چلا جائے۔ اس میں شبہ ہے کہ وہ معمولی دبی ہوئی ہوا کو کام میں لا سکے گا کیوں کہ اس میں نائٹروجن شامل رہتی ہے جس میں سانس نہیں لی جا سکتی۔ اس سے وزن خواہ مخواہ بڑھ جائے گا۔

خالص آکسیجن میں عرصہ تک سانس لی جائے تو ایک سمیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بس کمی سے ہوا کے سیارے پر مسافر کا قیام ان علامات کے ظاہر ہونے تک ہی رہ سکتا ہے۔

فضائی مسافر کی راہ میں زبردست دقتیں اور مشکلیں حائل ہیں لیکن توقع کی جاتی ہے کہ ان سب پر غلبہ پا لیا جائے گا۔

تبصرے

معین العارفین از جناب محمد خادم حسن صاحب زبیری تقطیع کلاں ضخامت ۱۷۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت غیر مجلد عہ/ پتہ:۔ شعبۂ تبلیغ و اشاعت دفتر درگاہ خواجہ صاحب اجمیر۔

حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی رحمۃ اللہ علیہ شہرت اور مرجع عوام وخواص ہونے کے اعتبار سے ہندوستان کے سب سے بڑے ولی اللہ اور بزرگ ہیں۔ ہر سال لاکھوں انسان اختلافِ مشرب و عقائد بلکہ اختلافِ مذہب و مسلک کے باوجود آپ کی درگاہ کی زیارت سے شرف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بڑے افسوس کی بات تھی کہ اب تک آپ کا کوئی مستند اور محققانہ تذکرہ نہیں لکھا گیا تھا۔ جناب محمد خادم حسن صاحب زبیری مبارکباد کے لائق ہیں کہ آپ نے معین العارفین کے نام سے ایک ایسا تذکرہ لکھ کر اس ضرورت کو پورا کرنے کی طرف سب سے پہلے توجہ کی۔ چنانچہ اس کتاب میں موصوف نے حضرت خواجہ کے حالات و سوانح ممکن الحصول مآخذ کی روشنی میں سنہ وار مرتب کئے ہیں اور مختلف فیہ مسائل پر محققانہ اور بصیرت افروز کلام کیا ہے، صوفیائے کرام کے تذکرے عموماً ان کی کرامات اور خوارق عادات کا رناموں سے پُر ہوتے ہیں جن کا مقصد ان کو مافوق الانسان کی حیثیت سے پیش کرنا ہوتا ہے لیکن اس کتاب کا اسلوب ایسا نہیں بلکہ مورخانہ ہے اور لائق مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے بہت سنبھل کر اور کافی مطالعہ اور غور وخوض کے بعد لکھا ہے تاہم بعض جگہ تعبیر نامناسب ہوگئی ہے مثلاً صہ پر یہ عبارت کہ "آپ کا (حضرت خواجہ کا) مقصد اولین ہندوستان میں لوگوں کو مسلمان بنانا نہ تھا بلکہ انسان اور کامل انسان بنانا تھا" پھر اسی صفحہ پر

آگے چل کر "آپ مذہبی تعصبات کی تنگ نظری سے گذر کر ایک ایسے مقام پر تھے جہاں آپ کو ہر خدارسی کا ذریعہ پسندیدہ تھا۔"

نزولِ قرآن اور بعثتِ محمدی کے بعد خدارسی کا ذریعہ سوائے اسلام کے اور کوئی دوسرا نہیں ہے اور اسی طرح تکمیلِ انسانیت کا راستہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے ہر مسلمان کے لئے یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔ پھر حضرت خواجہ تو کوئی معمولی درجہ کے مسلمان نہیں تھے اس بنا پر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ انسان کامل ہونے کے لئے مسلمان ہونے کو ضروری نہ سمجھیں اور اسلام کے علاوہ دوسرے طریقوں کو بھی خدارسی کا ذریعہ مانیں۔ البتہ ہاں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین تھے اسی طرح حضرت خواجہ بھی بارگاہِ نبوت سے اختصاصِ معنوی و قُربِ روحانی رکھنے کے باعث سب انسانوں کے لئے بلا تفریق ملت و مذہب سرچشمۂ فیض و برکت تھے اور آپ سے جو شخص بھی عقیدت رکھتا اور قریب ہوتا تھا بقدر حوصلہ و استعداد کچھ نہ کچھ حاصل کر ہی لیتا تھا۔ انسانی محبت۔ خلقِ خدا پر شفقت۔ ہر شخص کو فائدہ پہنچانے اور اس کی خدمت کرنے کا جذبہ رکھنا عین اسلام کی تعلیم ہے اور حضرت خواجہ کا مرتبہ بلاشبہ اس میں بہت بلند تھا لیکن یہ اور چیز ہے اور اسلام کے سوا دوسرے ذرائع کو بھی خدارسی کا ذریعہ ماننا اور اس کو پسند کرنا یہ اور چیز ہے اور ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ حضرت خواجہ کی طرح جو مسلمان بھی لِیُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ اور "اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ" پر ایمان رکھتا ہے اس کا یقین رکھتا ہے کہ خدارسی کے لئے اسلام کے علاوہ تمام راہیں کعبہ کی نہیں ترکستان کی راہیں ہیں۔ کتاب چھ حصوں پر تقسیم ہے۔ حصہ اول میں حضرت خواجہ کے سوانح، دوم میں سیرت و اخلاق، سوم میں درگاہ میں بڑے بڑے لوگوں کی حاضری کا تذکرہ۔ چہارم میں عمارتوں اور مراسمِ درگاہ کا بیان۔ پنجم میں روحانی تصرفات اور کرامات کا ذکر ہے اور آخری حصہ ششم میں اجمیر کی تاریخ۔ اور اس کی عمارتوں اور باغات وغیرہ کا بیان ہے غرض کہ روحانی لطائف و

مزایا اور تاریخی معلومات دونوں کے لحاظ سے کتاب دل چسپ بھی ہے اور مفید بھی۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے شاد کام و محظوظ ہوں گے۔

شروانی نامہ | از جناب حاجی عباس خاں صاحب شروانی تقطیع کلاں ضخامت ۸۴۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ؎ ، پتہ :- دفتر اخبار جمہور۔ محمد علی روڈ علی گڈھ

شروانی خاندان ہندوستان کا مشہور خاندان ہے اور خصوصاً اس کی شاخ علی گڈھ کے بعض افراد کی وجہ سے تو شہرت کے ساتھ اس کو ایک خاص عظمت بھی حاصل ہے اس خاندان کے مورث اعلیٰ عمر خاں افغانستان کے ایک قصبہ شروان کے رہنے والے تھے سلطان بہلول لودی کے ساتھ ہندوستان آئے اور وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز رہے اس کے بعد اس خاندان کے افراد مختلف شاخوں میں بٹ گئے اور ملک کے مختلف حصوں میں آباد ہو گئے ، تموّل کے ساتھ ایک خاص قسم کی وضع داری ، دین داری اور شریفانہ اخلاق و اطوار اس خاندان کے خاص اوصاف رہے ہیں اس کتاب کا موضوع اگرچہ اسی خاندان کے لوگوں کے حالات از سلف تا خلف اور ان کے شجرات وغیرہ کا بیان کرنا ہے تاہم اس ذیل میں بہلول لودی سے لے کر اب تک کے بعض اہم تاریخی حالات عموماً اور تاریخ علی گڈھ کا خصوصاً مستند مآخذ کی روشنی میں ذکر آگیا ہے۔ کتاب تین حصوں پر تقسیم ہے۔ حصہ اول میں شروانیان سلف۔ حصہ دوم میں شروانیان حال۔ اور حصہ سوم میں شجرات کا بیان ہے۔ یہ کتاب اس خاندان کے مردوں اور عورتوں کے لئے تو ایک نہایت قیمتی گنجینۂ معلومات ہے ہی۔ عام تاریخ کا طالب علم بھی اس سے بہت کچھ استفادہ کر سکتا ہے۔ شروع میں مولوی ریاض الرحمن خاں صاحب ایم۔ اے کا پیش لفظ اور خود لائق مرتب کتاب کا مقدمہ بھی دل چسپ اور مفید ہے

بوئے دوست | از جناب ندیم مرادآبادی تقطیع خورد ضخامت ۵۰ صفحات طباعت وکتابت بہتر۔ کاغذ معمولی قیمت ۸؍ پتہ :- ضمیر حسن صاحب سرائے کشن لال

محلہ پیر غیب مراد آباد۔

جناب ندیم مراد آبادی آج کل کے شاعروں کی دنیا میں زیادہ مشہور نہیں ہیں۔ لیکن اُن کے کلام کا یہ مجموعہ جو اکثر و بیشتر ان کی غزلیات پر ہی مشتمل ہے اس بات کا شاہدِ عدل ہے کہ وہ فطری شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں نفسیاتِ حسن و عشق کا ایک نہایت لطیف اور پاکیزہ شعور۔ حسنِ تخیل۔ قدرتِ بیان۔ جدتِ ادا اور سادگی و پُرکاری یہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں زبان بھی دھلی اور سلجھی ہوئی ہے۔ اس حسنِ تغزل کے باوجود ندیم کا مشاعروں کی دنیا سے الگ رہنا اس کا ثبوت ہے کہ وہ صرف شاعر نہیں بلکہ فن کے صحیح معنی میں قدرداں بھی ہیں۔

البلاغ انجمن خدام النبی بمبئی کا دینی اور اصلاحی ماہنامہ ہے اس نے گذشتہ ماہ جنوری میں دینی تعلیمی کنونشن منعقدہ بمبئی کی تقریب سے اپنا ایک خاص نمبر تعلیمی نمبر کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ کہنے کو ایک ماہانہ رسالہ کا خاص نمبر ہے لیکن درحقیقت ہندوستان کے مدارسِ عربیہ اور یہاں کی عربی و دینی تعلیم پر اچھی خاصی ایک انسائیکلو پیڈیا ہے ملک کا کوئی مشہور اور غیر مشہور چھوٹا یا بڑا مدرسہ ایسا نہیں ہے جس کا تذکرہ اور جس کی تاریخ اور خدمات پر کوئی مضمون اس میں موجود نہ ہو۔ مشہور اور نامور درسگاہوں کے جگہ جگہ فوٹو بھی ہیں اور ان درسگاہوں اور اداروں کے بعض ممتاز حضرات کے تذکرے بھی ہیں ان کے علاوہ بعض علمی مضامین مثلاً "مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم اور علماء اور "استشراق اور مستشرقین" از قاضی محمد اطہر مبارک پوری۔ "مسلمانوں کی علمی فتوحات" از مولانا حامد الانصاری۔ "دینی علوم کی عظمت و فضیلت" از حافظ محمد صدیق میمنی بھی مفید اور معلومات افزا ہیں۔ شروع میں اکابر جمعیۃ علمائے ہند اور بعض دوسرے حضرات نے مسلمانوں کی دینی تعلیم کی اہمیت و ضرورت اور اس سلسلہ میں بعض تجاویز اور مشوروں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ادارہ البلاغ لائق مبارک باد ہے کہ اس نے مدارسِ

عربیہ اور دینی تعلیم پر اس قدر ضخیم نمبر شائع کر کے ملت اسلامیہ ہند کے ان جگر پاروں کو بڑی عمدگی اور خوش سلیقگی کے ساتھ نہ صرف یہ کہ انھیں تاریخ میں محفوظ کر دیا ہے۔ بلکہ انھیں خود ایک مستقل تاریخ بنا دیا ہے۔ فجزاھم اللہ۔

تاریخ مشائخ چشت

یہ سلسلۂ چشت کے صوفیائے کرام اور مشائخ عظام کی نہایت مستند اور محققانہ تاریخ ہے جسے "پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی" استاذ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، رفیق ندوۃ المصنفین نے بڑی تلاش اور تحقیق کے بعد مرتب کیا ہے، اُردو زبان میں صوفیہ کا یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں امت کے ان پیشواؤں کے مقصدِ حیات نظامِ اصلاح و تربیت اور اندازِ تبلیغ و اشاعت پر نہایت مدلل اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ صرف مقدمہ ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے جو ہر اعتبار سے تلاش و تحقیق کا شاہ کار ہے۔

سلسلہ کا نشو و نما سمجھانے کے لئے ہندوستان کا ایک نقشہ بھی شامل کیا گیا ہے جس میں سلسلہ کے تمام بڑے مرکزوں کو بتایا گیا ہے اسی کے ساتھ شجرات بھی درج کئے گئے ہیں مقدمہ کے بعد چشتیہ نظامیہ سلسلہ کی نشاۃ ثانیہ کے مندرجہ ذیل بزرگوں کے تفصیلی حالات ۱۲ ابوابوں میں درج ہیں حالات سے پہلے ایک باب میں اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی حالت کا جائزہ لیا گیا ہے

(۱) حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ (۲) حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ (۳) حضرت شاہ فخرالدین دہلویؒ

(۴) حضرت شاہ نورالدین مہارویؒ (۵) حضرت شاہ نیاز احمد بریلویؒ (۶) حضرت خواجہ محمد عاقلؒ

(۷) حضرت حافظ محمد جمال ملتانیؒ (۸) حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ (۹) حضرت حافظ محمد علی خیرآبادیؒ

(۱۰) حضرت حاجی نجم الدین سیتھاویؒ (۱۱) حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ (۱۲) حضرت شاہ اللہ بخش تونسویؒ

کتاب ہر حیثیت سے لائق مطالعہ ہے اس کی اشاعت سے ہندوستان کے مشایخ چشت کے حالات کی تحقیق کا ایک نیا باب کھل گیا ہے صفحات ۸۱۸ بڑی تقطیع کتابت طباعت کاغذ نہایت اعلیٰ قسم، غیر مجلد ۱۲ مجلد ۱۴

بُرہان

جلد ۳۵ شمارہ نمبر ۲

اگست ۱۹۵۵ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے ہماری بزم علم و عمل اور شبستان فضل و کمال کی ایک اور شمع گل ہو گئی، یعنی مولانا عبد الحق صاحب مدنی نے کم و بیش بہتر ۷۲ سال کی عمر میں ۲۱ر جولائی ۱۹۵۵ء کو بمقام دیوبند وفات پائی۔ مولانا مرحوم کا آبائی وطن دیوبند ہی تھا۔ لیکن آپ کے والد ماجد جو اپنے زمانہ کے نامور ڈاکٹر تھے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں جا بسے اور دولتِ عثمانیہ میں کسی اچھے عہدہ پر متمکن ہو گئے تھے مولانا کی پیدائش وہیں ہوئی، اسی نسبت سے مدنی کہلاتے تھے۔ اگرچہ نسلاً ہندوستانی تھے لیکن سرزمینِ قدس میں پیدا ہونے اور وہیں تعلیم و تربیت پانے کی وجہ سے شکل و صورت، وضع قطع، اخلاق و عادات، طور طریق اور امیال و عواطف ان سب اعتبارات سے مرحوم خالصتاً اعلیٰ درجہ کے عرب تھے۔ اردو بھی صاف اور شستہ بولتے تھے لیکن عربی زبان پر جو قدرت تھی وہ اُردو پر نہ تھی۔ عربی صرف بولتے ہی نہ تھے بلکہ اس زبان کے بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے۔ ان کے اشعار میں بلا کی بے ساختگی اور طرفگی ہوتی تھی، اشعار فی البدیہہ کہنے کا بھی بڑا ملکہ تھا پھر جس درجہ کے سخن سنج تھے اُسی مرتبہ کے سخن فہم بھی تھے۔ تنقید کا ذوق نہایت بلند اور شُستہ تھا۔ حجاز کے موجودہ نامور شعراء میں ایک خاصی تعداد مولانا مرحوم کے شاگردوں کی ہے۔

لیکن جیسا کہ مولانا خود فرمایا کرتے تھے۔ شعر و ادب کے ساتھ ان کا اشتغال زیادہ تر عہدِ شباب میں ہی رہا جس میں بڑا دخل مدینہ طیبہ کی خاص ادبی صحبتوں اور مجلسوں کا بھی تھا۔ بعد میں قرآن و حدیث کا درس و تدریس اور الخصیص میں انہماک و توغل آپ کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین بن گیا۔ علی الخصوص قرآن مجید کے ساتھ تو عشق تھا۔ اس کے وہ حافظ بھی تھے اور قاری بھی! آواز میں بڑا درد اور حد درجہ سوز و گداز تھا۔ راقم الحروف کو یاد نہیں آتا کہ مولانا کی امامت میں کبھی جہری نماز پڑھی ہو اور آنکھیں پرنم اور دل پُر سوز نہ ہو گیا ہو۔ اللہ تے

عجیب لحن داؤدی عطا فرمایا تھا۔ حجاز سے کراچی آگئے تھے۔ چند سال وہاں رہے اور اس کے بعد مراد آباد کے پرانے مدرسہ شاہی میں چلے آئے۔ یہاں مولانا نے درس و تدریس کا کام بھی کیا اور اہتمام کا فرض بھی انجام دیا۔ گذشتہ چند برسوں سے کہنا چاہیے مدرسہ صرف مولانا کے ہی ہمت وسعی اور اثر و رسوخ سے چل رہا تھا۔ مدرسہ سے تعلق کے علاوہ شہر میں قرآن مجید کا درس بھی بڑی پابندی سے دیتے تھے جس سے اہلِ شہر کو بڑا فیض تھا

اخلاق و عادات کے لحاظ سے مولانا جس بلند کردار کے انسان تھے شاید ان جیسے لوگ کم ہوں گے۔ حد درجہ خلیق و ملنسار۔ متواضع اور منکسر المزاج۔ چہرہ ہر وقت شگفتہ رہتا تھا۔ بے حد خود دار اور غیر ممتد بھی تھے۔ حق بات برملا کہتے تھے اور پوری قوت کے ساتھ کہتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کو کسی کی خوشنودی اور ناخوشنودی کا مطلقاً خیال نہیں ہوتا تھا۔ غالباً مدینہ طیبہ کے ساتھ شرفِ انتساب کا ہی یہ اثر تھا کہ کسی کے ہاں دعوت کھا کر اتنے خوش نہیں ہوتے تھے جتنا کہ خود کسی کی دعوت کر کے ہوتے تھے۔ زندگی بہت صاف ستھری اور اجلی رکھتے تھے اچھا کھاتے تھے اور اچھا پہنتے تھے۔ اُن کے ہاں کی دعوت دعوتِ شیراز نہیں بلکہ بڑی تکلف ہوتی تھی۔ اکثر عربی اور حجازی قسم کے حلوے اور کھانے وہ اپنے ہاتھ سے خود تیار کرتے تھے اور ان سے دوستوں کی تواضع کر کے بڑی مسرت محسوس کرتے تھے۔ ظاہر باطن بالکل یکساں تھا مصلحت کوشی ان کے لغتِ اخلاق میں ایک لفظِ بے معنی تھی ان کا خلوص اور محبت اور ان کا انقباض و تکدر صاف اور عیاں رہتا تھا۔ جس سے جو معاملہ تھا بے لوث تھا۔ جس سے دوستی تھی قلبِ مومن کی طرح بے غل و غش تھی اور جس سے دشمنی تھی فطرتِ باغی کی مانند بے توریہ و ایہام تھی۔ لیکن ان کی دوستی اور دشمنی دونوں اللہ کے لئے ہوتی تھی۔ دین میں ادنیٰ درجہ کی مداہنت گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اس باب میں ان کی سخت گیری بسا اوقات تند مزاجی و تنگ خوئی کا روپ دھار لیتی تھی۔ لیکن نجی معاملات میں بڑے حلیم و بردبار اور فیاض و فراخ حوصلہ تھے۔ جن سے ان کو تکلیفیں پہنچیں ان کے لئے بھی ہمیشہ دعائے خیر ہی کی۔ غرض

کہ ان کی کس کس خوبی کو بیان اور ان کے اخلاق و مکارم کی کس کس ادا کا تذکرہ کیا جائے آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اور قلب نے ان کی صحبت میں بیٹھ کر جو کچھ محسوس کیا زبانِ قلم اس کی ترجمانی سے درماندہ ہے۔ اللہ اللہ یہ پرانے چراغ ایک ایک کر کے محفل سے اُٹھتے جاتے ہیں اور نئے چراغوں میں وہ روشنی نہیں۔ پھر کون جانے کہ کل اس انجمن پر کیا گذرے گی۔ اللہ بس باقی ہوس! اللہ تعالیٰ آں مرحوم کو جنت الفردوس میں صدیقین و شہدا کا مقامِ جلیل عطا فرمائے۔

جون اور جولائی کے برہان کے نظرات میں جس اہم اور ضروری امر کی طرف توجہ دلائی گئی تھی ہندوستان اور پاکستان کے متعدد اربابِ علم نے اپنے نجی خطوط میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور ایڈیٹر برہان کو اس طرف متوجہ کرنے پر مبارکباد دی ہے۔ ذیل میں صرف نمونہ کے طور پر مخدومی مولانا سیّد مناظر احسن صاحب گیلانی مدظلہٗ کے والانامہ کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

"برہان کے تازہ شمارہ میں آپ کے اداریہ میں جس اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کو پڑھ کر دل پھڑک اُٹھا اور بے ساختہ آپ کے لئے دل سے دعائیں نکلیں آج سے تقریباً پچیس سال پیشتر بجنسہٖ اسی ضرورت کو میں نے حیدر آباد میں اس وقت پیش کیا تھا جب کرنال کے وقف کا مقدمہ فیصل ہوا۔ اس وقف میں واقف نے جہاں دوسرے مدارس کے لئے رقم متقول رکھی تھی وہیں خود کرنال میں بھی ایک مقامی مدرسہ کے لئے کافی رقم مختص کی تھی۔ نواب صدر یار جنگ مرحوم اس وقف کے سکریٹری تھے۔ میں نے نواب صاحب کو مشورہ دیا کہ بجائے ایک اور مدرسہ کھولنے کے یہ کہیں زیادہ بہتر ہوگا کہ جو عربی مدارس موجود ہیں انھیں کے ہر سال چند نمایاں فارغ التحصیل طلبار کا انتخاب کیا جائے اور جتنی تنخواہ مدرسوں میں مُدرّسوں کو ملتی ہے اس سے زیادہ وظیفہ ان طلبار کو دیا جائے اور ان کے لئے ایک بڑے کتب خانہ کا بھی انتظام کیا جائے اور مشورہ دینے کے لئے چند ماہرفن اساتذہ کو معقول تنخواہوں پر طلب کیا جائے اور یہ کہ جدید علمی زبانوں میں سے انگریزی اور سنسکرت کی تعلیم کا [۴] بھی نظم کیا جائے روپیہ وقف کا کافی تھا شیروانی صاحب

حضرت عمر کے سرکاری خطوط

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق
(استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

(۲)

۱۳- ابوعبیدہ بن جرّاح کے نام

[یہ خط شام کی فتوحات کے ایک نہایت نازک مرحلہ پر لکھا گیا۔ ۱۵ھ میں حمص پر مسلمانوں کی فتح کے بعد قیصر روم ہرقل نے ایک آخری کوشش مسلمانوں کو ملک سے نکالنے کی کی جو جنگ یرموک (۱۵ھ) کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد تینتالیس ہزار اور رومیوں کی چار لاکھ کے لگ بھگ بتائی گئی ہے۔ اس جنگ میں مسلمان شکست سے بال بال بچے۔ سپہ سالار ابوعبیدہ نے حضرت عمر کو لکھا:- ہمارے جاسوسوں نے خبر دی ہے کہ انطاکیہ (ہرقل کا شاہی ہیڈکوارٹر) میں ہرقل نے اپنی قلمرو کے تمام صوبوں سے لشکر طلب کئے ہیں اور ایک بہت بڑی فوج ہر قسم کے سامان سے لیس جمع کی ہے، ایسی فوج آج تک بڑے بڑے بادشاہ کبھی فراہم نہ کر سکے اور جلد ہم پر حملہ ہونے والا ہے، ہم نے یہ خبر پا کر صورت حال کا جائزہ لیا اور طے کیا کہ حمص کو چھوڑ دیا جائے، اس میں شک نہیں کہ حمص کا قلعہ مستحکم ہے مگر یہاں کے ذمی باشندوں پر ہم کو اعتماد نہیں ہے، اس کے علاوہ ہمارا لشکر اور وسائل ایسے نہ تھے کہ غنیم سے ٹکر لیتے، بنابریں ہم اہل وعیال کے ساتھ دمشق آگئے ہیں اور آپ سے مدد کے طالب ہیں۔ فتوح اعثم صہ۳۷[1]]

[1] (فتوح اعثم صہ۳۷)

تمہارا خط پہنچا، مضمون سے آگاہی ہوئی، یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ تم نے حمص جیسا عمدہ اور نعمتوں سے مالا مال شہر چھوڑ دیا ہے اور دمشق آ گئے ہو۔

(۲) تمہاری یہ کارروائی مجھے ناپسند ہوئی، مگر میں سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ حمص کے معاملہ میں تمہارے تجربہ کار اور صائب رائے ساتھیوں نے غور کیا ہوگا اور ان کی رائے میں یہی مناسب ہوگا کہ اس شہر کو (عارضی طور پر) چھوڑ دیا جائے، مجھے پورا بھروسہ ہے کہ جس کام کے بارے میں تمہارے تجربہ کار اور صائب رائے ساتھی غور و خوض کریں اور جس مہم میں تدبر کے ساتھ ہاتھ لگائیں اس کا انجام اچھا ہی ہوگا۔

(۳) تم نے کمک طلب کی ہے، میں نے عامر بن حذیم کی سرکردگی میں ایک لشکر آراستہ تمہاری مدد کے لئے روانہ کر دیا ہے جو اس خط سے پہلے پہنچے گا۔

(۴) رہی رومی لشکر کی کثرت اور ان کی ہر بار سے زیادہ فوجی تیاریاں جن کا تم نے ذکر کیا ہے تو اس سے بالکل نہ گھبراؤ، کیوں کہ فتح کا مدار کثرت فوج پر نہیں ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خدا کے حکم سے تھوڑی فوج بڑی فوج کو شکست دے کر تتر بتر کر دیتی ہے، خدا کی مدد پر بھروسہ کر کے دل مضبوط رکھو، کامیاب ہو گے۔"[1]

۱۴۔ ابو عبیدہ بن جراح کے نام

[ذیل کے خط کی شانِ نزول یہ ہے کہ شامی افواج کے سپہ سالار ابو عبیدہ کو یرموک کے مقام پر معلوم ہوا کہ رومی فوج جو اِن سے لڑنے اور بزعم خود ان کو ملک سے نکالنے آرہی تھی اس کی تعداد کئی لاکھ ہے اور اس میں رومی قلمرو کے ہزاروں مذہبی رہنما کچھ تو جہاد کی خاطر اور کچھ فوج کی قومی و مذہبی غیرت ابھارنے کے لئے شامل ہو گئے ہیں۔ یہ تعداد مسلمانوں کی توقع اور تجربہ دونوں سے بہت زیادہ تھی، ان پر ہراس طاری ہو گیا، وہ خود چالیس

---

[1] فتوح اعثم ص ۳۷-۳۸)

ہزار تھے، ماکمانڈر ان چیف نے مشیروں کی رائے سے حضرت عمر کو ارجنٹ خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:- رومیوں نے سمندر اور خشکی سے ہمارے اوپر یورش کی ہے اور ہر اُس مرد کو بھرتی کیا ہے جو ہتیار چلانے کے قابل ہے، ان کے ساتھ قسیس اور اساقفہ بھی ہیں اور راہب جوشِ جہاد میں عبادت گاہوں سے نکل کر فوج کے ساتھ شریک ہو گئے ہیں، رومی قیصر نے آرمینیا اور جزیرہ (میسوپوٹامیہ) کے صوبوں سے بھی فوجیں حاصل کی ہیں اور کل فوج کی تعداد چار لاکھ کے قریب ہے۔ جب مجھے ان حقائق کا علم ہوا تو میں نے مناسب نہ سمجھا کہ مسلمانوں کو خطرہ میں ڈالوں یا حقیقت حال ان سے مخفی رکھوں یہ خبر سنا کر جب میں نے ان سے مشورہ کیا تو ان کی رائے ہوئی کہ سب لوگ شام کے کسی الگ تھلگ حصہ میں چلے جائیں اور اپنی فوج کو جو اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہے جمع کرلیں، پھر جب آپ کے پاس سے کافی کمک آجائے تو دشمن سے لڑنے نکلیں۔ امیرالمؤمنین بہت جلدی کیجئے اور فوج در فوج بھیجئے، اگر ایسا نہ ہوا اور مسلمان یہاں (یرموک) پڑے رہے تو سمجھ لیجئے وہ ہلاک ہو چکے اور اگر وہ ڈر کر بھاگ گئے تو سمجھ لیجئے ان کا دین ایمان گیا، ان کا مدمقابل ایک ایسا غنیم ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کی ان میں صلاحیت نہیں ہے، الّا یہ کہ خدا ان کی مدد کے لئے فرشتے بھیجے یا خود کوئی فوج لے کر آئے۔[۱]]

"اما بعد! تمہارا خط لے کر آیا، تم نے لکھا ہے کہ رومیوں نے مسلمانوں پر سمندر اور خشکی کی طرف سے یورش کی ہے اور اپنے اَساقِفہ، قسیس اور راہبوں کو تقویت و تحریص کے لئے ساتھ لائے ہیں۔

(۲) بلا شبہ ہمارے مالک کو جس کے ہم سپاس گذار ہیں، جو ہمارا مشکل کشا ہے، جس ذاتِ گرامی نے ہم پر احسان کئے ہیں اور جو ہمیشہ ہم کو اپنی نعمتوں سے نوازتا رہا ہے، ان اساقفہ اور راہبوں کی موجودگی کا اس وقت علم تھا جب اس نے محمدؐ کو

---

[۱] فتوح الشام ازدی صفحہ ۱۶۰ - ۱۶۱

برحق مبعوث کیا، فتوحات سے ان کی عزت افزائی کی، اور دشمن کا دل مرعوب کر کے ان کی مدد فرمائی، جس نے فرمایا۔ اور اس کا کوئی وعدہ جھوٹا نہیں ہوتا: وَهُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ ۝

(۳) لہذا اس لشکر کی کثرت سے تم ہراساں نہ ہو، کیوں کہ خدا ان سے بیزار ہے اور جس سے خدا بےزار ہو اس کے لئے فوج اور ہتھیاروں کی زیادتی دونوں ہیچ ہے، ایسے شخص کو خدا اس کے بل بوتے پر چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔

(۴) تم اپنی قلت سے کبھی دل تنگ نہ ہو، کیوں کہ خدا تمہارے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ خدا ہو وہ کبھی کم نہیں ہوتا۔

(۵) جس جگہ تم ہو وہیں ڈٹے رہو حتیٰ کہ دشمن تم سے مقابلہ کرے اور مالک کی مدد سے تم کو فتح حاصل ہو، وہی بہترین محافظ، سردھرا اور مددگار ہے۔

(۶) تم نے لکھا ہے: اگر مسلمان دشمن کے سامنے ٹھہرے رہے تو سمجھ لیجئے وہ برباد ہو چکے اور اگر دشمن سے ڈر کر بھاگ گئے تو سمجھ لیجئے ان کا دین ایمان گیا، ان کے سامنے ایسا غنیم ہے جس سے برد آزما ہونے کی ان میں صلاحیت نہیں ہے، الا یہ کہ خدا فرشتے بھیج کر ان کی دستگیری فرمائے، خدا کی قسم، اگر تم یہ کلمہ استثنا نہ لکھتے تو بہت برا کرتے، قسم ہے میری جان کی، اگر مسلمان ان کے سامنے ڈٹے رہے اور صبر کا دامن نہ چھوڑا اور قتل ہوئے تو وہ ضائع نہیں ہوں گے (خدا کے ہاں ان کے لئے بڑے اچھے انعام ہیں) بڑے خوش نصیب ہیں وہ جن کو شہادت کی نعمت حاصل ہوا

(۷) سمجھ دار مسلمانوں کے لئے ان جانبازوں میں اچھی مثال ہے جو رسول اللہ کی لڑائیوں میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ جو لوگ اسلام کی خاطر لڑے وہ نہ تو کبھی بےبس ہوئے اور نہ موت سے ڈرے۔ رسول اللہ کے بعد جو لوگ زندہ رہے وہ بھی دشمن یا

موت سے خائف نہیں ہوئے، نہ مصیبتوں کے سامنے انھوں نے کبھی گھٹنے ٹیکے بلکہ انھوں نے اپنے پیش رووں کی مثال نظر میں رکھی اور بقائے اسلام کے لئے ان لوگوں سے جہاد کیا جنھوں نے ان کی بات نہیں مانی یا اسلام سے پھر گئے۔

(۸) خدا نے صبر کرنے والی جماعت کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے: وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

ان آیتوں میں ثوابِ دنیا غنیمت اور فتح ہے، ثوابِ آخرت، مغفرت اور جنت ہے۔

(۹) میرا یہ خط لوگوں کو پڑھ کر سنانا اور تاکید کرنا کہ اسلام کی سربلندی کے لئے مردانہ وار لڑیں اور سخت سے سخت مشکل کو برداشت کریں، خدا ان کو دنیا اور آخرت کی نعمتوں سے سرفراز کرے گا۔

(۱۰) تمہارا یہ کہنا کہ مسلمانوں کا مقابلہ ایک ایسے ہولناک لشکر سے ہے جس سے مقابلہ کی ان میں صلاحیت نہیں ہے، تو اگر تمہارے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے تو خدائے قوی میں تو ہے! ہمارا مالک ان کو برابر شکست دینے پر قادر رہا ہے خدا کی قسم اگر دشمنوں سے ہم اپنے بل پر لڑا کرتے تو وہ مدت کے ہم کو تباہ کر چکے ہوتے، ہم تو اپنے مالک خدا کے بھروسہ پر لڑتے ہیں اور اپنے بل پر بالکل اعتماد نہیں کرتے، اور اس سے نصرت و رحمت کی التجا کرتے ہیں۔

(۱۱) مجھے یقین ہے کہ چاہے تم کتنے ہی کم ہو، بہرحال فتح یاب ہو گے، ضرورت اس کی ہے کہ خدا اور اسلام کے لئے قربانی کا سچا جذبہ ہو اور اپنی ساری خواہشیں اس کی خوشنودی کے تابع ہوں، اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ

لعلکم تفلحون۔"

[منقولہ خط کا نسخہ بروایت واقدی ۱/۱۰۵ - واقدی نے لکھا ہے کہ ابو عبیدہ نے جب حضرت عمرؓ کو یرموک میں رومیوں سے پہلی جھڑپ کی خبر دی اور مدد طلب کی تو یہ خط لکھا گیا۔]

۱۵- ابو عبیدہ بن جرّاح کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ عبد اللہ عمرؓ امیر المؤمنین کی طرف سے امین الامت ابو عبیدہ اور مہاجرین و انصار کو سلام علیک ۔ اس خدا کا سپاس گزار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اس کے نبی محمدؐ پر درود بھیجتا ہوں ۔ تم کو معلوم ہو کہ خدا کی مدد تمہارے لئے ہماری مدد سے بہتر ہے[۱]، نیز یہ کہ فوج کی کمی بیشی پر فتح و شکست کا مدار نہیں ہوتا فتح و شکست کا مدار خدا کی مدد پر ہوتا ہے، وہ فرماتا ہے: تمہاری فوج چاہے کتنی زیادہ ہو تمہارے بالکل کام نہ آئے گی، بلاشبہ خدا مومنوں کے ساتھ ہے، بعض وقت اللہ تعالیٰ کم فوج کو بڑی فوج پر فتح عطا کرتا ہے، فتح و کامرانی کو محض عطیۂ خداوندی سمجھنا چاہیئے - خدا فرماتا ہے: فَمِنْهُم مَّن قضیٰ نحبہ ومنہم من ینتظر الآیۃ - کتنے خوش نصیب ہیں خدا کے دین کے لئے شہید ہونے والے! کتنے خوش نصیب ہیں خدا پر بھروسہ کرنے والے!

(۲) جتنے مسلمان تمہارے پاس ہیں ان کو لے کر لڑنے نکل جاؤ، جو مسلمان مارے گئے ان کو دیکھ کر مایوس نہ ہو ۔

---

[۱] فتوح الشام ازدی، ص ۱۶۳-۱۶۴ [۲] اس خط میں کمک یا مدد بھیجنے کا کوئی ذکر نہیں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو صرف آسمانی مدد کے بھروسہ پر چھوڑ دیا، لیکن فتوح اعثم ص ۳۸ پر اس خط کا جو خلاصہ دیا گیا ہے اس میں تصریح ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے خط کے آخر میں کمک بھیجنے کا وعدہ کیا اور تین ہزار سوار روانہ کیے - فتوح اعثم کے مطابق یرموک کے معرکہ میں مسلمان فوجوں کی تعداد ۳۴ ہزار اور رومیوں کی چار لاکھ کے قریب تھی

[۳] فتوح الشام ازدی نے جیسا کہ بیان ہوا ابو عبیدہ نے اپنے مراسلہ میں رومیوں کی تعداد چار لاکھ بتائی ہے، لیکن فتوح الشام واقدی کے راویوں نے ابو عبیدہ کا جو خط نقل کیا ہے اس میں یہ تعداد آٹھ لاکھ ہے ۔

[۴] فتوح الشام واقدی، مصر، ۱/۱۰۴ میں مذکورہ بالا خط لفظ و معنی ہر دو لحاظ سے بہت مختلف بیان ہوا ہے ۔

(۳) تمھارے سامنے ان مسلمانوں کی مثال ہے جو رسول اللہ کی جنگوں میں شہید ہوئے جنہوں نے نازک موقعوں پر دشمن کے سامنے ہمت نہ ہاری، جو مولیٰ کی خاطر مرنے سے کبھی خائف نہ ہوئے، جنہوں نے مولیٰ کی خاطر جہاد کا پورا پورا حق ادا کیا، جن کی زبان پر لڑتے وقت بس یہ الفاظ تھے: ربنا اغفر لنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبّت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین۔

(۴) میرا یہ خط مسلمانوں کو پڑھ کر سنانا اور ان کو دشمن سے سچے دل کے ساتھ لڑنے کی تاکید کرنا اور یہ آیت قرآنی ان کے سامنے تلاوت کرنا: یا ایھا الّذینَ آمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ والسلام علیک وبرکاتہ۔

[منقولہ خط کا نسخہ بروایت ابن جوزی، تاریخ عمر، مصر ص ۹۵]

تمہارا خط موصول ہوا جس میں تم نے مدد طلب کی ہے۔ میں تمہاری توجہ ایسی ہستی کی طرف دلاتا ہوں جس کا لشکر منٹوں میں آتا ہے اور جس کی کمک ناقابل تسخیر ہوتی ہے اور وہ اللہ ہے اسی سے مدد طلب کرو۔ بدر کے معرکہ میں جس فوج سے محمد کو فتح حاصل ہوئی وہ تم سے کم تعداد اور کم مسلح تھی، میرا خط پاکر جہاد میں لگ جاؤ اور پھر کمک کے لئے خط نہ لکھنا۔

۱۶- ابو عبیدہ بن جرّاح کے نام

[یہ خط فتح یرموک کی خبر پاکر لکھا گیا]

عبداللہ عمرؓ امیر المومنین کی طرف سے شام کے گورنر کے نام، سلام علیک، میں اس خدا کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور اس کے نبی محمد پر درود بھیجتا ہوں۔ مجھے اس خبر سے خوشی ہوئی کہ خدا نے اپنی مدد سے مسلمانوں کو فتح عطا کی اور ان کے دشمنوں کو سرنگوں کیا۔

(۲) اس خط کو پڑھ کر مالِ غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کر دو اور ہر شخص کو اس کی اہلیت کے مطابق حصہ دو، ان لوگوں کو خاص طور پر زیادہ دو جنہوں نے جنگ میں کارہائے نمایاں کئے ہیں۔

(۳) مسلمانوں کی حفاظت اور خبر گیری میں مطلق غفلت نہ کرنا۔ ان کی خدمات اور قربانی کے لئے ان کا شکریہ ادا کرو۔

(۴) جہاں مقیم ہو وہیں ٹھہرے رہو حتیٰ کہ میں نئے اقدام کے لئے ہدایت بھیجوں،

والسلام علیک وعلیٰ جمیع المؤمنین۔[۱]

۱۷۔ ابوعبیدہ بن جرّاح کے نام

عبداللہ عمر امیرالمؤمنین کی طرف سے گورنر ابوعبیدہ بن جرّاح کے نام، میں اس خدا کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور اس کے نبی پر درود بھیجتا ہوں۔ تمہارا خط موصول ہوا جس میں تم نے پوچھا ہے کہ (یرموک کے بعد) کس شہر پر فوج کشی کی جائے، اس معاملہ میں رسول اللہ کے چچازاد بھائی (علی) کا مشورہ ہے کہ بیت المقدس پر چڑھائی ہو، امید ہے خدا اس شہر عظیم کو تمہارے ہاتھوں فتح کرائے گا، والسلام علیک۔[۲]

۱۸۔ ابوعبیدہ بن جرّاح کے نام

[حَلَب کے باشندوں نے ابوعبیدہ سے صلح کر لی تھی، حلب کے باہر ایک نہایت مضبوط پہاڑی قلعہ تھا، جس میں علاقہ حلب کا رومی گورنر رہتا تھا، وہ محصور ہو گیا، چار پانچ ماہ تک قلعہ کا محاصرہ رہا، رومی قلعہ سے پتھر باری کرتے اور رات میں مسلمانوں

---

[۱] (واقدی ۱/۱۳۸) [۲] (واقدی ۱/۱۳۹)

پر شبخون مارتے، قلعہ فتح ہونے کی کوئی صورت نہ نکلی، ابو عبیدہ اور مسلمان پڑے پڑے اُکتا گئے، ابو عبیدہ نے مرکز کو بہت دن تک خط بھی نہ لکھا، وہ منتظر تھے کہ قلعہ فتح ہو تو لکھیں، حضرت عمرؓ خط نہ آنے سے بہت پریشان تھے جیسا کہ ذیل کے خط سے ظاہر ہے]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، عبداللہ عمرؓ کی طرف سے شام کے گورنر ابو عبیدہ کو سلام علیک، ابو عبیدہ تمہیں کیا معلوم تمہارا خط نہ آنے اور تمہاری خیریت معلوم نہ ہونے سے دل کو کیسی بے کلی ہے، اپنے مسلمان بھائیوں کی فکر سے جسم کو روگ سا لگ گیا ہے رات دن تمہاری یاد اور فکر ستاتی ہے، ہر وقت تمہارا ہی خیال رہتا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تمہارا خط کیوں نہیں آتا اور تمہاری خبر کیوں نہیں ملتی، یہ بات تو نہیں کہ تم چاہتے ہو کہ صرف فتح اور غنیمت کی خوش خبری کے لئے ہی خط لکھا جائے، ابو عبیدہ اگرچہ میں بہت دور ہوں، مگر تمہاری خیر و عافیت کے لئے ہر وقت دعا کرتا ہوں، اور دل تم سب کی عافیت کے لئے ایسا بے چین ہے جیسے ماں کا چہیتے بچہ کے لئے، میرا خط پاکر اسلام اور مسلمانوں کی تقویت کے لئے ہر ممکن کوشش سے دریغ نہ کرنا۔ والسلام علیک وعلی من معک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

۱۹۔ ابو عبیدہ بن جرّاح کے نام

[حلب کے بیرونی قلعہ کا جب چار پانچ ماہ تک محاصرہ رہا اور مسلمانوں کو کامیابی نہ ہوئی تو یہ طے ہوا کہ محاصرہ اٹھا دیا جائے اور فوجیں حلب میں خیمہ زن ہوں، شاید محصور گورنر کھلے میں آکر مقابلہ۔ ابو عبیدہ نے حلب پہنچ کر قنسرین کی فتح، اور حلب کی صلح، بازنطینی سرحدوں پر حملوں، نیز قلعہ سے ہٹنے کی مرکز کو خبر دی تو حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا۔

تمہارے سفیر خط لے کر پہنچے، تم کو جو فتوحات حاصل ہوئیں، خدا نے دشمنوں کے

مقابلہ میں تمہاری جو مدد کی، اور اسلام کی خاطر جو مسلمان شہید ہوئے (؟) ان سب کا حال سن کر مسرت ہوئی، مگر میں تمہارے اس اقدام کو درست نہیں سمجھتا جو تم نے قلعہ چھوڑ کر حلب اور انطاکیہ کے درمیان خیمہ زن ہو کر کیا ہے ۔ کیا تمہارے لئے یہ مناسب ہے کہ ایسے شخص کو چھوڑ کر جس کا علاقہ اور صدر مقام (حلب) فتح کر چکے ہو الگ ہٹ جاؤ اور پھر یہ خبر ہر طرف مشہور ہو کہ تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے، جس کے نتیجہ میں تمہاری دھاک گھٹ جائے، گورنر کی ساکھ بڑھے اور ان لوگوں کو تم سے لڑنے کا حوصلہ ہو جو ڈرے بیٹھے ہیں، روم کے لشکر تم سے لڑنے کو پھر آمادہ ہوں، بلکہ شام کے تمام خاص و عام میں تمہارے خلاف جارحانہ اقدام کی تحریک پیدا ہو، اور شام کے ارباب حکومت تمہارے خلاف ایک دوسرے کے ساتھ ریشہ دوانیاں شروع کر دیں پس خبردار سرزمین حلب سے اس وقت تک نہ ہٹو جب تک خدا کی مدد سے تم کو قلعہ پر فتح حاصل نہ ہو جائے،

(۲) رسالے میدانوں میں پھیلا دو، پہاڑوں اور تنگ وادیوں میں مورچے سنبھال لو، اور مَعَرّات سے حدودِ فرات تک فوجی اہمیت کے تمام مقامات کے ناکے بند کر لو۔

(۳) جو علاقے تم سے صلح کے طالب ہوں ان سے صلح کر لو، جو تم سے سمجھوتہ کریں ان سے سمجھوتہ کر لو، میری جگہ خدا تمہارا اور سارے مسلمانوں کا قائم مقام ہے ۔

(۴) اس خط کے ساتھ شرقی یمن کے عربوں، موالی، پیادے اور سواروں کی ایک فوج جس نے راہِ خدا میں جان دینے کا عہد کیا ہے، بھیج رہا ہوں، اس کے علاوہ اور کمک بھی برابر تمہارے پاس پہنچتی رہے گی۔[1]

۲۰۔ ابو عبیدہ بن جراح کے نام

۱۷ھ میں نصرانیت اور قیصر کا سب سے بڑا مرکز انطاکیہ فتح ہوا، ابو عبیدہ

[1] واقدی ۲/۳۶

نے اس کی خبر حضرت عمرؓ کو دی اور لکھا کہ یہ جگہ اتنی عمدہ اور دل لگاؤ ہے کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر زیادہ عرصہ عرب یہاں مقیم رہے تو عیش و آرام کے عادی ہو جائیں گے، لہٰذا جلد ہی حلب واپس آگیا، اس کے علاوہ انھوں نے خلیفہ سے آئندہ عسکری اقدام کے بارے میں مشورہ کیا کہ آیا بازنطینی سرحدوں پر فوج کشی کریں یا کچھ دن ٹھہرے رہیں، انھوں نے خط میں یہ شکایت بھی کی کہ عرب رومی عورتوں پر شیفتہ ہوتے جارہے ہیں اور ان سے شادی کے خواہش مند ہیں، حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، عبداللہ عمرؓ کی طرف سے شام کے گورنر ابو عبیدہ کو سلام علیک، میں اس خدا کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اس کے نبی محمدؐ پر درود بھیجتا ہوں۔ شکر گذار ہوں خدا کا اس فتح کے لئے جو اس نے مسلمانوں کو عطا کی، جس نے آخرت کے انعام اہلِ تقویٰ کے لئے مخصوص کئے، جو برابر ہم پر مہربان اور ہمارا معاون رہا ہے۔

(۲) تم نے جو یہ لکھا ہے کہ انطاکیہ اتنی عمدہ اور دل لگاؤ جگہ ہے کہ میں نے مصلحتاً وہاں قیام نہیں کیا تو اس باب میں مجھے یہ کہنا ہے کہ خدا نے عمدہ اور لطیف چیزیں نکوکاروں اور اہلِ تقویٰ پر حرام نہیں کی ہیں، اس نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: پیغمبرو! عمدہ چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو، میں تمھارے سارے افعال سے واقف رہتا ہوں۔ بنا بریں تم پر لازم تھا کہ تھکے مجاہدین کو وہاں ٹھہرا کر سستانے، آرام کرنے اور خورد و نوش کا سیر ہو کر لطف اٹھانے دیتے۔

(۳) تم نے لکھا ہے کہ بازنطینی سرحدوں میں جو تمھارے دشمن کے عقب میں ہیں داخل ہونے کے لئے تم میرے حکم کے منتظر ہو، تو بھئی میں غائب ہوں تم حاضر، حاضر جو امور دیکھ اور سمجھ سکتا ہے وہ غائب دیکھ اور سمجھ نہیں سکتا تم دشمن کے سامنے ہو اور تمھارے جاسوس ہر وقت تم کو اس کی خبریں پہنچاتے ہوں گے، پس اگر تمھاری

رائے میں سرحدوں پر فوج کشی مسلمانوں کے لئے بہتر ہو تو وہاں دستے بھیج دو، اور آمد و رفت کے پہاڑی راستوں کی ناکہ بندی کرلو، دستوں کے ساتھ ایسے لائقِ اعتماد نصرانی عرب ساتھ کر دو جو ان کی رہبری کر سکیں۔

(۴) اگر سرحدی علاقہ کے لوگ صلح کی پیش کش کریں تو اس کو قبول کر لو، اور شرائطِ صلح کی بہ تمام و کمال پابندی کرو۔

(۵) تم نے جو یہ لکھا ہے کہ رومی عورتوں کا جمال دیکھ کر عرب ان سے شادی کے خواہش مند ہیں، تو میری رائے ہے کہ جن لوگوں کی حجاز میں بیویاں نہ ہوں ان کو شادی کی اجازت دے دو، اور جو رومی کنیزیں خریدنا چاہیں ان سے بھی تعرض نہ کرو، ان کو ملوث ہونے سے بچانے کی یہ بہترین تدبیر ہے۔ والسلام علیک وعلی من معک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ[1]۔

۲۱۔ ابو عبیدہ بن جرّاح کے نام

[حَلَب، انطاکیہ اور مَنبج کی فتح کے بعد ۱۶ھ میں (بقول واقدی) ابو عبیدہ نے بازنطینی سرحدوں (دُروب) کی طرف فوجی دستے بھیجے تھے، انھوں نے رومیوں کو کافی نقصان پہنچایا، اور بہت سامالِ غنیمت حاصل کیا، مگر اُن کے ایک فوجی افسر عبداللہ بن حذافہ کو رومیوں نے پکڑ لیا، گرفتاری کی خبر حضرت عمرؓ کو کی گئی تو ان کو بہت افسوس ہوا اور انھوں نے بازنطینی قیصر کو ذیل کا خط لکھا]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، حمد ہے اس خدا کی جس کے نہ بیوی ہے نہ بچہ، اور درود بھیجتا ہوں اس کے نبی فاتح محمدؐ پر، عبداللہ عمر امیر المؤمنین کی طرف سے، میرا یہ خط پاتے ہی اس قیدی کو لوٹا دو جو تمہارے قبضہ میں ہے اور جس کا نام عبداللہ بن حُذافہ ہے، اگر تم نے ایسا کیا تو امید ہے ہدایت پاؤ گے ورنہ میں جوانوں کی ایک فوج بھیجوں گا جو ان جن کو تجارت یا دنیا کے دھندے خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے، والسلام علی من اتبع الھدیٰ وخشی عواقب الرّدیٰ[2]۔

---

[1] واقدی ۳/۱۳۷ [2] واقدی ۲/۸، مصر

اصفہبدان فریم

از

جناب ڈاکٹر صغیر حسن معصومی ایم - اے - ڈی فل (آکسن)
(استاد شعبۂ عربی و اسلامیات ڈھاکہ یونیورسٹی)

"موسیو کازانوا (Paul Casanova) فرانس کا دقیق النظر مستشرق گذرا ہے اسلامی تاریخ و جغرافیہ اور مسکوکات سے اس کو خصوصی دلچسپی تھی - کوہ پریم (فریم) کے اسپہبدوں پر اس کا قیمتی مقالہ عجب نامہ میں شائع ہوا تھا، اسی مقالہ کا ترجمہ بقلم برادر محترم ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی ہدیۂ ناظرین ہے - موسیو کازانوا کا علمی پایہ معلوم کرنا ہو تو علامۂ محمد بن عبدالوہاب قزوینی کے مجموعۂ مقالات (بیست مقالہ : ج ا ص ۲۱-۲۲ بمبئی) کی طرف رجوع کریں - کازانوا کی فروگذاشتوں پر ہمارا مختصر تبصرہ خاتمہ میں درج ہوگا" (ابو محفوظ الکریم معصومی)

سنہ ۱۸۹۷ء - میں جب میں قومی کتب خانہ پیرس میں سکوں کے سکشن میں (cabinet des Medailles de la Bibliothèque Nationale de Paris) متعین تھا تو میری نظر سے ایک سکہ گذرا جو رستم بن شروین کے نام سے ۳۶۷ھ ہجری میں جبل فریم میں مضروب ہوا تھا - میں نے موسیو ایم ٹیسنہازن (M. Tiesenhausen) کو اس کی تحقیق اور تفصیلی معلومات کے لئے لکھا انھوں نے اپنے قیمتی خط میں جو قیمتی معلومات پر مشتمل تھا، اس پر خوب تبصرہ کیا اور مسٹر ڈارن (Dorn) کی ایک کتاب کے چند اوراق بھیجے جن میں مصنف نے رستم مذکور اور اس کے سکوں کا تذکرہ کیا ہے[1] میرا ارادہ ہوا کہ اس درہم کے متعلق اپنے معلومات

---

[1] خط ۱۲/۲ نومبر - ڈارن (Dorn) کی کتاب کا نام حسب ذیل ہے : یادداشت سفر علمی تفقاز و
(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کو ان سارے مواد کے ساتھ جن کو اس بڑے روسی ماہر سکّہ جات نے اتنی آزادی اور مہربانی سے مجھ کو ارسال کیا تھا شائع کردوں۔ لیکن بعض خاص وجوہ کی بنا پر مجھ کو عربی سکّوں کے علم کو چھوڑنا پڑا، میرے نئے مطالعے کچھ ایسے رہے جو اس علم کی طرف میری توجہ منعطف نہ کرسکے۔ چوں کہ اس رستم کے ساتھ مسلمانان فارس کی تاریخ کے چند خاص دل چسپ واقعات وابستہ ہیں اس لئے اپنے خاص شاگرد و دوست ایم ہنری ماسے (M. Henri Masse) الحال پروفیسر کلیۃ الآداب سے، الجیریا سے چند سال کے بعد میں نے تحریک کی کہ میری یادداشتوں کو لیں اور اپنے فارسی کے خصوصی علم کے ذریعہ تکمیل تک پہنچائیں۔ انھوں نے قبول کیا لیکن جنگ چھڑ گئی اور وہ مواد نہ لے سکے انھوں نے پیرس چھوڑا اور علاوہ دوسرے کاموں کے مختلف مشغولیتوں نے انھیں اس کام میں ہاتھ لگانے نہ دیا۔ ان کی رضامندی سے میں نے کوشش کی ہے کہ تنہا ان سوالات کو جو اس چھوٹے سے سکہ کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں حل کروں۔

فریم آج ایک نامعلوم جگہ ہے۔ مسٹر گائی لا اسٹرینج اپنے ترجمۂ نزہت القلوب میں لکھتے ہیں —— "جگہ غیر معلوم"[1] —— کتاب نزہت القلوب کے بیان پر غور کرنے سے مجھ کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ قریۂ فیروزکوہ ہے جو تہران اور ساری کے راستے میں مازندران میں واقع ہے[2]۔ یہاں ان سارے وجوہ کو شمار کرنا جن کی روشنی میں میرا اصرار ہے کہ یہ دونوں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) جنوبی سواحل بحیرۂ خزر ۱۸۶۰-۱۸۶۱ء ..... سفر مازندران ... سنٹ پطرسبرگ ... ۱۸۹۵ء (ص ۱۹۳ تا ۲۵۳، قسم تاریخ) [1] نزہت القلوب (قسم جغرافیہ) تالیف حمداللہ مستوفی مطبوعۂ گب میموریل: صفحہ ۱۵۸ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اس مقام کا ذکر نہیں ؛ [2] اس قریہ کے بارے میں دیکھو "قاموس جغرافیۂ فارس" از بربیر دے مینارد (Barbier de Meynard) اور دوسرے مصنفین جن کا وہ حوالہ دیتا ہے مثلاً نیپیر (Napiare Proceedings of the Royal Geographical Society of XI Session لندن ۱۸۶۷ء۔ صفحہ ۱۲۶ (نقشہ صفحہ ۶۲) (۵ - 1875 - ملگونف بحر خزر کا جنوبی ساحل (لیپزگ ۱۸۶۸ء) انڈکس اور نقشہ ۶ اور نقشۂ مملکت عظمٰی روسیا: (تفلیس ۱۸۶۶ء) ورق A VIII، استراباد ؛ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام نے اس قریہ کا بھی تذکرہ نہیں کیا ہے اس میں یہ ذکر ہے کہ اسی نام کی ایک جگہ افغانستان میں ہے۔

جگہیں ایک ہیں، طولِ عمل ہوگا میں صرف اہم اصولوں کے اظہار پر اکتفا کرتا ہوں۔

(الف) فریم کا نام اصطخری کو معلوم ہے[1] لیکن بعد کے جغرافیہ دانوں کو معلوم نہیں[2]۔ اس کے برخلاف فیروزکوہ اصطخری کو نہیں معلوم اور یاقوت کو معلوم ہے بلکہ یاقوت لکھتا ہے کہ: میں نے دیکھا ہے[3]۔ ایرانی اور عرب مؤرخین تقریباً ۵۰۰ھ تک فریم کا ذکر کرتے ہیں فیروزکوہ کا نہیں۔ اس عہد کے بعد واقعہ برعکس ہے[4]۔

(ب) فریم کی جگہ جیسا کہ ابن اسفندیار کی ایک عبارت میں بیان ہوا ہے[5] اس راستہ پر ہے جو ساری سے سمنان کو جاتا ہے اور یہی حال فیروزکوہ کا ہے کہ یہ راستہ مذکور اور اس راستے کے ملنے کی جگہ پر واقع ہے جو تہران سے استراباد کو جاتا ہے۔ اصطخری کا خیال ہے کہ پہلا راستہ ساریہ (ساری) سے ایک مرحلہ (منزل) پر ہے۔ فیروزکوہ درحقیقت ساری سے صرف ایک ہی منزل کی دوری پر ہے لیکن یہ قابلِ غور ہے کہ یہ عربی لفظ "مرحلہ" — اپنے معنی میں کہاں تک وسعت رکھتا ہے۔ مزید برآں، عبارت مبہم ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے وہ عجیب قریہ مراد ہے جو سمہار (؟) کہلاتا ہے[6]۔

---

[1] طبعۂ دی خویہ ۱۸۷۰ء م۔ ص۲۰۵ و ص۲۰۷ ب۔ [2] یاقوت: معجم البلدان، ایڈیشن ووسٹن فیلڈ جلد ۳ صفحہ ۹۰ (ایڈیٹر نے فریم بتشدید الراء لکھا ہے۔ راء کی تشدید کا ذکر نہ متن میں ہے نہ جلد ۵ کی شرح میں۔ میں نے کسی دلیل کے ملنے تک، جس سے تشدید ثابت ہو، بلا تشدید فریم املا اختیار کیا ہے دوسرے جغرافیہ داں مثلاً ادریسی جو اصطخری سے نقل نہیں کرتے، اسی کی نقالی کرتے ہیں، یاقوت کا ہم عصر ابن الاثیر ۶۳۰ھ میں بظاہر قدیم ماخذوں کی بنا پر اس جگہ کا نام لیتا ہے (ج ۹ ص۱۰۷ سطر ۱۔ لیڈن ۱۸۶۳ء [3] حوالۂ سابق، ایضاً ص۹۳ سطر، "رأیتھا"، [4] میں یہاں پر دو ماخذوں کو مستثنیٰ کرتا ہوں ایک ابن اسفندیار کو جو ۶۲۵ھ میں فیروزکوہ کا ذکر کرتا ہے (ترجمہ Browne، گب میموریل ص۱۶۵) دوسرے ملگونف کو (دیکھو نوٹ ۳ حوالۂ سابق) ص۹۵) جس کے یہاں فریم کا ذکر ۶۰۷ھ میں کیا گیا ہے لیکن کوئی حوالہ مذکور نہیں، ابن الاثیر کو صرف افغانستان کے فیروزکوہ کا علم ہے۔) [5] دیکھو ترجمہ براؤن ص۲۳۲۔ علاؤالدولہ علی کو اس کا باپ اصفہان بھیجتا ہے پھر ساری سے فریم تک اس کے شامل ہوتا ہے بعد ازاں علاؤالدولہ علی نے وہ راستہ لیا جو اسران اور سمنان سے گذرتا ہے یہ تفصیل بڑی حد تک فیروزکوہ پر صادق آتی ہے۔ [6] حوالۂ سابق، ص۲۰۵ سطر ۱۱ اور نوٹ (ط)، دوسرے نام کے اختلافات کے لئے دیکھو ص۲۰۷ نوٹ (ط)

(ج) فریم، ساری اور تہران کے درمیان واقع ہے جیسا کہ آل سامان کی تاریخ کے ایک واقعہ سے ظاہر ہے جس کو تین مصنفوں نے مختلف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ کئی دلچسپ باتوں کا پتہ دیتا ہے سب سے پہلے اصطخری کا بیان ہے کہ "فریم جبال قارن میں تھا نیز یہ کہ یہ آل قارن کا مستقر (پایۂ تخت) تھا[1]۔

۳۱۴ھ کے تحت میں ابن الاثیر بیان کرتا ہے کہ سامانی امیر نصر بن احمد کو خلیفہ مقتدر نے رے اور جبال کے درہ کے انتظام کے لئے مقرر کیا جب وہ جبل قارن میں پہنچا تو ابو نصر الطبری نے اس کا راستہ روک لیا۔ امیر نے اس سے تیس ہزار دینار دے کر سمجھوتہ کر لیا اور تب گذر سکا[2]۔ یاقوت نے زیادہ تفصیل سے کام لیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "دیلم میں کوہ شہریار میں ایک گانوں سانیز ہے جس کے نام پر دیلم کے حاکم شروین بن رستم بن قارن کے ایک شریک کار ابو نصر کو سانیزی کا خطاب دیا گیا جب نصر بن احمد سامانی اپنی رے کی حکومت کو چلا تو کوہ شہریار سے گذرا[3]۔ ابو نصر نے اس کو ایک مقام ہزار گری میں گھیر لیا جہاں وہ چار ماہ تک رہا نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ جب اس نے ابو نصر کو تیس ہزار دینار دیئے تو راستہ ملا[4]۔

دونوں عبارتوں کے مقابلہ سے یہ ظاہر ہے کہ جبل قارن کو جبل شہریار بھی کہا جاتا ہے دونوں ناموں کو بلکہ خاص کر دوسرے کو ابن اسفندیار نے ذکر کیا ہے (دیکھو انڈکس) شروین بن رستم بن قارن اس جبل کا مالک تھا اور اس لئے وہ ۳۱۴ھ میں فریم کا بھی مالک تھا۔ یہ حقیقت میں ڈارن (Dorn) کی تیار کردہ فہرست کے مطابق[5] قدیم باوندی خاندان[6] ہے۔

---

[1] حوالۂ سابق، ایضاً سطر ۱۰ و ۱۲ — جبال قارن . . . ومستقر آل قارن بموضع یسمی (بعد بینة) فریم وھو موضع حصنھم وذخائرھم ومکان ملکھم۔ [2] ج ۱۱ ص ۱۲۱ طبع ٹرنبرگ [3] عبارت مضطرب ہے دیکھو وسٹن فیلڈ کا نوٹ ج ۵ ص ۲۳۶ نیز قاموس جغرافیہ از Barbier de Meynard۔ [4] ایضاً ج ۳ ص ۲۳ پیراگراف "سانیز"۔ [5] ایضاً ص ۲۳۱، دیکھو بلگونف: حوالۂ سابق ص ۹۹ ، ابن اسفندیار ترجمۂ براؤن: انڈکس نیز ص ۲۰۹ جہاں عبارت کی تصحیح یوں کی ہے "رستم بن شروین" اور ص ۲۲۳ کو نظر انداز کر دیتا ہے جہاں وہ شروین بن سرخاب سے تعرض نہیں کرتا۔

کا ایک حاکم تھا جس نے ۳۰۲ھ اور ۳۳۲ھ کے درمیان حکومت کی اور یہ بات صاف ہے کہ یہ ہمارے رستم کا باپ ہے[1] اب رہا ہزار گری، تو ابن اسفندیار کے دونوں قطعوں کے مقابلہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ ہزار جریب ہے یہ نام ان پہاڑیوں کو دیا گیا تھا[2] جو ساری سے فیروزکوہ تک کے راستہ کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہیں[3]۔ ابن اسفندیار یہاں سے آگے بیان کرتا ہے کہ سامانی استراباد سے آکر کاسپین سے گذرتا ہوا ساری تک پہنچا اور وہاں سے رے کی جانب ان پہاڑوں کا راستہ لیا جن کا مقام موجودہ تہران سے نزدیک ہے اس لئے شہریار یا قارن کی پہاڑیاں یہی ہیں جو فیروزکوہ کے شمال میں ایک سلسلہ جنوب مشرق و شمال مغرب سے مشرق کی طرف کافی ڈھلوان بناتی ہیں۔

آخر میں ابن اسفندیار کا بیان ہے کہ سامانی بخارا سے تیس ہزار آدمیوں کے ساتھ طبرستان، عراق اور طبرستان کے کوہی علاقوں کو فتح کرنے کے لئے نکلا ابونصر نے جو شہریار کی پہاڑیوں کا حاکم تھا راستہ روک لیا سامانی کو مجبوراً سید حسن (علوی) سے استدعا کرنی پڑی جنہوں نے اس کے پاس سفیر بھیجے اور بیس ہزار دینار کے بدلہ اس شرط پر چھوڑ دیا کہ سامانی خراسان لوٹ جائے[4]۔ بخارا سے رے کا راستہ استراباد ہو کر گذرتا ہے، یہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے جس کو ہم بہت پہلے کہہ آئے ہیں۔ بہرکیف یہ ممکن ہے سامانی پہاڑوں سے گذرتا ہوا کاسپین کی طرف بڑھنے کے بجائے فیروزکوہ کی طرف چلا گیا ہو اس صورت میں وہ اپنے سفر میں ہزار جریب سے دوچار نہ ہوا۔ یا پھر یہ واقعہ بعد میں پیش آیا جب کہ یہ نام، پہاڑیوں کے مرکز تک جنوب میں زیادہ مشہور ہوا۔ جہاں سے

---

[1] موسیو شفر: فارسی منتخبات جلد ۲ ص ۱۹۴ نوٹ ۱ (شائع کردہ مدرسۃ السنۃ شرقیہ حیہ، سلسلہ دوم ج ۸)

[2] ص ۱۸۵ اور ص ۲۳۸ [3] مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نقشہ میں مقامات بہت زیادہ مشرق میں ہیں Melgunof (حوالۂ سابق ص ۱۵) کا بیان کہ وہ ضلع جو علی آباد کو شامل ہے صاف زاویہ بناتا ہے جہاں سے ساری کا راستہ شروع ہوتا ہے اور تلار کی جھاڑیوں میں غائب ہو جاتا ہے۔

[4] حوالۂ سابق ص ۲۱۳

راستہ یوں گذرتا ہے: استراباد ــــ فیروزکوہ ــــ تہران؛ غرض شہریار کی پہاڑیاں بہت زیادہ شمال میں نہیں ہو سکتیں بلکہ فیروزکوہ سے مشرق میں ہیں اور دونوں راستوں میں بڑی مشابہت ہے۔ موجودہ نقشہ میں پہلا راستہ مجھ کو زیادہ واضح معلوم ہوتا ہے۔

(د) ابن اسفندیار کی عبارت کے کئی قطعوں میں شہریار کوہ یا جبل شہریار کا ذکر بطور ایک شہر کے ہوا ہے جو صرف فریم ہو سکتا ہے بطور مثال وہ شمار کرتا ہے (ص ۲۴۰) دامغان، شہریار کوہ، دماوند اور قزوین۔ یہ سب بلا شک و شبہ شہروں کے نام ہیں۔ یا وہ کہتا ہے (ص ۹۵) کہ فریم "کوہ قارن" کہلاتا ہے، جس کو وہ (جیسا کہ ہماری رائے ہے) شہریار کوہ سے تعبیر کرتا ہے۔ شہریار اور قارن ناموں کا ایک دوسرے سے تبادلہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ سب نام اس شہر کے متعلق موجودہ تحریروں میں فیروز کے بدلے میں مستعمل ہوئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فیروزکوہ اپنا (مستقل) وجود رکھتا ہو[1]۔ یہ اچھی طرح سمجھا جاتا ہے کہ شہریار، قارن، فیروز آدمیوں کے نام ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کی جگہ مستعمل ہوتے ہیں میں اس کو نظر انداز کرتا ہوں کہ ان میں سے کون نام فریم یا پریم (؟) کو بتاتا ہے۔ ابن اسفندیار اس کو دونوں طرح لکھتا ہے[2]۔

بہرکیف رستم بن شروین ۳۶۷ھ میں اور اسی طرح ۳۵۵ھ میں[3] فریم کا فرمانروا تھا ابن اسفندیار نے بظاہر غلط فہمی سے شروین کے دوسرے لڑکے شہریار کو شروین کا حقیقی جانشین سمجھا ہے اور رستم کا ذکر اس نے محض سرسری طور پر دو جگہوں میں کیا ہے جن سے ہم بہت جلد استفادہ کریں گے[4]۔ لیکن ہم پیرس کے مخطوطہ میں رستم کا ذکر ایک اور جگہ دریافت کر چکے ہیں جو مسٹر براؤن کے عمدہ ترجمہ میں موجود نہیں کیوں کہ اس ریمارک کو یا تو ابن اسفندیار

---

[1] جبل فریم، دیکھو طبری Chronique ایڈیشن De Goeje جلد ۳ ص ۱۵۲۹ [2] حوالہ سابق: ۹۹، ۱۲۰؛ [3] اس سکہ کی تاریخ جس کو فرائن نے شائع کیا [4] ص ۹۲، ص ۲۲۵ ایک، اور جگہ اس کے ذکر میں غلطی ہوئی ہے (ص ۲۰۹) اور وہ بہ آسانی ــ "شروین بن رستم" ــ کی جگہ "رستم بن شروین" پڑھتا ہے۔ جیسا کہ تاریخ ۳۱۱ھ ثابت کرتی ہے ہم اوپر اس غلطی پر تنبیہ کر چکے ہیں (نوٹ ۱۴)

نے نظامی کی عبارت پر اضافہ کیا ہے یا اس کے تکملہ نگار نے ۔ ترجمہ میں یہ عبارت چھوٹ گئی ہے کیوں کہ مترجم نے اصل کی طرف رجوع کیا ہے جس میں یہ عبارت موجود نہیں ۔ عبارت یہ ہے ـــــ "رستم بھی شہریار کا لڑکا تھا اور قابوس کے عہد میں کوہستان فریم اور شہریار کوہ میں باپ کا قائم مقام تھا"[1]

سکۂ مذکور کے ذریعہ ہماری دریافت ہے کہ رستم، شردین کا بیٹا ہے شہریار کا نہیں۔ جو عبارتیں ہم نقل کریں گے ان میں کافی تحقیق موجود ہے ۔ غرض رستم، حاکم یا صحیح لفظ میں فریم میں اپنے بھائی کا لفٹننٹ تھا۔ مزید یہ کہ وہ خود مختار بن بیٹھا کیوں کہ اپنے نام کا سکہ چلایا۔ چوں کہ سکہ میں اس کے بھائی کا ذکر نہیں اس لئے صاف ظاہر ہے کہ جس وقت یہ سکہ مضروب ہوا اس وقت رستم اپنے بھائی کی حکومت کے تحت میں نہ تھا۔

فرائن (Fraehn) کے مخطوطات میں ڈارن (Dorn) نے بڑا قیمتی انکشاف کیا ہے وہ یہ کہ یہ رستم مشہور خاتون شیریں کا جو فخر الدولہ بویہی کی بیوی اور مجد الدولہ کی ماں تھی، باپ ہے[2] یہ بیگم "بیگم سیدہ" کے نام سے مشہور ہوئیں اور انھیں کے نام سے رے کے مضافات میں دو جگہوں کا نام سید آباد مشہور ہوا[3] ۔ یہ سب حال یاقوت اپنے قاموس جغرافیہ (معجم البلدان) میں لکھتا ہے اور شیریں کے باپ کے ساتھ "اسپہبد" کا خطاب لکھتا ہے[4] ڈارن سوال کرتا ہے "کیا رستم شہریار کا بھائی ہے"؟[5] بھائی ہونے میں شک کی گنجائش نہیں کیوں کہ ابن الاثیر نے اسی رستم کا ذکر "قابوس کے ماموں"

---

[1] ورق ۱۵۳ شمارہ 1436 Supplement persan ـ "و رستم ہم پسر شہریار بود و در عہد قابوس قائم مقام پدر بود در کوہستان فریم و شہریار کوہ ـــ مرزا محمد خان کو اس عبارت سے غلط فہمی ہوئی ہے جس کا حوالہ انھوں نے مرزبان نامہ کے مقدمہ میں دیا ہے (گب میموریل ۸) ص۶ نوٹ ۲ [2] حوالۂ سابق: ۲۳۲
[3] حوالۂ سابق جلد ۳، ص۲۱۱ سطر ۳-۴ [4] فرائن کے یہاں سکہ پر یہ لکھا ہے: "رستم پسر شیرویہ"، پھر "پسر شردین" پیرس کے سکہ پر "شردین" لکھا ہے اور کوئی تاریخ نہیں۔ یہ سکہ ڈارن کے سوال کا اثبات میں جواب دیتا ہے
[5] سوال یہ ہے: کیا شردین اور شیرویہ ایک ہیں اور ایک ہی نام ہے؟

کے لفظوں سے کیا ہے"[۱]۔ قابوس کے اجداد کے بیان میں البیرونی اس کی تصدیق کرتا ہے
"...... کوہستان کے فرمانروا مخاطب بہ اسپہبدانِ طبرستان . . . کیونکہ اس کا ماموں
ہے اسپہبد رستم بن شروین بن رستم بن قارن بن شہریار بن شروین بن سرخاب بن
باو ......"[۲]

غرض یہ ہے کہ قابوس کا ہم عصر رستم باوی یا جیسا کہ ڈارن کا بیان ہے "شہریار، قابوس کا حقیقی ماموں ہے اور اس لئے رستم کا برادر حقیقی[۳]۔ سخت تعجب ہے کہ البیرونی باوندیوں کے سلسلۂ نسب کے بیان میں فرمانروا شہریار کا (جو شاید بڑا بھائی تھا) نام بالکل نہیں لیتا کہ باجگذار تھا اور لفٹننٹ۔

علاوہ ازیں رستم ایک اور شخصیت کا باپ تھا جس کی شہرت شیریں سے کچھ کم نہ تھی، یہ تھا مرزبان نامہ کا مصنف مرزبان، جیسا کہ ابن اسفندیار کی شہادت ملتی ہے، یہ اسپہبد کے خطاب سے سرفراز تھا[۴] اور البیرونی نے بھی خطاب عزار "اسپہبد جیلجیلان"

---

[۱] حوالۂ سابق ج ۸ ص ۵۰۶، سطر ۵۔ انڈکس میں غفلت کی وجہ سے ہر جگہ یوں لکھا ہے: "رستم برادر وشمگیر" عبارت میں کچھ اشتباہ نہیں۔ وکان قابوس اخوہ (اس کو پڑھنا چاہئے: اخو سپتون) زائر لخالہ رستم بجبل شہریار۔ دیکھو ابن اسفندیار: ص ۹۲ اور ص ۲۲۵۔ پیرس کے مخطوطہ کی عبارت اس دوسری عبارت کے مقابل میں یوں ہے: رستم بن شہریار بن شروین Suppl. persan. 1436 (ورق 1407)۔ اس غلطی پر ہم اشتباہ کر چکے ہیں (دیکھو نوٹ ۲۳)۔ [۲] تاریخ اقوام قدیمہ، ترجمہ سخاؤ (لندن، ۱۸۷۹ء) ص ۴۷۔ اصل متن (مرتبہ سخاؤ) ص ۳۹ سطر ۸-۱۱؛ (لیبسک ۱۸۷۸ء) [۳] حوالۂ سابق ص ۲۳۲۔ اپنے ظہیرالدین کے ایڈیشن کا حوالہ دیا ہے مقدمہ ص ۲۹ نوٹ ۱۔ جہاں ڈارن محمد بن الحسن [ابن اسفندیار] کی تبعیت میں فردوسی کا واقعہ بیان کرتا ہے یہی عبارت ہے جس کو مسٹر براؤن نے اپنے ترجمہ میں شامل نہیں کیا ہے، ص ۹-۲۳۸ اور اپنے ترجمۂ چہار مقالہ کا حوالہ دیا ہے۔ اسی جگہ (ص ۸۱) میں ڈارن کی نقل کردہ عبارت کو ہونی چاہئے مگر یہاں نہیں ملتی۔ پھر یہی عبارت ہے جس کو ابن اسفندیار (یا تکملہ نگار) نے اضافہ کیا۔ دیکھو مخطوطۂ پیرس ضمیمہ فارسی ۱۴۳۶ء ورق ۱۵۲ سطر ۱۲، ۱۳ نیز Ethe در ZDMG XLVIII ۱۸۹۴ء، ص ۲-۹۱، موافق مخطوطات لندن و آکسفرڈ۔ [۴] حوالۂ سابق: ص ۸۶ "اسپہبد مرزبان بن رستم بن شروین پریم"، مجھ کو یقین ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مرزبان فریم کا اسپہبد تھا! رستہ کے متعلق دیکھو Schefer: Chrest. persane ج ۲ ص ۱۹۷، اور مسٹر براؤن کا مقدمہ ایڈیشن مرزبان نامہ

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کے ساتھ خطاب کیا ہے اور اپنی ایک کتاب کو اس کے نام سے معنون کیا ہے[۱]۔ مرزبان، شیریں کا بھائی تھا اور مجد الدولہ کا ماموں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن الاثیر نے ۳۸۸ھ میں اس کو "سزاوار افواج رے" کے خطاب سے یاد کیا ہے[۲]۔ لیکن چند سطریں قبل مورخ نے رستم بن مرزبان کا ذکر کیا ہے جو مجد الدولہ کا ماموں تھا اور جنہوں نے شہریار کوہ پر حکومت کی[۳]۔ مگر مجھ کو یقین ہے کہ یہاں غلطی ہوئی ہے "مرزبان بن رستم" پڑھنا چاہیئے۔ یہ غلطی ابن اسفندیار کے یہاں دوبارہ ہوئی ہے جس نے ایک ہی واقعہ کو اسی رستم سے، اسپہبد شہریار کوہ کے عنوان سے، پھر رے سے نکلتے ہوئے "اسپہبد شہریار" کے عنوان سے متعلق کیا ہے[۴]۔

نسب کا یہ اختلاف دوسرے مصنفین کی توجہ سے اس وجہ سے رہ گیا کہ سب کے سب ابن اسفندیار کی غلط عبارتوں کے زیر اثر رہے[۵]۔ جب البیرونی اپنے ہم عصر شفیق مرزبان کو خطاب عزت دیتا ہے تو پھر یہ ناممکن ہے کہ مرزبان فریم کی چھوٹی آزاد ریاست میں اپنے باپ کا جانشین نہ ہوا ہو اور شاید اس نے اپنے نام کا سکہ بھی چلایا ہو۔ مرزبان ۳۶۷ھ کے بعد اپنے باپ کا جانشین ہوا جب اس کے فرمانروا چچا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) (مرتبہ مرزا محمد قزوینی، گب میموریل جلد ۸ لندن ۱۹۰۹ء) ص، iii x، لیکن مرزا محمد کا نظریہ (دیکھو ان کا مقدمہ ص۶) کہ رستم، شہریار بن شروین کا بیٹا تھا، قبول نہیں کیا جا سکتا وجوہ قبل بیان ہو چکے ہیں۔ دیکھو نوٹ ۲۳، ۲۷۔ [۱] ایڈیشن سخاؤ، مقدمہ ص۴ سطر ۱۵-۱۶ دیکھو ترجمہ ص۳۸۱ (نوٹ ص۴۲ سطر ۳-۲)۔ [۲] حوالہ ابن الاثیر، ج ۹ ص۹۹ سطر ۲۰ (انڈکس: رستم بن شہریار (المرزبان)۔ ابن خلدون: ج ۴ ص۴۹۰ سطر ۱۸ (بولاق ۱۲۸۴ھ) [۳] ایضاً: سطر ۲، ۳، ابن خلدون، ایضاً سطر ۸، تاریخ سامانیاں از میر خوند: پیرس ۱۸۴۵ء ص ۲۱۲ نوٹ ۱۰۸۔ [۴] حوالہ سابق ص۲۲۸ س۳۳، ص۲۳۱ ایک ہی عبارت دہرائی گئی ہے، ص۲۳۹ دوبارہ۔ [۵] مجھ کو یقین ہے کہ یہ عبارتیں درحقیقت ابن اسفندیار سے تعلق نہیں رکھتیں، مجھ کو ریو کی رائے سے اتفاق ہے (فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم (۱، ص۲۰۳) کہ چوتھی فصل ایک دوسرے مصنف کا اضافہ ہے، اس طرح ناموں کی مختلف غلطیوں اور بادشاہوں کی تاریخ کے اعادہ کی وجہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسی عبارت سے ریو کو یقین ہے کہ یہ پچھلی فصل ابن اسفندیار کی طرف منسوب ہے ——

شہریار بن شروین نے اس کو نکال باہر کیا تو اپنے بھانجے مجد الدولہ کی مدد سے دوبارہ تخت نشین ہوا، جب دوبارہ اپنے برادر زادہ شہریار (سوم) سے شکست اُٹھائی تو رے میں پناہ گزیں ہوا جہاں سے مجد الدولہ نے اس کو دوسرے شہریار کے مقابلہ کو بھیجا، جنگ کی اور دوسرے شہریار کو گرفتار کیا۔ ان واقعات کو ابن اسفندیار اور ابن الاثیر نے مجد الدولہ کے ماموں کی طرف منسوب کیا ہے جو پہلے برابر رستم اور پھر کبھی رستم کبھی مرزبان کے نام سے مذکور ہوا ہے۔ بہر کیف نسبتِ پدری آخر الذکر (مرزبان) ہی کی نسبت سے ثابت ہے کیا یہ اقرار کیا جا سکتا ہے کہ بغیر کسی لڑکے کے وجود کے باپ بیٹے میں اشتباہ پیدا ہو جاتے؟ بظاہر یہ ناممکن نہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ضروری نہیں ہے۔

مزید برآں ابن الاثیر کا بیان ہے کہ ۴۰۷ھ ہجری میں اسپہبد فریم میں مقیم تھا اور ابن فولاذ[1] جس کا تعلق مجد الدولہ اور اس کی ماں (شیریں) کے ساتھ ایک بغاوت کے مقابلہ میں رہ چکا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس کا مقابلہ (اسپہبد فریم) مرزبان ہی سے رہا ہوگا۔

ذیل کا چھوٹا سا نقشہ، میرے خیال میں، گذشتہ بحثوں کا خلاصہ پیش کرتا ہے

شروین

- ایک لڑکی (وشمگیر کی بیوی)
- رستم (۳۵۵ - ۳۶۷ھ)
  - مرزبان (۳۸۸... ۴۰۷) ؟
    - رستم (؟)
  - دارا (۳۷۴ - ۳۸۲ھ)
    - شہریار (۳۸۲ - ۳۹۷ھ)
  - شیریں (فخر الدولہ کی بیوی)
    - مجد الدولہ
- شہریار (۳۳۷ - ۳۴۷ھ)

---

[1] حوالۂ سابق جلد ۹ صـ ۱۰۸ سطر ۱۷۔
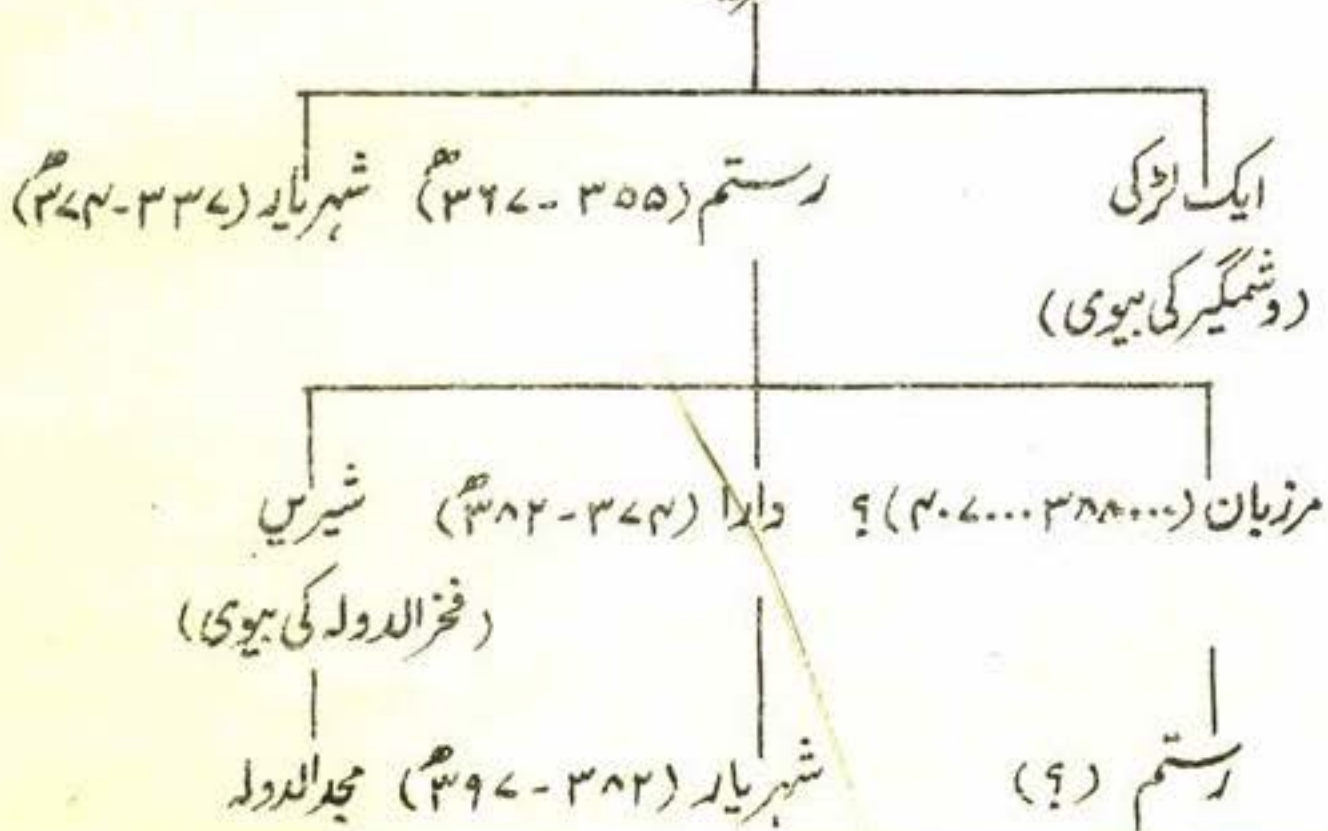
یہ ہے دارا کا ذکر جو باوندیوں کی دوسری کرسی میں ہے[1]۔

نقشہ میں خاندان کے بڑے بڑے سرداروں کی تاریخیں اور سنین ڈارن (Dorn) اور ملگونوف (Melgunof) کے بیان کردہ ہیں لیکن ان میں سے کسی نے اپنے نقشہ میں اُن مآخذ کا صاف پتہ نہیں دیا ہے جن کی مدد سے سنین کا تعین کیا گیا ہے۔ ڈارن کا بیان ہے کہ شہریار بن دارا کی حکومت کا زمانہ ۳۵ سال ہے لیکن یقینی طور پر لکھتا ہے کہ وہ ۳۹۶ھ میں مرا۔ اس مشکل کے حل کے لئے اس نے باوندیوں کے سلسلہ سے تعلق رکھنے والے سارے متوں کی طرف رجوع کیا ہے اور عہد حکومت کے تعین کے لئے سارے سنین سے بحث کی ہے جن کی تفصیل اس مضمون کے حدود سے باہر ہے۔

اب صرف فریم کے سکہ کی چند خصوصیات کا تذکرہ میرے ذمہ باقی رہ گیا ہے۔

جس سکہ کو فرائن[2] نے شائع کیا اس کی تاریخ ۳۵۵ھ ہے اس کی ایک جانب خلیفہ المطیع اور رکن الدولہ کے نام ہیں۔ دوسری جانب شیعوں کے مقولہ: "علی ولی اللہ" کے ساتھ رستم بن شروین [کبھی پڑھا گیا شرویہ]۔ ٹیزنہازن (Tiesenhausen) نے مجھ کو ایک دوسرے درہم کے متعلق اطلاع کی جس کی تفصیل ایرڈمان (Erdmann) نے (Numi Asiatici, p. 233) اور بہت سی اصلاحوں کے ساتھ اپنے مخطوطات کی دوسری جلد میں فرائن نے بیان کی ہے اس درہم پر بھی خلیفہ اور بویہی سلطان کے نام ہیں، سیدھی جانب کنارے میں "ضرب در فریم" کے بعد "باھر رستم" پھر تاریخ ۳۶۱ھ

---

[1] ڈارن: حوالۂ سابق ص۲۳۳، ملگونف: حوالۂ سابق ص۹۸، ابن اسفندیار ص۲۳۹ میں دارا کا نام لیتا ہے لیکن رشتہ کا ذکر نہیں کرتا، انڈکس میں کوئی ذکر نہیں؛ "ابن شہریار بن شروین" ظہیر الدین جو ایک پچھلے باوندی کا نسب پیش کرتا ہے (ایڈیشن ڈارن ص۲۷۰-۲۷۱) وہ حسب ذیل ہے: "دارا ابن رستم بن شروین بن رستم بن سرخاب بن قارن بن شہریار بن قارن بن شروین بن سرخاب بن باو وغیرہ" دارا کا باپ یقیناً رستم ہے جس کو البیرونی نے اپنے نسب نامہ میں بیان کیا ہے (دیکھو نوٹ ص۲۸)

[2] تفصیل کے لئے دیکھو اصل مضمون (عجب نامہ) [3] خط مذکور ص۲

درج ہے۔ شیعی مقولہ جیسے پہلے میں ہے ویسے ہی اس میں بھی موجود ہے۔ پیرس کا سکہ خلیفہ المطیع (؟) کے نام اور عضد الدولہ ابو شجاع و مؤید الدولہ ابو منصور کے ناموں کے ساتھ شیعی مقولہ اور "رستم بن شروین" پر مشتمل ہے۔ ان سکوں سے ظاہر ہے کہ رستم نے آل بویہ کی حکومت کی اطاعت کی۔

اس موضوع پر فراین کا بیان یہ ہے کہ رکن الدولہ نے ۳۵۱ھ میں طبرستان اور جرجان کو فتح کیا یہ مقامات بعد میں زیاریوں کو واپس مل گئے[1]۔ ۳۶۶ھ میں رکن الدولہ اپنی حکومت اپنے بیٹے عضد الدولہ کے سپرد کر کے رے میں مر گیا، آخر الذکر نے اپنے بھائی فخر الدولہ کو شہر رے سے نکال باہر کیا اور اپنے دوسرے بھائی مؤید الدولہ کو سپرد کیا۔ یہ بیان ہے ابن خلدون[2] اور ابن اسفندیار دونوں کا۔ فخر الدولہ بھاگ کر قابوس کے پاس چلا گیا جس نے اپنے ماموں رستم کے ساتھ جنگ کی۔ لیکن ہمارا سکہ ثابت کرتا ہے کہ رستم بخوشی یا بہ مجبوری عضد الدولہ اور مؤید الدولہ فاتح استراباد کے ساتھ رہا اس کی تصدیق ابن الاثیر کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ "۳۶۷ھ میں قاضی عبد الجبار بن احمد معتزلی ولایت رے اور مؤید الدولہ کے ماتحت قلمرو کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے[3]"۔ اسی مورخ کا دوسرا بیان یہ ہے کہ ۳۶۶ھ میں عضد الدولہ نے اپنے بھائی فخر الدولہ کو (وزیر ابو الفتح ابن العمید کی گرفتاری کا) حکم دیا۔ یا یہ مؤید الدولہ تھا جس نے اس حکم کی تعمیل کی[4]۔ میرے خیال میں مصنف نے "فخر" کو "مؤید" سے صحیح کرنا چاہا ہے۔ اس کے بعد وہ اس شہر اور طبرستان کا حاکم رہا یہاں تک کہ ناگاہ ۳۷۳ھ میں مر گیا۔

۳۶۷ھ کا درہم ہمارے لئے اعلیٰ تدریجی ترقی کے ساتھ نظام اقطاعی (Fudal Sys stem) کی جو اس عہد کے مسلمان ریاستوں میں قائم ہو چکا تھا، عجیب مثال ہے، خلیفہ فرمانروائے

---

[1] ڈارن: ص ۲۳۲ Bemer Kung en [2] حوالہ سابق ج ۴ ص ۱۵۴ [3] ص ۲۲۵
[4] ابن الاثیر: ج ۸ ص ۵۱۰، ص ۵۱۱ [5] ایضاً: ص ۴۹۶

روحانی، عضد الدولہ فرمانروائے وقت، مؤید الدولہ اول ماتحت حاکم اور رستم دوسرا ماتحت حاکم۔ فریم رے کی خودمختار ریاست میں شامل تھا۔

رستم کے سکوں پر شیعی مقولہ کے وجود کے متعلق فرائن کے بیانات جن کو ڈارن نے دہرایا ہے[1] لنڈبرگ کے بیانات سے زیادہ درست ہیں جن پر دفریمیری (defremery) نے معقول تبصرہ کیا ہے[2]۔ یہ کم تعجب کی بات نہیں کہ ایسا مقولہ ایسی جگہ کے سکہ پر نقش ہو جہاں عباسی خلیفہ اتنا اقتدار رکھتا ہو۔ فرائن کا بیان ہے "باوندی علویوں کے بڑے جاں نثار تھے"۔ یہ یقینی امر ہے۔ لیکن خود آل بویہ یا ان کے کسی فرد نے کبھی علویوں کے فدائی ہونے کے باوجود، اس طرح کا جذبہ ظاہر نہیں کیا کہ اپنے سکوں پر اس طرح کا مقولہ نقل کرتے۔ مجھ کو یقین ہے کہ یہ ایک عدیم النظیر مثال ہے اور اس مشکل کے حل کے لئے، درحقیقت مجھ کو کوئی تشفی بخش صورت نظر نہیں آتی فقط۔

ہم اپنے مضمون "البیرونی اور اصفہبد جیلجیلان مرزبان بن رستم" کے خاتمہ میں عرض کر چکے ہیں کہ شہریار کوہ اور قارن کوہ سے ایک ہی کوہستانی سلسلہ مراد ہے جیسا کہ حدود العالم کی شہادت ثابت کرتی ہے پس کازانوا کا یہ عندیہ کہ شہریار کوہ پر کوہ قارن کا اطلاق کیا جاتا ہے درست اور ناقابلِ تردید ہے لیکن فریم کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کا یہ بیان کہ اس سے وہی مقام مراد ہے جو دماوند کے نزدیک فیروزکوہ کے نام سے مشہور ہے، حسب تحقیق محمد بن عبدالوہاب قزوینی غلط ہے۔ فریم کی صحیح نشان دہی رابینو کے یہاں ملتی ہے۔ مفصل بحث اور حوالجات کے لئے دیکھو جہاں کشائے جوینی جلد ۳ (حواشی ص ۳۸۱ - ۳۸۶) گب میموریل سنہ ۱۶ ۔ ۱۹۳۷ء۔

مرزبان بن رستم اور رستم بن مرزبان کے مختلف ناموں کو کازانوا مؤرخین کے سہو

---

[1] دیکھو نوٹ ۲۸ [2] حوالۂ مذکور۔ لنڈبرگ کا خیال ہے کہ رستم علوی تھا اور فخر الدولہ اس کا سرپرست

پر محمول کرتا ہے اس کا عقیدہ اس باب میں یہ ہے کہ مجد الدولہ بویہی کا ماموں مرزبان بن رستم تھا جس کو مؤرخین نے رستم بن مرزبان کا نام دیا ہے۔ اس خیال کی تردید ہم اپنے مضمون میں بہ صراحت کر چکے ہیں۔

کازانوا کا یہ نظریہ کہ مرزبان بن رستم (رستم بن مرزبان ؟) کا مقابلہ کبھی شہریار بن شروین اور کبھی شہریار بن دارا بن رستم سے رہا ہمارے نزدیک قبول نہیں کیا جا سکتا کہ اول الذکر شہریار کا ۳۵۸ھ کے بعد طویل مدت تک زندہ رہنا کسی تاریخی سند سے ثابت نہیں مضمون محولہ بالا میں اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

پیرس کا سکہ بابت ۳۶۷ھ ہجری جس کا انکشاف کازانوا کرتا ہے اس پر خلیفہ المطیع کا نام نہیں ہو سکتا کہ باتفاق مؤرخین المطیع ۳۶۳ھ کے اواخر میں مفلوج ہوا اور ترکی امیر سبکتگین کے اشارہ پر خلافت سے دست بردار ہو گیا۔ جب سے ۳۸۱ھ تک اس کا فرزند ابو الفضل عبد الکریم الطائع تخت خلافت پر متمکن رہا۔ لیکن کازانوا کا بیان یہی ہے کہ اس سکہ پر المطیع کا نام تھا، ہمیں یقین ہے کہ عباسی خلیفہ کے نام میں کازانوا سے سہو ہو گیا ہے۔

العلم والعلما

یہ جلیل القدر امام حدیث علامہ ابن عبد البر کی شہرۂ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے، مترجم کتاب مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی اس دور کے بے مثال ادیب اور مترجم سمجھے جاتے ہیں موصوف نے یہ ترجمہ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا جو اب ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے۔ علم اور فضیلت علم کے بیان، اہل علم کی عظمت، اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی، اس متبرک کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے، ایک زبردست محدث کی کتاب اور ملیح آبادی صاحب کا ترجمہ موعظتوں اور نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک دفعہ ضرور پڑھئے۔ صفحات ۳۰۰، بڑی تقطیع

حکمراں طبقہ اسلام کی نظر میں

از

(جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی)

(۲)

حدیثوں کا میں نے عموماً ترجمہ پیش کیا ہے، مگر جہاں الفاظ پیش کئے گئے ہیں وہاں آپ دیکھ چکے ہیں کہ ذمہ داری میں غفلت کے سلسلہ میں "غان" (خیانت) کا لفظ لایا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، یہ ایک طرح کی امانت ہوتی ہے، اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ والی حدیث میں تو صراحتاً امانت کا لفظ ہی لایا گیا ہے۔

انها امانة وانها يوم القيامة خزى وندامة (مشکوٰۃ) — بے شک ذمہ داری ایک امانت ہے اور وہ قیامت کے دن رسوائی اور ندامت ہے،

اس "امانت" کے لفظ سے حکومت کے شعبوں کی اہمیت اور ذمہ دار کی حیثیت کو اُجاگر کیا گیا ہے، تاکہ صحیح طور پر اس شعبہ کے حقوق ادا کرنے کی طرف توجہ ہو، اور ان حقوق میں غفلت و کوتاہی اور ناجائز تصرف پر تنبیہ ہو سکے، امانت کی اہمیت پر تفصیل میں گئے بغیر عرض کردوں گا کہ خدانخواستہ اس میں خدا ترسی سے کام نہ لیا گیا، تو پھر خیر نہیں، نبی کریم صلعم کا ارشاد ہے

اذا ضيعت الامانة انتظر الساعة قيل يا رسول الله وما اضاعتها قال اذا وسد الامر الى غير اهله فانتظر الساعة (السياسة الشرعية ص عن البخاري) — جب امانت برباد کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو، کہا گیا یا رسول اللہ اس کی بربادی کیا ہے؟ فرمایا جب کہ کام اس کے نااہل کے سپرد کر دیا جائے تو اس وقت قیامت کا انتظار کرو۔

خلفائے راشدین کی پوری زندگی شاہد ہے کہ انھوں نے کس صداقت کے ساتھ اپنے دور خلافت میں حکومت کے فرائض انجام دیئے اور دنیا کو سبق دے گئے، اپنی ذمہ داری سے ایک لمحہ کے لئے چشم پوشی نہیں فرمائی، اور وہ ہمیشہ اپنے خدا سے لرزاں و ترساں رہے حضرت عمرؓ جب عاملوں کو بھیجتے تو یہ زرّیں ہدایت فرماتے

ان لا ترکبوا برذونا ولا تاکلو نقیاً ولا	عمدہ گھوڑے پر نہ سوار ہونا، اور نہ میدہ کھانا،
تلبسوا رقیقا ولا تغلقوا ابوابکم دون	نہ باریک کپڑا استعمال کرنا، اور نہ ضرورت
حوائج الناس فان فعلتم شیئاً من	مندوں پر اپنا دروازہ بند کرنا، اگر تم نے ان میں
ذالك فقد حلت بکم العقوبة	سے کوئی بات کی، تو تم پر عقوبت اور سزا نازل
(مشکوۃ کتاب الامارۃ)	ہوگی۔

اس کا منشا یہ تھا کہ تم تعیش کی زندگی نہ اختیار کرو، کبر و نخوت، ٹیپ ٹاپ، اور تعلّی و ترفع سے اپنے آپ کو بچاؤ، حکّام قوم کے لئے ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں، اگر ان میں کوئی گندی بیماری پھیلی اور اس کی روک تھام نہ ہوئی، تو اس کا اثر پورے ملک پر پڑنا ناگزیر ہے، اور پھر یہ حکومت کے کارندے ملک میں اصلاح کا سبب ہونے کے بجائے فساد کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ　غالباً اس لئے بھی عمّال کو ان چیزوں سے روکتے تھے، کہ عمال و حکام میں پبلک سے امتیازی شان پیدا کرنے کا شوق پیدا نہ ہو، اور قوم کے خادم ہونے کے بجائے مخدوم بننے کا جذبہ پرورش نہ پائے، یہ عمال اور کارندے تو اپنی جگہ رہے ان کے سب سے بڑے افسر یعنی امیر تک قوم کے خادم ہوتے ہیں مخدوم نہیں ہوتے یعنی وہ اپنے کو مخدوم سمجھنے کا حق نہیں رکھتے اور یہ اسلام کی ایک امتیازی شان ہے کہ وہ کسی حال میں عدل و مساوات کا دردی سے خون ہوتے پسند نہیں کرتا،

"جنگ قادسیہ" کے موقع پر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بحیثیت سفیر رستم کی فرودگاہ میں پہنچے تو رستم نے اسلامی سفیر کو مرعوب کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا کہ خود بیچ دربار میں ایک سونے کے تخت پر جواہرات کا تاج سر پر رکھ کر بیٹھ گیا، اور یہاں سے وہاں تک دو رویہ زرنگار پردے لٹکائے، ریشم

کے نفیس فرش بچھوائے، درباریوں کو سج دھج کر ادھر ادھر بٹھایا، اور خدام کو دو رویہ کھڑا کر دیا، مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی اس ظاہری نمائش سے کب مرعوب ہوتا، حضرت مغیرہؓ گھوڑے سے اُترے اور سیدھے رستم کے پاس پہنچ گئے اور اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے، ان کی اس جرأت پر سارا دربار حیرت زدہ رہ گیا، اور شاہی آداب کے خلاف سمجھا، چنانچہ ایک آدمی بڑھا اور حضرت مغیرہؓ کو تخت سے اُتار دیا، یہ دیکھ کر حضرت مغیرہؓ نے برجستہ فرمایا جو سننے کے لائق ہے۔

"اے سردارانِ ایران! ہم تو تم کو عقل مند سمجھتے تھے، لیکن تم بڑے بے وقوف نکلے، ہم مسلمان بندوں کو خدا نہیں بنایا کرتے، اور کمزور انسانوں پر طاقت ور لوگوں کی آقائی کے قائل نہیں، ہمارا خیال تھا، کہ تمہارے ہاں بھی یہی دستور ہوگا، بہتر یہ تھا کہ تم ہمیں پہلے ہی بتا دیتے، کہ تمہارے یہاں کمزور طاقت ور کی پرستش کرتے ہیں، اور انھیں دیوتا بنا کر اونچی جگہ بٹھاتے ہیں، انسانی مساوات کا اصول تمہیں تسلیم نہیں، اگر یہ بات مجھے پہلے معلوم ہو جاتی، تو میں ہرگز تمہارے دربار میں نہیں آتا، خیر اب تو میں آگیا، لیکن تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ سلطنت قائم رہنے کے یہ ڈھنگ نہیں، زیردستوں کی بے قراری تمہارے اقتدار کی بساط الٹ دے گی"[1]

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام کا نظریہ حاکم و محکوم کے بارے میں کیا ہے، اور اسلام حکومت کے فرمانرواؤں کو کس ڈھنگ سے زندگی گذارنے کی تعلیم دیتا ہے،

اس سلسلہ میں عہدِ صحابہ کا ایک واقعہ سننے کے لائق ہے، علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ نے نقل کیا ہے کہ ابو مسلم خولانی رح حضرت معاویہ بن ابو سفیانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہا

السلام علیک ایھا الاجیر (اے مزدور تم پر سلامتی ہو)

لوگوں نے کہا یہ آپ کیا کہتے ہیں، یوں کہیئے " السلام علیک ایھا الامیر" یہ سن کر ابو مسلم خولانی نے پھر دھرایا " السلام علیک ایھا الاجیر"

لوگ بار بار اصرار کرتے رہے کہ " ایھا الامیر" سے خطاب کیجئے، مگر یہ ہمیشہ " ایھا الاجیر"

---

[1] تاریخ ملت ج ۱/۲۲۱ اس واقعہ میں یہ بھی ہے کہ ایرانیوں نے سن کر کہا " قسم خدا کی اس عربی نے بات تو سچی کہی" ۱۲

ہی سے خطاب کرتے رہے، حضرت معاویہؓ جو اس ردوکد کو سن رہے تھے فرمایا، "ان کو چھوڑ دو جو کچھ کہتے ہیں، اسے اچھی طرح جانتے ہیں" اب ابو مسلم خولانی نے تشریح فرمائی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرکے فرمایا

"آپ مزدور ہیں، ان بکریوں (مخلوق) کے رب نے آپ کو ان کی حفاظت کے لئے اُجرت پر مقرر کیا ہے، اگر آپ نے ان بکریوں کے مرض کی دیکھ بھال کی اور جو بیمار ہیں ان کا دوا علاج کیا اور ان میں سے ایک کی زیادتی کرنے کو دوسرے پر رد کا، تو ان بکریوں (مخلوق) کا مالک آپ کو پورا پورا اجر عطا کرے گا، اور اگر آپ نے ان باتوں میں سے کوئی ذمہ داری نہ ادا کی، تو مالک سزا دے گا" [1]

اس واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ والی اور امیر اجیر ہوتا ہے، اور وہ انسانی مساوات میں کسی امتیاز کا مستحق نہیں، جو حکمراں اپنے کو عوام کی گردن کا مالک سمجھتے ہیں، وہ سراسر فریب میں مبتلا ہیں، خلافت راشدہ کی تاریخ گواہ ہے کہ دور راشدہ کے امراء خلفاء اور تمام ذمہ دار حضرات نے ملی جُلی زندگی گزاری، اور کبھی اپنے کو عوام سے رہن سہن میں ممتاز نہ ہونے دیا۔

حکمراں طبقہ میں جس کا عہدہ سب سے اونچا ہوتا ہے۔ وہ خلیفہ کہلاتا ہے، خلیفہ کے فرائض کیا ہیں، احکام السلطانیہ کے حوالہ سے ہم یہاں نقل کرتے ہیں، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، کہ وہ قوم و ملک کا خادم ہے یا مخدوم،

علامہ ماوردی لکھتے ہیں کہ خلیفہ کے حسب ذیل دس فرائض ہیں

(۱) "دین کی حفاظت، . . . . اگر کسی شخص کے مذہب میں کوئی بدعت نکالی، یا کوئی متشکک اس سے علیحدہ ہوگیا، تو خلیفہ کو چاہیئے کہ وہ دلائل سے اس کے شبہ کو دور کردے، جو حق بات ہے وہ اس کے ذہن نشین کردے، اور فرائض و منہیات پر اسے کاربند کرے، تاکہ دین میں کوئی خلل اور امت لغزشوں سے محفوظ رہے،

(۲) جھگڑنے والوں میں احکام شرعیہ نافذ کرے، اور مخاصمتوں کا فیصلہ کرے، تاکہ انصاف

---

[1] السیاسۃ الشرعیہ صفحہ ۵ و صفحہ ۶

کا دور دورہ ہو، کوئی طاقت دردستِ تعدی دراز نہ کرنے پائے، اور کوئی مظلوم نہ بنے۔

(۳) ملک کی حفاظت کرے، اور دشمن سے اسے بچائے، تاکہ تمام لوگ اطمینان سے اپنی زندگی کے کاروبار میں مصروف ہوں، اور بغیر جان و مال کے خطرے کے اطمینان سے سفر کر سکیں

(۴) حدودِ شرعیہ کو قائم کرے، تاکہ جن باتوں کو اللہ نے محارم قرار دیا ہے، ان کا کوئی شخص ارتکاب نہ کرے، . . . .

. . . .

نیز اس کے بندوں کے حقوق تلف و برباد نہ ہونے پائیں۔

(۵) سرحدوں کی پوری طرح حفاظت کرے، کہ دشمن کو اس میں اچانک دراندازی کا موقع نہ رہے، تاکہ مسلمانوں اور ذمیوں کی جانیں محفوظ رہیں۔

(۶) پہلے اسلام کی دعوت دے، نہ ماننے پر مخالفینِ اسلام سے جہاد کرے، تاکہ وہ مخالفین یا تو اسلام قبول کریں، یا ذمی بن جائیں (یعنی اسلامی حکومت کو تسلیم کر کے اپنے مذہب پر باقی رہیں)

(۷) خوف، جبر اور زیادتی کے بغیر احکامِ شرعیہ اور اجتہادِ فقہی کے مطابق خراج و صدقات وصول کرے۔

(۸) بیت المال سے مستحقین کے لئے وظیفے اور تنخواہیں مقرر کرے، نہ اس میں اسراف ہو، نہ امساک، اور یہ وظیفے اور تنخواہیں مستحقین کو بلا تقدیم و تاخیر وقت پر دی جائیں۔

(۹) دیانت داروں کو اپنا قائم مقام، اور قابلِ اعتماد لوگوں کو حاکم و عامل مقرر کرے، اور خزانے کو ایسے ہی لوگوں کے سپرد کرے، تاکہ انتظام قابل لوگوں سے مضبوط ہو، اور خزانے دیانت داروں کے قبضہ میں محفوظ رہیں۔

(۱۰) خود تمام امورِ سلطنت کی نگرانی کرتا رہے، اور تمام واقعات سے باخبر رہے تاکہ امت کی پاسبانی اور ملت کی حفاظت وہ خود کر سکے، اور عیش و عشرت یا عبادت میں مشغول ہو کر اپنے فرائض دوسروں کے حوالے نہ کر دے، کیوں کہ ایسی صورت میں دیانت دار بھی خیانت کرنے لگتا ہے، اور وفادار بہی خواہ کی نیت میں بھی فرق پڑ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

الا لضعفائکم (السیاسۃ ص۱۵)

یہ انتہائی درجہ کی خیانت ہے کہ حکمراں طبقہ کسی غیر مستحق پر ہزاروں روپے بے دریغ خرچ کرے اور مستحقین کو ان کے واجب حقوق سے محروم رکھے یا بڑوں کی مصیبت میں ان کے کام آئے اور غریب یا کوئی مزدور آئے تو اس کو اپنی کوٹھی میں داخلہ تک کی اجازت نہ دے۔

اسلام ان زیادتیوں کو ایک منٹ کے لئے برداشت نہیں کرتا، اور نہ ایسے خائن، بددیانت حکمراں کی حکمرانی گوارا کرتا ہے، حدیث میں آیا ہے کہ رب العالمین تین آدمیوں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھے گا، ان میں سے ایک جھوٹا سلطان بھی ہے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل و مساوات اور تواضع کا حال یہ تھا، ادنیٰ سے ادنیٰ آکر بات چیت کر سکتا تھا اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا تھا اور پاتا تھا، ایک لونڈی بھی آتی اور کہتی مجھے فلاں کام ہے کرا دیجئے، اس کے ساتھ ہو لیتے اور کام انجام دلا دیتے[۱]۔

کبر و نخوت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، اسلام نے تو تواضع کی تعلیم دی ہے، تکبر اور اپنے آپ کی بڑائی سے سختی کے ساتھ روکا ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے

ان اللہ اوحی الیّ ان تواضعوا حتی	اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی فرمائی ہے کہ تم سب تواضع
لا یفخر احد علی احد ولا یبغی احد	اختیار کرو، نہ کوئی کسی پر فخر کرے اور نہ کوئی کسی
علی احد۔ رواہ مسلم (ریاض الصالحین ص۲۹۵)	پر زیادتی۔

اس حدیث کے رہتے ہوئے حکمراں طبقہ میں کوئی اگر فخر و غرور سے اپنا سر اونچا کرے، تو اس سے بڑھ کر نادان کوئی نہیں۔

جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ بات اچھی طرح اجاگر ہو چکی ہوگی، کہ حکمراں طبقہ اسلام کی نگاہ میں بڑی ذمہ داری کا مالک ہے اور یہ رب العزت کے سامنے اپنی ذمہ داری کا جواب دہ ہے، اس طبقہ کا فریضہ ہے کہ ملک میں امن و امان، اطمینان و سکون، اور صلح و آشتی کی فضا پیدا کرے قوم اور ملک کی ترقی اور فلاح و بہبودی کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے، اور ملک میں عدل و

[۱] ریاض الصالحین ص۲۹۵

مساوات، اور اخلاق و اعمال کی پاکیزگی قایم کرے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہمیشہ اسکے سامنے رہے۔

الامام راع ومسئول عن رعیتہ — امام نگراں ہے اور اس سے اپنی رعیت کے

متفق علیہ (ریاض الصالحین ص۳۱۵) — متعلق پوچھا جائے گا۔

اس قسط کو اسی پر ختم کیا جاتا ہے، زندگی نے وفا کی تو پھر کبھی بقیہ امور پیش کرنے کی سعی کی جائے گی

السعی منی والاتمام من اللہ۔

بزم مملوکیہ

از

(جناب مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی لکچرر تاریخ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

(۲)

شاعر کی وطنی نسبت "تولکی" کی بابت مؤلف نے کوئی صاف بات نہیں کہی ہے۔ تذکرہ روز روشن یا پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے خیال کا حوالہ دے دینا ناکافی ہے۔ جب کہ ان کے خیال سے مؤلف کو خود اتفاق نہیں۔ مؤلف کی تحقیق اس سے زیادہ نہیں کہ "غالباً تولکی صحیح ہے جو شاید دیلم میں کوئی قصبہ ہے۔" (ص ۴۰۳) مؤلف کو مجمع الفصحا کے بیان پر غور کرنا تھا پھر ان کو معلوم ہو جاتا کہ بلادِ دیلم میں تولک نام کا کوئی قصبہ فرض کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ پروفیسر شیرانی مرحوم کا خیال صحیح ہے۔ تولک غور و غرجستان کے حدود میں اپنے حصار کے لئے مشہور رہا ہے۔ تاریخ سیستان میں اس کا ذکر دوبار آیا ہے (ص ۳۹۵ : در رفتن ملک نیالتکین بجانب گرم سیر و غور تا حد تولک و اسفزار الخ ایضاً ص ۴۰۲ چاپ تہران ۱۳۱۴ شمسی) جہانکشائے جوینی میں ایک جگہ مذکور ہوا ہے (ج ۱ ص ۱۰۴ تذکار جب) اور اس کا مفصل ذکر منہاج السراج نے طبقات ناصری میں "حدیث واقعات غور و غرجستان و نیروز کوہ" کے تحت کیا ہے خود منہاج سراج اہلِ تولک کے کے ساتھ ہو کر مغلوں سے نبرد آزما ہوا تھا یہاں اس کے دو فقرے درج ہیں:

الف　"اما قلعۂ تولک، ملک مبارزالدین حبشی نیزہ ور از جہت سلطان محمد خوارزمشاہ طاب ثراہ ملک تولک بود۔ و قلعۂ تولک حصارے است معلق بایچ کوہ پیوند ندارد و بنیاد آں قلعہ از منوچہر است۔" (طبقات: ص ۳۶۱ کلکتہ)

ب　"و ایں کاتب کہ منہاج سراج است دریں چہار سال در غزوات با اہلِ

تولک موافقت می نمود کہ ہمہ اقربا و اخوان بو دند و بعافیت از دست کفار بسلامت ماند"

(طبقات : ص ۳۶۳ کلکتہ)

مزید تفصیل کے لئے مؤلف کو طبقات ناصری کے صفحات (ص ۳۶۱ تا ص ۳۶۴) کی طرف رجوع کرنا چاہیئے حیرت اس پر ہے کہ مؤلف نے خود صاحب طبقات ناصری کے تذکرہ میں تولک کا ذکر کئی بار کیا ہے اس کے باوجود عمید کے ذکر میں تولک کو دیلم کا قصبہ فرض کرتے ہیں (ص ۴۱، ۴۲)

عمید کا وہ قصیدہ جس کی ردیف ناخن ہے اور جس کے متعلق سطور بالا میں ظاہر کیا جاچکا ہے کہ ناصر الدین محمود بغرا خاں کی شان میں ہے اس کے حسب ذیل شعر میں ایک تصحیح کی بابت مؤلف کے خیال سے مجھے اختلاف ہے :

چو انگشتے کہ گر خواہد بحکم نیزۂ ہندی نشاند در ضمیر آہن و قلب خنجر ناخن

حواشی میں مؤلف کی یہ تصریح ملتی ہے ـــــ "رین کنگ نے "قلب ہجر" صحیح بتایا ہے لیکن میرے خیال میں "قلب خنجر" ہی صحیح ہے" ـــــ (ص ۱۹۰) راقم کے نزدیک دوسرا مصرعہ بلا شبہ اس طرح صحیح ہے :

نشاند در ضمیر آہن و قلب حجر ناخن

میرے خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ منتخب التواریخ کے ایک مصحح نسخہ میں جو ۱۲۵۶ھ نواب ضیاء الدین احمد خاں کے لئے لکھا گیا اور مکتبۂ ایشیاٹک سوسائیٹی میں زیر شمارہ ۱۱۹ فارسی محفوظ ہے ۔ اس میں اسی طرح ہے ۔ پھر Ran-King کے ترجمہ کی مراجعت سے ظاہر ہوا کہ اس نے "قلب حجر" کو اسی نسخہ کی بنیاد پر صحیح قرار دیا ہے اس نے تصحیح میں "قلب ہجر" نہیں بتایا ہے ۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر "قلب خنجر" کو صحیح فرض کر لینے کی تقدیر پر "خنجر ناخن" بہ اضافت اور "ضمیر آہن" بدون اضافت پڑھنا ناگزیر ہو جاتا ہے جو صحیح نہیں اس لئے کہ پورے قصیدہ میں کہیں قافیہ کی اضافت ردیف کی طرف نہیں ملتی ہے اور اگر اس فنی سقم کا اعتبار نہ کیا جائے تب بھی "قلب خنجر ناخن" (بہ تتابع اضافات) کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے ۔ یہاں قطعی طور پر

"قلب حجر" صحیح ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر میں "سنگ سر" کے بجائے "سگ سیر" صحیح ہے۔ Ran King بھی مؤخر الذکر الفاظ کو صحیح سمجھتا ہے اور اول الذکر نسخہ میں ایسا ہی ہے۔ مؤلف نے اس اصلاح کی نسبت رین کنگ کی طرف نہیں کی ہے۔ (دیکھو انگریزی ترجمہ ج ۱ ص ۱۲۰ حاشیہ ۴ و ۶)

زیر بحث شاعر کے ایک اور قصیدہ کا علم مجھے ابو الحسن الحسینی فراہانی شارح قصائد انوری کے ذریعہ ہوا۔ قصیدہ تضمین اور صنعت سوال و جواب میں پچاس ابیات پر مشتمل تھا اس کے مخاطب کا نام بلکا اتابک ہے۔ مطلع اور چند اشعار جو فراہانی کے یہاں ملتے ہیں اس کے الفاظ کے ساتھ درج ذیل ہیں:

"عمید لویکی (؟) در مدح اتابک در قصیدۂ مشتمل بر تضمین و صنعت سوال و جواب کہ مطلعش اینست:

چون است حال تو بمن امروز یار گفت — گفتم کہ ہست بے تو مرا حال زار گفت

از زبان معشوق در خطاب بجو دگفتہ:

دی سروری کہ ہتر این روزگار دست — گفتم کہ کیست ہتر این روزگار گفت

بلکا اتابک آنکہ سرو سروری ورا — گفتم کہ اوست سرور و ہم نامدار گفت

فراہانی کی زبانی اسی قصیدہ کے دو شعر اور سن لیں:

بادا ہمیشہ بر ہمہ کس کشتہ شادماں — گفتم کہ باد بر ہمہ کس کامگار گفت

گو اینچنیں کہ باد ورا جاودان بقا — گفتم کہ آنچناں کہ مرا آں نگار گفت

(شرح قصائد انوری: نسخہ ۱۰۱۱ھ ایشیاٹک سوسائٹی زیر شمارہ ۵۵ لم برگ ۱۴ ب)

(۵) شمس دبیر جس کو بدایونی عہد ناصری کا شاعر قرار دیتے ہیں اس کا ذکر عمید تولکی سے بحث کرتے ہوئے آچکا ہے۔ یہاں ملا صاحب کے اصل الفاظ پیش کئے جاتے ہیں کہ ذیل میں جو بحث آرہی ہے وہ اصل عبارت کے بغیر واضح نہیں ہوسکتی:

"واز جمعے کہ در عہد ناصری کوس شاعری نواختہ بدرجہ ملک العلامی (؟ الکلامی) رسیدہ بود یکے شمس الدین دبیر است کہ آثار فضائل وکمالات او از حد بیان و توصیف و تعریف مستغنی است و میر خسرو قدس اللہ سرہ عیار اشعار خود را بر محک قبول طبع آوردہ بآں مباہات فرمودہ و در دیباچہ غرۃ الکمال و در آخر ہشت بہشت (؟) کلام خود را بذکر محامد و نشر مناقب او زیور تمام بخشیدہ و سلطان غیاث الدین بلبن در آخر حال او را منشی مملکت بنگالہ و کامرود ساختہ در ملازمت پسر بزرگ (؟) خویش نصیر (؟) الدین بغرا خاں گذاشتہ بود و ایں چند بیت از قصیدۂ اوست :   ایں ہمہ کار دلم از تو بنادانی خام   الخ

(منتخب التواریخ ج ۱ ص ۹۴)

اس عبارت کو پیش نظر رکھئے پھر ان الزامات پر غور فرمایئے جو مؤلف کی طرف سے ملا عبدالقادر بدایونی کے اسی بیان پر عائد کئے گئے ہیں۔ الزامات حسب ذیل ہیں :

الف   "بلبن کے بڑے لڑکے کا نام نصیر الدین بغرا خاں بتایا گیا ہے جو صحیح نہیں اس کا نام محمد سلطان تھا۔" ص ۲۶۷

ب ــــ "ملا عبدالقادر بدایونی کو دہلی کے سلطان ناصر الدین محمود اور بلبن کے لڑکے ناصر الدین محمود (والی لکھنوتی) کا دھوکا ہوا اس لئے انھوں نے شمس دبیر کو عہد ناصری کا شاعر بتایا ہے اور جو قصیدہ لکھنوتی کے والد ناصر الدین محمود کی شان میں کہا گیا ہے وہ دہلی کے سلطان ناصر الدین کی طرف منسوب کر دیا۔"   (ص ۲۶۷)

پہلا الزام بادی النظر میں صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ مؤلف کو معلوم ہوگا کہ ملا عبدالقادر کو بلبن کے دونوں لڑکوں کے متعلق صحیح معلومات حاصل تھے۔ چنانچہ عہد بلبنی کی تفصیلات میں بغرا خاں کے متعلق ان کا بیان ہے : "وسلطان آں ملک را بہ پسر خورد خویش بغرا خاں حاکم سامانہ کہ آخر سلطان ناصر الدین خطاب یافت با چتر و دورباش دادہ تختگاہ رسید" (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۱۳۰) پھر بلبن کے بڑے لڑکے کے متعلق ان کے الفاظ یہ ہیں : "بجہت

تدارک این فتنہ پسر بزرگ خود سلطان محمد را کہ مشہور بخان شہید وقاآن ملک است چتر دور باش واسباب و علامات سلطنت دادہ ولی عہد گردانیدہ" الخ (منتخب ج ا ص ۱۳۰) پس منتخب التواریخ کے مطبوعہ نسخہ میں جو غلطی ہے وہ غالباً اصل نسخوں کے ناقلین کی بے احتیاطی سے پیدا ہوئی ہے اور اگر یہ سہو قلم ملا صاحب ہی سے سرزد ہو گیا ہو تو اس سے نفس واقعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ اس قسم کی مسامحتوں کی نشاندہی سے مؤلف کا اصل مدعا ثابت ہو سکتا ہے۔

دوسرا الزام جتنا سنگین نظر آتا ہے اتنا ہی مہمل ہے۔ کم از کم معتبر اصحابِ قلم کو ایسی بے بنیاد باتیں لکھتے ہوئے تأمل سے کام لینا چاہیئے۔ یوں تو ملا صاحب سے سہو و فروگذاشت کا واقع ہو جانا ممکناتِ عادیہ میں سے ہے لیکن جس مسامحت کی نشاندہی کی جائے اس کے متعلق غور کر لینا چاہیئے کہ نفس الامر میں یہ مسامحت واقع بھی ہوئی یا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ملا صاحب کے کسی لفظ سے یا ان کے اسلوب نگارش سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان کو سلطان ناصر الدین محمود اور بلبن کے لڑکے ناصر الدین والی لکھنوتی کا دھوکا ہوا ہو۔ نیز بدایونی کے اصل بیان سے صراحۃً یا اشارۃً یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی کہ بدایونی کے خیال میں شمس دبیر کا قصیدہ ناصر الدین محمود بغرا خاں کے بجائے سلطان ناصر الدین محمود کی شان میں تھا۔ مؤلف نے غالباً اس خیال سے بدایونی پر ردّہ جمایا ہے تاکہ عمید تولکی کے قصیدہ کے بارہ میں ان کا نظریہ صحیح قرار دیا جائے۔

بہر حال بدایونی کی عبارت کا اگر وہ مفہوم لیا جائے جو مؤلف نے سمجھا ہے تو وہ یقیناً ایک خود ساختہ مفہوم ہو گا جس سے اصل عبارت قطعی طور پر بے گانہ ہے۔ بدایونی کے متعلق اس موقعہ پر اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے شمس دبیر کو عہدِ ناصری کا شاعر قرار دیا تھا تو اس عہد سے متعلق شاعر کی زندگی پر کچھ روشنی کا ڈالنا ضروری تھا لیکن غایتِ اختصار پسندی (دیکھو منتخب التواریخ ج ا ص ۷) کی بنا پر انھوں نے شاعر کی تقریباً پوری زندگی کا خلاصہ چند فقروں میں پیش کر دیا ہے جس سے سرسری طائرانہ نگاہ ڈالنے والوں کو غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

بدایونی کی مذکورۂ بالا عبارت میں جہاں امیر خسرو اور غرۃ الکمال کا حوالہ آیا ہے ہشت بہشت

کا نام بھی درج ہے اور اس پر مؤلف کو تعجب ہے (ص ۲۷۶) میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مطبوعہ یا بعض قلمی نسخوں میں "و در آخر ہشت بہشت" کے جو الفاظ ملتے ہیں بہت ممکن ہے کہ بدایونی کے اصل نسخہ میں یہ الفاظ نہ ہوں اور بعد میں الحاق کر دیئے گئے ہوں۔ منتخب التواریخ کا وہ معتبر نسخہ جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے اس میں "و در آخر ہشت بہشت" کے الفاظ نہیں ہیں (نسخہ ایشیاٹک سوسائیٹی، زیر شمارہ ۱۱۹ فارسی برگ ۲۷ب) کلکتہ کا مطبوعہ نسخہ جس قدر سقیم اور ناقابل اطمینان ہے اس کا اندازہ مؤلف کو بھی ہوا ہوگا یہ کتاب جس نسخہ کے مطابق چھاپی گئی ہے وہ اغلاط سے پُر تھا۔ رین کنگ (Ran King) نے اپنے ترجمہ میں اول الذکر نسخہ سے بھی فائدہ اٹھایا ہے لیکن اس موقعہ پر اس نے اس صحیح نسخہ کا خیال نہیں کیا ہے چنانچہ ہشت بہشت کے متعلق حاشیہ میں لکھتا ہے کہ "ہشت بہشت کے اخیر میں کسی ابو حنیفہ کی تعریف کی گئی ہے اس سے شاید شمس دبیر ہی مراد ہوگا"۔ حالانکہ ہشت بہشت کے اخیر میں جیسا کہ مؤلف نے واضح کیا ہے شہاب مہمرہ کی تعریف کی گئی ہے۔

(۶) اخیر میں کچھ متفرق باتیں عرض ہیں:-

عوفی کی کتاب جوامع الحکایات ولوامع الروایات کے چند مآخذ کو شمار کرتے ہوئے مؤلف نے اپنی طرف سے تصرف کر کے بعض اسماء کو ناقابلِ فہم بنا دیا ہے۔ اور بعض دوسرے اسماء میں جو تصحیف و تحریف ہوگئی ہے وہ کتابت کی خامی ہوگی مثال کے طور پر تاریخ العباس کا صحیح نام تاریخ خلفاء بنی عباس ہے۔ عین الاخبار کے بجائے عیون الاخبار ہونا چاہیئے (اس کا مصنف نجم الدین عمر النسفی بتایا گیا ہے لیکن اس نام کی مشہور کتاب ابن قتیبہ دینوری کی ہے)۔ فوائد کتب حکایتی کچھ عجیب نام ہے شاید اس کتاب کا ذکر جوامع الحکایات کے مآخذ کی فہرست میں نہیں۔ تفسیر ابن القلبی کے بجائے تفسیر ابن الکلبی صحیح ہے ابن الکلبی انساب اور تفسیر کے لئے مشہور ہے۔ (ص ۵۴)

مؤید جاجرمی کے متعلق اگر مؤلف چاہتے تو قرائن سے کچھ بات لکھ سکتے تھے۔ برنی کی تاریخ میں سلطان جلال الدین خلجی کے ندمار کے ضمن میں یہی نام آتا ہے (فیروز شاہی ص ۱۷۴، ۱۹۹، ۲۰۱ کلکتہ) ممکن ہے کہ اس نے طویل زندگی پائی ہو۔ اورینٹیل کالج میگزین بابت فروری و مئی سنہ ۱۹۵۳ء

میں مؤید جاجرمی کے متعلق بعض مفید اطلاعات درج ہیں۔

صبح گلشن میں صاحب طبقات ناصری کی طرف دو رباعیاں منسوب ہیں جو بہ قول مؤلف مولانا منہاج کی نہیں ہیں بلکہ ان کے والد بزرگوار کی بتائی جاتی ہیں (ص ۱۹۵۔) مؤلف کسی ماخذ کا ذکر نہیں کرتے حالانکہ حوالہ دینا ضروری تھا۔ میرے علم میں عوفی نے دونوں رباعیاں صاحب طبقات ناصری کے والد کے ترجمہ میں نقل کی ہیں۔ (لباب الالباب ج اص ۲۸۴)

حضرات صوفیہ اور فقہاء علماء کا ذکر مؤلف نے جا بجا کیا ہے اسی طرح دوسرے فنون میں دست رس رکھنے والوں کے چند نام تاریخ میں محفوظ رہ گئے ہیں ان کا بھی ذکر کر دیا جاتا تو میرے خیال میں مؤلف کو اپنے موضوع سے بہت دور جانا نہ پڑتا اور کتاب میں کچھ فوائد کا اضافہ بھی ہو جاتا۔ مثلاً بلبن کے عہد میں طب و نجوم کے بڑے ماہرین موجود تھے مولانا حمید الدین مطرز کی شخصیت فن طب اور نجوم میں بے نظیر تھی گویا اس عہد کے بقراط و جالینوس تھے۔ مولانا حسام الدین ماریکہ کا شمار بھی طب کے ماہرین میں تھا۔ مولانا بدرالدین دمشقی کمالِ فن کے ساتھ زہد و اتقا میں یگانہ تھے اور ان کے کمالِ فن پر ضیاء برنی کافی روشنی ڈالتا ہے (فیروز شاہی: ص ۱۱۲، ایضاً ص ۳۶۲ کلکتہ)

مجھے فاضل مؤلف کے ذوقِ تحقیق سے قوی امید ہے کہ سطور بالا کو علمی خلوص پر محمول فرمائیں گے کہ اسی جذبہ کے ماتحت میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب مجموعی حیثیت سے اپنے موضوع پر اردو زبان میں انفرادیت کی حامل ہے۔ تمہیدی سطور میں اس کی اہمیت دکھائی جا چکی ہے اور جزوی فروگذاشتوں سے اس کی اہمیت میں فرق نہیں پڑتا۔

تصحیح

گذشتہ شمارہ میں حضرت روشؔ صدیقی کی جو نظم "حریم نیم شبی" شایع ہوئی ہے اس میں کتابت کی دو غلطیاں رہ گئی ہیں ناظرین اس طرح ملاحظہ فرمائیں۔ بند ۲ میں گم نگاہ کی جگہ "کم نگاہ" ہے اور بند ۶ کے پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ یوں ہے۔

"بیٹھے ہوں جس کے خوف سے پیر شکستہ حال"

محمد اشرف خاں لکھنوی ثم دہلوی

از

جناب عابد رضا صاحب بیدار
(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

حسرت مرحوم کو اشرف خاں ۔ خاںؔ کا کوئی مجموعہ نہیں مل سکا (اردوئے معلی، تذکرہ تلامذہ مصحفی بسلسلۂ ترجمہ تنہا) ہندوستان میں ان کے تین قلمی دیوان حیدر آباد، علی گڑھ اور رام پور میں موجود ہیں ۔ دیوان اوّل حیدر آباد میں ہے ۔ دیوان دویم وسویم رام پور میں ہیں اور دیوان دویم کا ایک بدخط اور بوسیدہ نسخہ لٹن لائبریری علی گڑھ میں ہے ۔ دیوان اول (نسخہ آصفیہ) کی تاریخِ کتابت ۱۲۵۸ھ ہے ۔ دیوان دویم وسویم پر تاریخ کتابت درج نہیں ۔ دیوان دویم (نسخہ رام پور) کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی نقاش کی بنائی ہوئی خاںؔ کی "شبیہہ" بھی ہے جس میں وہ کلاسکی انداز پر گاؤتکیہ کے سہارے بیٹھے ہوئے ہیں حقہ سامنے رکھا ہے ۔ اس کے اوپر لکھا ہے ۔ "شبیہہ خاں موصوف ۔ اشرف خاں صاحب قبلہ ۔

دیوان اول کے قطعاتِ تاریخی ۱۲۴۶ھ تک کے ہیں اور غالباً سب سے پہلا قطعہ ۱۲۳۹ھ کا ہے ۔ دیوان دوم میں ۱۲۴۸ھ سے ۱۲۵۳ھ تک کے قطعات ہیں ۔ صرف ایک تاریخ ۱۲۴۴ھ کی ہے اور ایک ۱۲۴۳ھ کی ۔ دیوان سیوم میں کوئی تاریخی قطعہ نہیں ــــ دیوانِ دویم کے آغاز میں کاتب نے لکھا ہے! "دیوان دوم تصنیف محمد اشرف خاں صاحب قبلہ سلمہٗ اللہ تعالیٰ معہ شبیہہ" اور آخر میں یہ عبارت ہے! "تمام شد دیوان دویم تصنیف محمد اشرف خاں صاحب قبلہ متخلص بہ خاںؔ ولد محمد علی خاںؔ بہادر ابن نواب روشن الدولہ ۔ روشن خاں بہادر ساکن شاہجہاں آباد

تحریر یافت۔" دیوان سوئم کے سرورق یہ عبارت ملتی ہے! " دیوان سوم مسمی دفتر گلزار ملک الشعرائے ہند محمد اشرف خاں صاحب سلمہٗ جز ۱۹ ابیات ۱۳ سہ ہزار و ہفت صد پنجاہ و پنج شعر۔

سخاوت مرزا صاحب آج کل ۵۳ء میں خاںؔ کے حالات اور دیوان اول پر تبصرہ لکھ چکے ہیں۔ "تذکرہ خوش معرکہ زیبا (نسخہ علی گڈھ) میں بھی خاںؔ کا ترجمہ موجود ہے اور اس کے علاوہ ان کے تلامذہ کا ذکر بھی ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲ھ میں نہ نب کے شاگرد سعادت خاں ناصرؔ لکھنوی نے ترتیب دیا۔ اس وقت تذکرہ کے اندازِ بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاںؔ زندہ تھے اور یہ بھی کہ تذکرہ نگار سے ان کے دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ ناصرؔ نے لکھا ہے:۔

"خان ساماں دیوان سخنوری اشرف خاں تخلص خاںؔ خلف محمد علی خاں ابن روشن خان مخاطب بہ روشن الدولہ وطن اس کے بزرگوں کا شاہجہاں آباد مولد اس کا لکھنؤ، غیور، شہسواری اسپ میں مشہور شاگرد میاں مصحفیؔ" اور اس کے بعد ۲۷ شعر نمونتہً دئے ہیں۔ اسی تذکرہ میں ترجمہ مصحفیؔ کے سلسلہ میں خاںؔ کا ذکر آیا ہے۔

اشرف خاں صاحب　کہ شاگرد میاں صاحب کے ہیں مجھ سے کہتے تھے اک دن مرزا جعفر نے صحبتِ عام میں میاں مصحفیؔ سے پوچھا آپ نے کوئی ایسا شعر بھی کہا ہے جس میں ۔۔۔۔۔ یہ شعر پڑھا۔

بھیج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے مدام　　کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا

(۲)

خاںؔ کوئی بڑے شاعر نہیں۔ ان کے یہاں اچھے شعر بھی بہت کم ہیں لیکن ان کے لئے یہ شرف کچھ کم نہیں کہ وہ مصحفیؔ کے شاگرد ہیں اور پھر وہ اور ان کے ساتھ کے تمام شاعر لسانی مطالعہ کے لئے بھی بہت اہم ہیں اس کے ساتھ ساتھ

موضوعات کی تبدیلی اور دہلویت پر دھیرے دھیرے لکھنویت کی فتح کے نشانات کی حیثیت سے ان کی کافی اہمیت ہے۔ مصحفی کے یہاں جو خارجی رنگ ہلکا اور "مستعار" سا تھا اب پختہ ہو چلا ہے۔ کبھی کبھی خاںؔ اور ان کے ساتھ کے دوسرے شعرا کے یہاں خالص دہلوی رنگ ہاتھ پاؤں مارتا دکھائی دے جاتا ہے۔ مشکل ردیفوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑی آسان ردیفیں بھی مل جاتی ہیں۔ لیکن مطالعہ کے دوران میں دل میں یہ بات اترتی جاتی ہے کہ ایک روایت دوسری کے لئے جگہ چھوڑ رہی ہے۔

خاںؔ کے یہاں مجھے ایک چیز اور ملی اور وہ ہے بول چال کی زبان سے قربت اس سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو عوام بولتے ہیں بلکہ بات کہنے کا وہ انداز جیسے کوئی آپس میں باتیں کرے۔ مثلاً مصحفی نے نمونتہً خاںؔ کا ایک شعر دیا ہے۔

ہر بات پہ کہتے ہو کہ دیوانہ ہے یہ بھی		ہر بات پہ گالی کوئی یارانہ ہے یہ بھی

بالکل سادہ انداز۔ عوامی انداز۔ بول چال کا انداز۔ بے تکلفی کا انداز۔ سب جگہ تو ایسا نہیں لیکن اس طرز کے کافی شعر مل جاتے ہیں اور اسی سلسلے میں محاوروں کا استعمال بھی آجاتا ہے اور محاوروں کے ساتھ ساتھ ضرب الامثال یا وہ جملے جو ضرب المثل تو نہیں لیکن مشہور انہیں کی طرح ہیں۔ مثلاً دیوان سوم میں

ع باقی تھا ایک تو میرے حصہ میں بٹ گیا		ع عاشق کی ترے بات ہوئی تو نہ بھی کچھ

ع ہر وقت ہوں ہر لحظہ گنہگار ہوں تیرا		ع روزہ ہمارا کیا ہے ہماری نماز کیا

ع رقیب روسیہ گر تجھ سے بل کی روز لیتا ہے		ع تم سے وفا جو کی تو ہوا کیا نہال میں

ع ایسے آنے سے میں گزرا تمہیں کیا آنا تھا		ع موت آوے گی فرشتہ مرا گھر دیکھ چکا

ع میں گذرا چاہ سے میرا سلام بس جی بس		ع تو ہنس کے بولے خاںؔ جی ادھر تو لاؤ ہاتھ

ان سب چیزوں کے ساتھ بے ساختہ پن خاں کی خصوصیت ہے اور پھر کچھ مصحفی کے اثر سے اور کچھ دہلی کے براہِ راست اثر سے یا کچھ وہاں کے نام سے اکثر جگہ داخلی رنگ بھی بڑا رچا ہوا ملتا ہے۔ ان تمام خصوصیات کا اندازہ دیوانِ دوئم وسوئم کے اس مختلف انتخاب سے ہو سکے گا۔

سینہ تھا اور ہاتھ تھا دیوار اور سر — عالم نہ پوچھ میری شبِ انتظار کا

گردشِ چرخ میرے دور میں کیا تو نے کیا — ہاتھ میں جام کے لیتے ہی سبو ٹوٹ گیا

ساقی ترے میخانے کو کیا یاد کروں گا — لبریز مرے دور میں اک جام نہ آیا

تو سمجھ یا نہ سمجھ یار ترے یار ہیں ہم — برسوں گزرے کہ میاں طالبِ دیدار ہیں ہم

طرفِ گل سے کیا بند قفس کا سوراخ — قید میں خاطرِ صیاد کیا کرتے ہیں!

تم آؤ یا نہ آؤ شام سے روز — تمہارا آسرا ہے اور میں ہوں

ع رو رو کے تیری یاد میں راتیں گزاریاں :-

پرواز کو ترستا ہوں فصلِ بہار میں — مجھ سا بھی دہر میں کوئی بے بال و پر نہ ہو

میکشوں کی ترے دروازے پہ فریاد رہے — ساقی تو شاد رہے میکدہ آباد رہے

روز کے رنج سے گھبرایا ہے جی میرا اب — ایسے جینے سے تو اے خاک کہیں مر جائیں

چشمِ گریاں ترا برا ہووے — قصۂ خاص میرا عام کیا

دیکھ کر تجھ کو جو بچ جائے تو بچ جائے مگر — تیرے بیمار کے مرنے ہی کے آثار ہیں سب

اس درجہ مے کشی ہے تری چشمِ مست سے — پلوا رہا ہے مے سرِ بازار محتسب

شام ہی سے شبِ غم میں الجھتا ہے دلِ زار — کس طرح کٹتے دیکھئے یہ چار پہر آج

مجھ سا وحشی نہ ہوا ہے نہ کبھی ہوئے گا — کب رہے گی یہ زمانے کی ہوا میرے بعد

اے خدا رکھیو یونہیں صحبتِ مستاں قائم — بادہ کش شور کریں ساقیِ گلفام کے گرد

سخت جانی نہ منفعل کرنا — ہاتھ نازک بہت ہیں قاتل کے
وہ بادہ نوش ہوں ساقی کرے جو مجھ پہ کرم — سبو کو منہ سے لگاؤں نہ فکرِ جام کروں
یہ بات پرانی ہے ہر اک بات پہ جھڑکی — تازہ سا کوئی ظلم اب ایجاد کرو تم

معاصرانہ اشارے:۔

وہ غزل ہے یہ مری اے حضرت خاںؔ گر سنے — شاعرِ مغرور کا گل ہووے تو روشن چراغ
شعر کہہ آتا نہیں جن کو ذرا خاں ہرگز — وہ یہ کہتے ہیں کہ افسوس ہوا اب میرؔ نہیں
غلط ہے خاںؔ جو کہے کوئی ہیں ہم بے استاد — جہاں میں ایک بھی تسبیح بے امام نہیں
مہر و شفقت سے سکھایا ہے مجھے فنِ شعر — خاںؔ میاں کیوں نہ کروں حضرت استاد کو یاد

تمام تاریخوں میں صرف ایک تاریخ قابلِ ذکر ہے۔ تاریخ جلوہ افروز شدن نصیر الدین حیدر بادشاہ کہ بدار الشفا بیان شادی دیوا صاحب انگریز بپاسِ خاطر میاں محمد بخش رسا شاگرد این فقیر "۔۔۔ "زہے نصیب سرافراز کرد مہر و مہ"

دلّی اور لکھنؤ کے اشارے:۔

شکایت کیا ہے اے خاںؔ لکھنؤ میں تو جو نکلی ہے — ہوا ہے منتظم کو شوق اب بے انتظامی کا
ع یاد آتی ہے جو دلی تو میں رو دیتا ہوں:۔

خاںؔ میاں جاؤں میں کس طرح بھلا دلی میں — یاد کرتے ہیں مجھے لوگ وطن میں اکثر
تجھ کو بے جا یہ گماں دل میں رہا دور ہوں میں — رہنے والا ہوں میں دلی کا بڑی دور نہیں
دل کسی ماہ کو دے کر میں بہل جاؤں گا — چاندنی چوک ہے قائم تو سنبھل جاؤں گا
مجھ کو مدت ہوئی دلی سے تو آئے اے خاںؔ — واں کے محبوبوں کو اب خاک محبت ہوگی
دلی کے دیکھنے کو جی ہی پھڑک رہا ہے — اے خاںؔ ہمیں خدا کب پہنچائے گا وطن میں

(۳)

مصحفی کے شعر:-

خاں نے مختلف شعرا کی غزلوں پر مخمس لکھے ہیں۔ ان میں مصحفی کی غزلیں سب سے زیادہ ہیں۔ سخاوت مرزا صاحب نے ان دونوں کے مخمسات کا ذکر کیا ہے جو دیوان اوّل میں ہیں:-

۱۔ دو دن سے وہ شکل اپنی دکھاتا نہیں مجھ کو ۲۔ خیالِ یار جو شب میرا ہمکنار رہا!

دیوانِ دوئم میں بھی دو غزلوں میں مخمس ملتے ہیں۔

۲۔ جیتے ہی جی کو خاک کیا میں نے کیا کیا اپنے تئیں ہلاک کیا میں نے کیا کیا۔

اور دیوانِ سوئم میں مصحفی کی سات غزلوں میں مخمس کہے ہیں:- ہم ہر غزل کا مطلع اور تعداد اشعار مصحفی درج کرتے ہیں۔

(۱) ہرگز نہ مری خاک سے فرزانہ بنے گا پتلا بھی بنے گا تو وہ دیوانہ بنے گا ۱۰ شعر

(۲) ترے بگڑتے ہی الفت کا گھر خراب ہوا امید کو طرف پاس سے جواب ہوا ۹ شعر

(۳) چمن میں جاتے ہی جی تن سے کبھی روانہ ہوا مجھے تو خندۂ گل موت کا بہانہ ہوا ۱۰ شعر

(۴) صبح شب ہجراں کو خدا جانے ہوا کیا خورشید درخشاں کو خدا جانے ہوا کیا ۱۳ شعر

(۵) ہم ملے خاک میں جتنا تو سنبھلتا آیا دم بدم رنگ ترا اور نکلتا آیا ۱۴ شعر

(۶) پردہ جب رخ پہ ترے اوبت مغرور نہ تھا آئینہ محو تماشائے رُخ حور نہ تھا ۹ شعر

(۷) مارِ گیسو کو مری جان مگر چھوڑ دیا تیرے ہمسایہ نے جو خوف سے گھر چھوڑ دیا ۷ شعر

یہ سب غزلیں ع۵ کے علاوہ دیوان ششم (نسخہ رام پور) میں موجود ہیں مگر تھوڑے تھوڑے الفاظ اور مصرعوں کے اختلافات ہیں ع۵ مجھے نہیں ملی۔

خاں کے ان تینوں دواوین سے مصحفی کی ۱۱ غزلیں مل جاتی ہیں میں مصحفی کے قلمی دیوان اور خاں کی نقل کردہ غزلوں کے اختلاف دکھانا چاہتا تھا مگر فی الحال

مصحفی کے دیوا دین تک پہنچ نہیں۔ اس لئے یہ اشارے کافی ہوں گے۔

تلامذۂ خان ــــــ "تذکرہ خوش معرکۂ زیبا"

(۱) آشفتہ:۔ نواب جرار الدولہ محمد ہادی علی خاں بہادر ضیغم جنگ تخلص آشفتہ ابن مہدی علی خاں داماد فردوس منزل شاگردِ اشرف خاں (خان کا ایک شعر ہے:۔)

خاں رہے شادیہ نواب جرار الدولہ　　اور فزوں جاہ وحشم اسکا بصد شاں ہووے

نمونۂ کلام:۔

ہرگز ملے نہ بادہ کشی کا مجھے مزا　　جب تک نہ دستِ یار میں جامِ شراب ہو

اب کسی شکل نہیں زیست نظر آتی ہے　　اُس سے ملنے کی الٰہی کوئی صورت ہوجائے

(۲) باغ:۔ امام علی تخلص بہ باغ پسر محمد پناہ۔

رشک کیا کیا ہو رقیبوں کو وہ محفل دیکھ کر　　باغ ہو وہ گل ہو اور جامِ شرابِ ناب ہو

(۳) جمیل:۔ امیر خاں جمیل (دیوان دوم کی تاریخ پر خان نے لکھا ہے تاریخ وفات مسماۃ پیاری آشنائے امیر علی خاں جمیل، تاریخ ۱۲۵۳ھ ہے)

اسیرانِ قفس اے ہمصفیر چھوٹے جاتے ہیں　　ذرا صیاد سے پوچھو ہماری بھی رہائی ہو

(۴) رسا:۔ محمد بخش رسا (دیوانِ دوم میں ایک تاریخ پر لکھا ہے "بپاس خاطر میاں محمد بخش المتخلص رسا شاگرد ایں فقیر۔)

مل گئے غیر سے تم تم کو صنم دیکھ لیا　　بس جی بس جائیے سب قول و قسم دیکھ لیا

---

(۶) شجر:۔ لالہ گرو داس شجر:۔

اپنی زلفیں چھپاؤ گے کب تک　　مجھ کو وحشی بناؤ گے کب تک

(۷) شور:۔ مرزا آغا علی شور ساکن فیض آباد:۔

جی چاہتا ہے تم کو گلے سے لگائیے　　اس بھولی بھالی شکل کے قربان جائیے۔

۸۔ شفق :۔ شیخ محمد جان عرف ممن خلف محمد پناہ :۔

کھو بیٹھے کوئے یار میں ہم جا کے دوستو ناموس ننگ و غیرت و صبر و قرارِ دل

(۵) ساحل :۔ گوہر علی عرف گوہری تخلص ساحل :۔

بہارِ باغ کی دو دن تو سیر کرنے دے ابھی سے دل نہ کڑھا موسمِ خزاں میرا

انگوٹھی اس ڈپٹیا نے دی تھی قاصد کو گیا تھا ڈاک میں ساحل جو خط وہاں میرا

(۹) قلزم :۔ شیخ علی بخش قلزم :۔

وہ رزاقِ جہاں ہے رزق دے دے گا مجھے قلزم ہوا گوشہ نشیں اس واسطے چھوڑا گدائی کو

(۱۰) منصف : شیخ قادر علی منصف :۔

رخ کو گھونگھٹ میں چھپایا جو دکھا کر مجھ کو صورتِ برق کیا یار نے مضطر مجھ کو

(۱۱) واصف :۔ حیدر حسن تخلص واصف :۔

فصلِ گل میں ظلم ہے کیا بلبلِ دل گیر پر توڑتا ہے دیکھنا صیاد بے تقصیر پر

حسرت مرحوم نے سلسلہ مصحفی میں خان کے صرف ایک شاگرد واقف کا نام لکھا ہے۔ میرا خیال ہے، کہ واصف ہی کو مولانا واقف لکھ گئے۔

ادبیات

غزل

از

(جناب اَلَم مظفرنگری)

نہیں انساں کو لازم بے نیازِ آرزو رہنا　　کمالِ زندگانی ہے خرابِ جستجو رہنا

بہاروں میں جنوں کی شورشیں جب حد سے بڑھتی ہیں　　تو فرضِ جیب ہو جاتا ہے پابندِ رفو رہنا

حقیقت میں یہ اک آئینِ تطہیرِ گلستاں ہے　　بوقتِ صبح شبنم سے گلوں کا باوضو رہنا

نہیں وہ عارفِ تنظیمِ ہستی بزمِ ہستی میں　　یہاں جو چاہتا ہے ہر گھڑی بیگانہ خو رہنا

چمن میں گرمیٔ محفل کو رکھنے کے لئے قائم　　سکھاتی ہے صبا غنچوں کو گرمِ گفتگو رہنا

وہ ہر پردے میں چھپ کر دے رہے ہیں دعوتِ جلوہ　　نگاہوں کو ہے مشکل بے نیازِ رنگ و بو رہنا

مجھے اکثر گماں ہوتا ہے یہ شاید مرے دل نے　　محبت ہی سے سیکھا ہے حریفِ آرزو رہنا

جو اہلِ ظرف ہیں جب تک نہ آجائیں مناسب ہے　　شرابِ ناب کا درپردۂ جام و سبو رہنا

تروتازہ فضائے بزمِ ہستی ان کے دم سے ہے　　خوش آتا ہے جنہیں ہر دم پریشاں مثلِ بو رہنا

حبابوں کے اُبھر کر ٹوٹ جانے سے یہ ثابت ہے　　نہیں ممکن سپرِ موجِ روانِ آبِ جو رہنا

بہر لحظہ حیاتِ شوق تازہ بڑھتی رہتی ہے　　بہت اچھا ہے ناکامِ پیامِ آرزو رہنا

سکھا رکھا ہے پیرِ میکدہ نے اپنے مستوں کو　　بوقتِ بے خودی بھی رازدارِ یا نگِ ہو رہنا

اَلَم تو کیفِ مستی گرمیٔ خونِ جگر سے لے
تجھے لازم نہیں سرگشتۂ جام و سبو رہنا

ترجمۂ رباعیاتِ خیام

از

(جناب طالب جے پوری)

گو مستوں کو توبہ سے بھی انکار نہیں
طعنوں کے بھی لیکن وہ سزاوار نہیں
دیکھ اپنا عمل بھی اُن کی رندی ہی نہ دیکھ
فخر اس پہ ہے کیا تجھے کہ مے خوار نہیں

خوش تم سے رہا میرا دلِ پُرغم بھی
غمگین رہا فرقت میں دلِ خُرّم بھی
جب تم تھے تو تھی تلخیٔ عالم بھی لطیف
اب تلخیٔ غم سے تلخ ہے عالم بھی

دنیا سے امیدِ لطف و احساں بے کار
بے کار ہے فکرِ سر و ساماں بے کار
درماں کی طلب سے درد ہوتا ہی فزوں
دل درد کا خوگر ہو تو درماں بے کار

کیا کعبہ و مدرسہ ہے، کیا دیر و کنشت
بے سود ہے خوفِ دوزخ و فکرِ بہشت
ہر واقفِ اسرارِ جہاں جانتا ہے
اک تخم سے بھی ہوتی ہے پیدا کہیں کشت

ہے موت سے اے دوست کہیں جائے اماں
تو بھی کبھی ہو گا اسی پردے میں نہاں
آیا ہو کہیں سے تو بلا سے مے پی
خوش رہ یہ نہیں معلوم کہ جائے گا کہاں

ہوں میں تو گنہ گار رضا کیا ہے تری
تاریک ہو دل اگر ضیا کیا ہے تری
طاعت کے عوض بہشت سودا ہی کھلا
سوچ اس میں بھلا شانِ عطا کیا ہے تری

شئونِ علمیہ

جوہری خوف بے بنیاد ہے دنیا پر ایک خوف طاری ہے کہ جوہری تجربے اور جوہری اشعاع انسانیت کے لئے مضر ہیں۔ لیکن امریکہ کی ہوائی فوج کے سائنس داں جوہری تجربوں کے چند منٹ بعد نابکار بادلوں میں اڑتے رہتے ہیں۔ وہ اس خوف پر خندہ زن ہیں۔

جوہری تجربوں میں جو بادل اُٹھتے ہیں وہ گہرے سرخ خشتی رنگ کے ہوتے ہیں۔ معلومات حاصل کرنے کے لئے اس بادل میں اڑنا پڑتا ہے۔ چنانچہ کپتان پال کرالے کا امریکی ہوائیہ میں یہی کام ہے۔ وہ کہتے ہیں "یہ پروازیں ہمارا روزمرہ کا کام ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی پریشان ہونے کی بات نہیں"۔

دو نشستی طیاروں میں جو ہوا باز یا مشاہدین ان بادلوں میں گھستے ہیں وہ نہ تو خاص لباس استعمال کرتے ہیں اور نہ کوئی خاص سپیز۔

لیکن چوں کہ مسلسل جوہری تجربوں کے متعلق عوام میں ایک تشویش پائی جاتی ہے اس لئے ایک جوہری سائنس داں ڈاکٹر گارڈن ڈننگ نے حسب ذیل بیان دیا ہے۔

"امریکی برطانوی اور روسی جوہری تجربوں کی وجہ سے اہل امریکہ پر جو زد پڑی ہے اس کی اوسط مدت اتنی ہی سمجھی جانی چاہئے جتنی کہ لاشعاعوں کو سینے پر ڈالنے کی ہوتی ہے۔ اشعاع کی جو مقدار لوگوں پر اس طرح پڑتی ہے وہ اس اشعاع کا سواں حصہ ہے جو طبعی اسباب کی بنا پر مدت العمر میں لوگوں کو پہنچتی رہتی ہے۔ اگر کسی شخص کی عمر بھر میں مسلسل تجربے ہوتے رہیں تو ایک اوسط امریکی کو جو اشعاع پہنچے گا وہ طبعی اسباب سے پہنچنے والے اشعاع کا دسواں حصہ ہوگا"۔

جس وقت کسی جوہری یا ہائڈروجن بم میں انشقاق یا التصاق واقع ہوتا ہے تو اشتعال کا ایک زبردست شعلہ سا نکلتا ہے۔ لیکن ۹۰ ثانیوں کے اندر وہ ختم بھی ہو جاتا ہے اور کوئی

قابلِ لحاظ اثر نہیں چھوڑ جاتا۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اس ابتدائی یا "معجل" اشعاع کو اس پسماندہ اشعاع سے ملتبس نہ کرنا چاہیئے، جو "موجل" سے پیدا ہوتا ہے۔

جب جوہری ہتھیاروں کی طاقت بڑھتی ہے تو معجل اشعاع سے خطرہ زیادہ نہیں رہتا کیوں کہ نقصان رساں گاما شعاعیں اور عدلیے (نیوٹران) اتنی دور نہیں چلتے جتنی دور کہ حرارت اور پیداشدہ اندھڑ چلتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اگر کوئی شخص کسی بڑے دھماکے سے اتنے قریب ہے کہ معجل اشعاع اس پر اثر انداز ہو سکے تو اندھڑ کی حرارت اسے پہلے ہی ختم کر دے گی۔

جس رقبے میں معجل اشعاع پہنچتا ہے اس میں جو چیزیں عدلیوں کی زد میں آئیں گی وہ خود تابکار ہو جائیں گی۔ اب یہ ان چیزوں کی نوعیت پر ہے کہ وہ دنوں یا برسوں اس طرح "زندہ" رہیں۔

جوہری دنیا امریکہ کی ریاست نیویارک کے مقام اپٹن میں ایک تجربہ خانہ "بروک ہیون نیشنل لیبورٹری" کے نام سے ہے جہاں دنیا بھر کے مشاہیر سائنس "پرامن جوہر" پر کام کرتے ہیں۔ ماہ اگست میں جنیوا میں جو بین قومی کانفرنس ہونے والی ہے اس میں اس کام کے نتائج پیش ہوں گے۔

ان کے دائرۂ عمل میں جہاں دماغی سرطان کا استیصال ہے وہاں وہ مادے کے راز بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں یعنی "جوہر کے اندر کی دنیا" کی سیر بھی کرنا چاہتے ہیں۔

یہ لوگ جوہری ہتھیاروں کو ایک ضروری وبال سمجھتے ہیں۔ ان کو ایسے بموں سے صرف اتنی ہی دلچسپی ہے کہ جو اشیاء کمیاب تھیں وہ اب اتنی مقداروں میں ملنے لگی ہیں کہ امریکہ کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

جوہری دھماکوں سے ایک زبردست منظر پیش نظر آجاتا ہے کیوں کہ ہائڈروجن بم سے اتنی توانائی خارج ہوتی ہے جتنی کہ اکروڑتا ۲ کروڑ ٹن ٹی ان ٹی (ایک زبردست دھماکو مالا) سے

بروک ہیون کے تجربہ خانے میں سائنس داں اولیہ (پروٹان) یعنی ہائڈروجن کے جوہر کے مرکزی (نیوکلیس) کو "جوہری گولیوں" کی طرح استعمال کرتے ہیں تاکہ دوسرے جوہروں

کے مرکزوں کو توڑ سکیں - ایک اولیہ یا پروٹان ہائڈروجن کے جوہر کا قلب ہوتا ہے لیکن اس جوہر میں دس کھرب پروٹان سما سکتے ہیں -

اندر جو کچھ ہوتا ہے اس کا پتہ اسی طرح لگ سکتا ہے کہ اس کے اثرات کو کسی فلم پر لے لیا جائے یا پھر نہایت حساس آلوں سے ان کو منعکس کیا جائے -

تجربہ خانے میں کوئی ۳۵۰ سائنس داں کام کرتے ہیں جن میں سے اکثر ۳۰ تا ۴۵ سال کی عمر کے ہیں - ان کے نزدیک تو یہ چیزیں روزمرہ کی ہو گئیں لیکن باہر کا کوئی شخص جاتا ہے تو وہ حیرت میں پڑ جاتا ہے اور یہ سائنس داں تعجب کرنے لگتے ہیں -

بروک ہیون میں ایک ذرا پرانا کاسموٹران ہے - جس کے ۲۰۰ فٹ کے رستے پر ایک پروٹان ایک ثانیہ میں کوئی ۳۰،۰۰۰،۰۰۰ چکر لگاتا ہے - باقاعدہ برقی جھٹکے پہنچے ہیں تو اس کی رفتار بڑھتے بڑھتے روشنی کی رفتار کے تقریباً برابر ہو جاتی ہے یعنی ۱۸۶،۰۰۰ میل فی ثانیہ -

سائنس داں فی الحقیقت ایک پروٹان کی رہنمائی کرتے ہیں یہاں تک کہ ۳۰ لاکھویں چکر میں وہ منصرف ہو کر ایک ہدف پر جا پڑتا ہے - کاسموٹران کے ایک ماہر ڈاکٹر ڈکلیسفر شوارٹس کے بقول ہم اب اس مدت کو پیمائش کر سکتے ہیں جس میں روشنی ایک فٹ کا فاصلہ طے کرتی ہے -

اس تجربہ خانے پر پہرہ بہت سخت ہے - وہ کوئی ۷ مربع میل کا رقبہ گھیرے ہوئے ہے - اور نیویارک سے تقریباً ۶۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے - وہاں کوئی ۱۵۰۰ آدمی کام کرتے ہیں - سائنس دانوں کی مدد کے لئے کوئی ۴۵۰ فن داں ہیں - باقی پہرہ دار ہیں، معمار ہیں اور دیکھ بھال کرنے والے ہیں -

ساری مغربی دنیا کے سائنس داں وہاں آتے ہیں اور تجربہ خانے کا معائنہ کرتے ہیں لیکن عملہ میں غیر امریکی چند ہی ہیں -

تبصرے

علی گڈھ میگزین کا علی گڈھ نمبر | مرتبہ نسیم صاحب قریشی تقطیع کلاں ضخامت پانچ سو صفحات سے اوپر کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد پانچ روپیہ۔

یہ علی گڈھ میگزین کا خاص نمبر ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں سب مضامین علی گڈھ تحریک اور اس تحریک کے نامور اساطین سے متعلق ہیں۔ یہ نمبر تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصہ میں جو پونے تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے اکثر وبیشتر مضامین سر سید احمد خاں مرحوم پر ہیں جن میں ان کی زندگی اور ان کے کارناموں کے مختلف پہلو وضاحت اور صفائی کے ساتھ دکھائے گئے ہیں اس حصہ کے مضامین میں "سید کا خواب اور اس کی تعبیر" از ڈاکٹر سید عابد حسین، "علی گڈھ تحریک کے اساسی پہلو" سید احتشام حسین، "سر سید کا اثر اردو ادبیات پر" سید عبد اللہ، "سید احمد خاں اور جمال الدین افغانی" خلیق احمد نظامی صاحب، "سر سید کا نیا مذہبی طرز فکر" پروفیسر محمد عمر الدین، "سر سید اور ہندو مسلم اتحاد" ہارون خاں صاحب شیروانی خاص طور پر لائق مطالعہ اور بصیرت افروز ہیں۔ دوسرا حصہ جو شخصیات کے عنوان سے ہے اس میں علی گڈھ کی متعدد نامور شخصیتوں سے متعلق اردو کے معروف اہل قلم کے مضامین ہیں لیکن یہ حصہ جامعیت، مواد اور معلومات کے اعتبار سے حصہ اول کے مقابلہ میں بہت کمزور تشنہ اور سرسری ہے اس حصہ کے اکثر و بیشتر مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوں کہ صاحب مقالہ کو ایڈیٹر علی گڈھ میگزین کی فرمائش پوری کرنی ہی ہے اس لئے انھیں کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور تھا۔ تیسرا حصہ مستقل ایک مقالہ ہے جو خواجہ غلام الثقلین پر ان کے لائق فرزند خواجہ غلام السیدین کے قلم سے ہے۔ اول تو خود خواجہ غلام الثقلین غیر معمولی کمالات واوصاف کے بزرگ تھے اور ان کو فرزند ملا خواجہ غلام السیدین جیسا سعادت مند بھی اور صاحب قلم بھی۔ پھر اس مضمون کے باغ و بہار ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا تھا۔

بہرحال مجموعی اعتبار سے یہ نمبر بڑا قابلِ قدر اور لائقِ توجہ ہے۔ اس نمبر کے مرتب حضرات لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے وقت کی ضرورت کا بروقت احساس کیا اور ایک ایسا ضخیم نمبر شائع کر دیا جس کو تحریک علی گڈھ کی تاریخ کا ایک اہم باب کہا جا سکتا ہے! ضرورت ہے کہ اس نمبر کے دوسرے حصہ کو اور زیادہ جامع بنا کر اس کو مستقل کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے۔

اسلامک لٹریچر کا اسلامی اسٹیٹ نمبر مرتبہ جناب مظہر الدین صاحب صدیقی۔ تقطیع کلاں، ضخامت ۱۵۰ صفحات ٹائپ جلی اور روشن گٹ اپ خوبصورت اور دل کش قیمت دو روپیہ پتہ:۔ شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور۔

پاکستان کے قیام کے بعد سے یہ مسئلہ عام طور پر بحث وتحیص کا موضوع ہوا ہے کہ اسلام میں اسٹیٹ کا کیا تصور ہے اور اس کی عملی شکل کیا ہونی چاہئے اس مسئلہ میں الجھاؤ زیادہ تر اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے منکرین عام طور پر اسلامی تعلیمات کے قامتِ موزوں پر جدید اصطلاحات وتصورات کا جامہ راست کرنا چاہتے ہیں اور چوں کہ قرآن وحدیث میں کہیں خاص اسٹیٹ کے عنوان سے کوئی باب نہیں ہے اس بنا پر ہر شخص اپنے اپنے فکر کے مطابق اس مسئلہ کی توضیح وتشریح کرتا ہے۔ حالانکہ اسلامی اسٹیٹ کا تعلق مادی قوانین واصولِ معیشت سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ دل سے اور ایمان باللہ سے ہے۔ وہی ایک عمل ہے جو ابو بکر صدیق اور عمر فاروق (رضی اللہ عنہما) سے سرزد ہو تو عین اسلامی اسٹیٹ کا حکم ہے۔ لیکن ہلاکو خاں۔ چنگیز یا تیمور لنگ سے صادر ہو تو اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلامی اسٹیٹ دستور ساز اسمبلی کے سہارے نہ کبھی قائم ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ جس اسٹیٹ کو مسلمان "امۃً وسطاً" اور "تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر" کا صحیح مصداق بن کر چلائیں گے دراصل وہی اسٹیٹ اسلامی اسٹیٹ ہوگی۔ "درویش صفت باش وکلاہ تتری دار" بہرحال چوں کہ آج کل یہ مسئلہ اہم موضوعِ بحث بنا ہوا ہے اس لئے لاہور کے مشہور انگریزی

ماہنامہ اسلامک لٹریچر نے اپنی جنوری ۵۵ء کی اشاعت اسی موضوع سے متعلق مضامین کے لئے مخصوص کر کے ایک خاص ضخیم نمبر نکالا ہے۔ اس نمبر میں دس مضامین ہیں اور اگرچہ ان میں مختلف نقطہ ہائے نظر کی ترجمانی اور نمائندگی کی گئی ہے۔ تاہم سب مضامین غور و فکر اور سنجیدگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ فاضل مرتب کے ادارتی مقالہ کے علاوہ عباسی، پروفیسر غلام رسول۔ لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید۔ مظفر الدین صاحب ندوی اور محمد ابراہیم صاحب کے مقالات خاص طور پر لائق مطالعہ ہیں۔ اس نمبر کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسلامی سیاسیات کے طالب علم کو اسٹیٹ سے متعلق بہت کچھ مواد اور معلومات سب ایک جگہ مل جاتے ہیں۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے اور اس کے مطالعہ سے محظوظ ہوں گے۔

معارف کا سلیمان نمبر | مرتبہ جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی۔ ضخامت چار سو صفحات سے اوپر۔ کتابت و طباعت بہتر قیمت :۔ درج نہیں غالباً للعہ پتہ :۔ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

یہ وہی نمبر ہے جس کا غلغلہ بہت دنوں سے ارباب ذوق کے حلقہ میں بلند تھا۔ اگرچہ غیر معمولی تاخیر سے نکلا ہے تاہم دیر آید درست آید کا مصداق ہے۔ یہ نمبر چھ ابواب پر تقسیم ہے۔ پہلا باب سیرت و سوانح پر ہے جس میں دو مضمون سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے ہیں اور ایک مضمون مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی کا ہے اور چونکہ دونوں حضرات مولانا سید سلیمان ندوی کے عزیز قریب ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ اس موضوع پر ان سے زیادہ اور کس کو لکھنے کا حق ہو سکتا تھا، دوسرا باب جو "فضائل و کمالات" کے عنوان سے ہے اس میں چار مقالات ہیں جن میں مقالہ نگاروں نے حضرت سید صاحب کے مختلف فضائل و کمالات کی نسبت اپنے مشاہدات و محسوسات اچھے اپنے انداز میں قلم بند کئے ہیں، اس حصہ کے قابل ذکر مقالہ نگار مولانا عبدالباری ندوی۔ مولانا مسعود عالم مرحوم اور پروفیسر رشید احمد صدیقی ہیں تیسرا حصہ علمی و دینی کارناموں کے لئے مخصوص ہے۔ اس حصہ میں

سیر حاصل مضمون تو دلائق مرتب کا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا گیلانی اور مولانا عبد الماجد دریابادی کے مقالات بھی لائق دید ہیں۔ مولانا محمد اویس صاحب ندوی کا مضمون "بعض اہم علمی کام" آئندہ علمی کام کرنے والوں کے لئے کام کا ہے۔ چوتھا حصہ "سلوک و تصوف" پر ہے۔ ہماری رائے میں یہ حصہ نسبتاً کمزور اور سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرتبہ سے گرا ہوا ہے سید صاحب ایسے علمی اور محقق بزرگ کے تذکرہ میں عالم خواب و خیال کی باتوں کا ذکر اور ان کو بحیثیت صوفی شاعر کے پیش کرنا۔ درآنحالیکہ وہ خود فرماتے تھے کہ میں ذہبی شاعر نہیں ہوں۔ حضرت سید صاحب کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ اس کے بعد دو ابواب اور ہیں ایک میں متفرق اصحاب نے سید صاحب سے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کئے ہیں اور دوسرے میں قطعات و تاریخی مادے ہیں اگرچہ سید صاحب ایسی جامع شخصیت جس نے تقریباً نصف صدی تک اپنے علم و فضل سے حیاتِ ملی کے مختلف شعبوں اور گوشوں کو سیراب کیا ہو کسی ماہنامہ کے ایک خاص نمبر میں نہیں سما سکتی تاہم اس میں جو معلومات جمع ہوگئی ہیں وہ آئندہ مورخ کے لئے بڑے کام کی ثابت ہوں گی۔ معارف کے فاضل مدیر اور ان کے لائق رفقا مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ نمبر شائع کر کے حقِ تلمذ ادا کر دیا۔ (س)

آج کل (کشمیر نمبر) | پتہ:- پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱، دہلی۔

ماہنامہ "آج کل" ہمارے دار الحکومت کا مشہور و معروف رسالہ ہے جو پبلیکیشنز ڈویژن کی جانب سے نہایت آب و تاب کے ساتھ شایع ہوتا ہے، "آج کل" اردو کے ادبی رسالوں میں صفِ اول کا پرچہ سمجھا جاتا ہے جس کے مضامینِ نثر و نظم، تصویریں، گٹ اپ، سب ہی چیزیں دل کش ہوتی ہیں، اردو کی کس مپرسی اور بے نوائی کے اس دور میں جب "آج کل" جیسے رسالے نظر کے سامنے آتے ہیں تو اس مظلوم و مقہور زبان پر کرشمۂ قدرت ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے،

زیر نظر نمبر میں وہ تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن کی "آج کل" جیسے ادبی ماہنامے

سے توقع کی جا سکتی ہے، ۸۸ صفحات کے اس گل دستے میں موجودہ کشمیر سے متعلق نظم و نثر
کے جتنے پھول سجائے گئے ہیں سب کے سب بہار آفریں اور نظر افروز ہیں، کشمیر کی صناعی اور
مناظر کی تصویریں بھی جو اس نمبر میں خاص طور سے شریکِ اشاعت کی گئی ہیں کچھ کم دل آویز
نہیں، ریاست کے حکمرانوں کی تصویروں کا حسن دوبالا ہو جاتا اگر اس جھمگھٹے میں شیرِ کشمیر
شیخ محمد عبداللہ کی تصویر بھی شامل کر دی جاتی، سچ تو یہ ہے اس خوبصورت اور دل پسند
ادبی اور تاریخی نمبر میں یہ خلا ہر صاحبِ ذوق کو محسوس ہوگا۔

مضامین میں "مذہبی رواداری کشمیری تہذیب کی نمایاں خصوصیت" (ڈاکٹر
محمد اشرف) "یہ وہ چمن ہے جس میں خزاں کا گذر نہیں" (عبدالباقی ایم۔اے ایڈیٹر
پیامِ وطن) "کشمیری شخصیت" (پریم ناتھ در) "کشمیریوں کی زندگی، عادات اور
رسم و رواج" (جیالال ناظر) "کشمیر کی جھیلیں" (گھنشیام سیٹھی) خاص طور پر
پڑھنے کے لائق ہیں، نظموں میں رسالے کے چیف ایڈیٹر جناب جوش ملیح آبادی کی
نظم "فضائے کاشمیر" جناب ساغر نظامی کی طویل نظم "کشمیر" رسالے کے اسسٹنٹ
ایڈیٹر جناب جوش ملسیانی کی نظم "نگاروں کا دیس" برسات کے اس پُر بہار موسم
میں بار بار اور جھوم جھوم کر پڑھنے کے قابل ہیں۔

ادارہ "آج کل" نے اگست کے مہینے میں یہ نمبر نکال کر اپنی خوش مذاقی کا نہایت
اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ (ع)

بُرہان

جلد ۳۵ شمارہ ۳

ستمبر ۱۹۵۵ء مطابق محرم الحرام ۱۳۷۵ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

افسوس ہے گذشتہ ماہ میں خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے کم و بیش ۷۷ سال کی عمر میں چند روزہ علالت کے بعد اپنے وطن دہلی میں ہی وفات پائی ۔ مرحوم عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے ۔ دیکھنے میں کمزور و لاغر اور ضعیف و منحنی انسان تھے ۔ لیکن ارادہ و عمل کی قوت بے پناہ رکھتے تھے ۔ ان کی تعلیم قدیم مسلمان خاندانوں کی روایات کے مطابق ہوئی ۔ لیکن جس کو اعلیٰ معیار کہا جاتا ہے اس حد تک نہ تھی انھوں نے اپنی زندگی نہایت ہی معمولی حالت سے شروع کی ۔ یعنی ایک مزدور کی طرح سر پر کتابوں کا بوجھ لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا اور اس طرح اپنی معاش پیدا کرنا ان کی معاشی زندگی کا سب سے پہلا قدم تھا ۔ لیکن اپنی محنت استقلال جذبۂ عمل اور ذہانت کی وجہ سے وہ اس ادنیٰ ترین حالت سے ترقی کر کے ایک ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے جہاں ہر مذہب و ملت کے لاکھوں انسان ان کی عزت کرتے تھے بڑے بڑے والیانِ ریاست ان سے ملنے میں فخر اور مسرت محسوس کرتے تھے ۔ حکومتیں ان کی بات کو گوش توجہ سے سنتی تھیں اور بہت سے لوگ جن میں ہندو ۔ مسلمان ۔ سکھ ۔ عیسائی اور پارسی ۔ مرد و عورت ۔ جوان و پیر سب ہی شامل تھے ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے باعث ان کے ایک ایک فقرہ اور جملہ پر سر دھنتے تھے ۔ ۲۸ء یا ۲۹ء میں بزمانۂ قیام ڈابھیل ایک مرتبہ سورت شہر میں ایک مسلمان بوہرہ کی دکان پر جانے کا اتفاق ہوا تو باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ وہ اور اس کا پورا گھرانہ خواجہ صاحب سے بیعت ہے اور اگرچہ یہ گھرانہ اردو پڑھنے کی استعداد نہیں رکھتا تھا تاہم اس کا معمول یہ تھا کہ خواجہ صاحب کے ہاں سے "درویش" نام کا جو رسالہ نکلتا تھا ۔ سال کے اختتام پر اس کی جلد بندھتی تھی اور ایک مطلا جزدان میں وہ محفوظ رکھ دیا جاتا تھا ۔ عید بقر عید کے دن نماز عید کے بعد سب اہل خانہ کا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ سب لوگ ایک جگہ جمع ہو کر خواجہ صاحب کا فوٹو اور ان کے

رسالۂ درویش کے مجلدات کی زیارت کرتے تھے اور ان کو سر آنکھوں سے لگاتے تھے۔

مشہور شعر ہے

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم قلم کش را بدولت می رسانم

خواجہ صاحب نے جو کچھ ترقی کی اس میں ان کی خواجگی کے علاوہ ان کے قلم کا بہت بڑا حصہ ہے۔ نثر اردو میں وہ ایک طرز نو کے موجد تھے۔ زبان بڑی صاف سلیس۔ شستہ و رفتہ لکھتے تھے۔ نثر میں شاعری کرنے کا ان میں بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ نہایت معمولی سے معمولی چیزوں پر مضمون لکھتے تھے لیکن اپنے حسنِ تخیل اور لطافتِ بیان کے آب و رنگ سے اسے باغ و بہار بنا کر پیش کر دیتے تھے۔ بات میں بات پیدا کرنا ان کی انشار پردازی کا خاص جوہر تھا۔ اس حیثیت سے کوئی شبہ نہیں کہ وہ اردو زبان کے صاحب طرز نامور ادیب اور انشار پرداز تھے۔ غدر دہلی کے افسانے ان کی مشہور کتاب ہے ان میں ادبیت کے ساتھ ساتھ مرحوم دہلی اور اس کی پرانی روایات تہذیب و تمدن کا ماتم کچھ اس سوز و گداز کے ساتھ کیا ہے کہ ناممکن ہے کوئی شخص ان افسانوں کو پڑھے اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں نہ ہوں۔ ان کی ایک نہیں چھوٹی بڑی سیکڑوں کتابیں مضامین اور مقالات ہیں جو زباں دانی۔ انشار پردازی اور لطافتِ بیان کے جواہرات کا خزانہ ہیں۔ اس کے باوجود مولانا عبدالماجد دریابادی کے بقول خواجہ صاحب مرحوم پر یہ بڑا ظلم ہوا ہے کہ ابھی حال میں اردو ادب کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں منٹو۔ کنھیا لال۔ قرۃ العین اور کرشن چندر وغیرہم کو تو خوب اچھالا گیا ہے لیکن خواجہ صاحب کا یا تو سرے سے تذکرہ نہیں یا ہے تو بہت ہی سرسری غالباً آج کل کے ادبی مذاق کی عدالت میں خواجہ صاحب کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ ان کی تحریروں میں کسی نہ کسی حیثیت سے مذہب۔ اخلاق اور تصوف کا رنگ ہوتا تھا اور وہ آج کل کی ترقی پسندی کے ہواخواہوں میں نہیں تھے۔ بہرحال انھوں نے جو ادبی ترکہ چھوڑا ہے وہ اپنی مستقل قدر و قیمت رکھتا ہے اور اس بنا پر یقین ہے کہ جس طرح نظیر اکبرآبادی ایک عرصہ تک بدنام بھی رہے اور گمنام بھی۔ لیکن بہر حال ایک وقت آیا جب اُن کو اپنے کمال کی داد ملی۔ اسی طرح ہمارے زمانہ کے ادیبوں کے نزدیک خواجہ صاحب کا وہ اعتبار نہ ہو جس کے وہ مستحق تھے لیکن ایک وقت آئے گا جب کہ خواجہ صاحب کی ادبی عظمت کا اعتراف کیا جائے گا

خواجہ صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ نہایت خلیق۔ متواضع۔ ملنسار۔ ان کی باتوں میں بڑا رس ہوتا تھا۔ انتہا درجہ حاضر حواس اور بیدار مغز تھے۔ ہمدردی اور غمگساری ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ مخالف سے مخالف بھی ان سے بات کرتا تھا تو ان کی طرف کشش محسوس کرتا تھا۔ مشہور تھا کہ خواجہ صاحب کو عمل تسخیر آتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن سب سے بڑا عمل تسخیر تو ایک انسان کے لئے اس کا اپنا کمال اور اس کے اخلاق ہیں اور خواجہ صاحب میں اس کی کمی نہیں تھی۔ اب یہ وضع داری شرافت۔ مروت۔ اور دوسروں کی پاسداری اور رعایت سب عنقا ہوتے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب

کے اُٹھنے سے ہماری پرانی تہذیب اور کلچر کا ایک بڑا ستون گر گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور جس ذاتِ گرامی کی نبیرگی پر وہ عمر بھر فخر کرتے رہے۔ اسی کے زمرۂ اربابِ اخلاص دوفا میں ان کا حشر کرے۔ آمین۔

صد حیف کہ پچھلے دنوں ہماری بزم انس و محبت کا ایک اور رکن ہم سے بچھڑ گیا۔ یعنی مولانا بشیر احمد صاحب کٹھوری المعروف بہ بھٹہ نے طویل علالت کے بعد وفات پائی۔ مولانا نے اگرچہ علوم عربیہ اور درس نظامی کی۔ سیوہارہ۔ امروہہ اور مرادآباد میں باقاعدہ تکمیل کی تھی۔ لیکن ان کو کبھی ان علوم کے ساتھ اشتغال یا ان کے درس کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے نتیجہ کے اعتبار سے ان کو باقاعدہ وباضابطہ عالم کہنا بھی مشکل ہے۔ لیکن دماغ اور ذہن بلا کا رسا پایا تھا۔ ذہانت اور جودتِ طبع کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ علوم دینیہ و اسلامیہ میں مشغول رہتے تو مولانا عبید اللہ سندھی بنتے۔ اور اگر انگریزی تعلیم حاصل کر لیتے تو سر علی امام یا سر فضل حسین سے کم نہ رہتے۔ بڑے بڑے علما اور انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کی مجلسوں میں جب کسی موضوع پر تقریر کرتے تھے تو اپنے منطقی استدلال اور برہانی طرزِ بیان سے چھا جاتے تھے۔ اور پھر ان کی تردید کرنا آسان نہیں رہتا تھا۔ معاش کے لئے انھوں نے کاروبار کا راستہ اختیار کیا اور اس میں اپنی ذہانت اور محنت سے اس درجہ ترقی کی کہ مٹی سے سونا پیدا کرنے لگے۔ اپنی اینٹوں سے کروڑوں شاندار عمارتیں کارخانے اور فیکٹریاں بنا ڈالیں۔ لیکن خود ہمیشہ مزدوروں کی طرح کام کرتے رہے اور انھیں کی طرح رہتے رہے۔ خلق خدا کی خدمت کا ان میں بے پناہ جذبہ تھا۔ جو شخص بھی ان کے پاس جس کام کے لیے پہنچ جاتا تھا ان کے در سے مایوس نہیں لوٹتا تھا۔ جمعیۃ علمائے ہند کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کا اس جماعت میں بڑا وقار اور امتیاز تھا۔ کانگرس کے بھی بڑے با اثر اور سرگرم کارکن تھے۔ تحریک خلافت اور پھر تحریک آزادی کے زمانہ میں کئی بار جیل گئے جس سے ان کی صحت اور کاروبار کو بڑا نقصان پہنچا۔ لیکن ان کے جوش۔ سرگرمی اور ولولۂ کار میں کبھی فرق نہ آیا۔ قلب و دماغ کی ان خوبیوں کے ساتھ ان میں اخلاقی جرأت بھی کچھ کم نہیں تھی صوبہ اترپردیش کی کونسل کے ممبر تھے اس حیثیت سے مقامی حکومت کی جس روش پر ان کو اعتراض ہوتا تھا اُس کو بڑی قوت اور بے باکی کے ساتھ بیان کرتے تھے اور اس میں کسی قسم کے خوف یا تعلق کے لحاظ کو دخل نہیں دیتے تھے۔ غرض کہ بڑی خوبیوں اور گوناگوں کمالات کے انسان تھے۔ صوبہ یوپی کی خوش قسمتی تھی کہ وہاں بشیر احمد ایسا عاقل و فرزانہ اور زیرک و ہوش مند انسان پیدا ہوا لیکن مولانا بشیر احمد کی بدنصیبی تھی کہ وہ یہاں پیدا ہوئے اور صرف بھٹہ ہو کر رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت و رحمت کی بیش از بیش نعمتوں اور راحتوں سے سرفراز فرمائے کہ یوں بھی دینی۔ روحانی اور اخلاقی اعتبار سے بڑے بلند پایہ بزرگ تھے۔

حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط

از
جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق
(استاذ ادبیات عربی - دہلی یونیورسٹی)

(۳)

۲۲- ابو عبیدہ بن جرّاح کے نام

[فتوح الشام ازدی ص۸۶ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہو کر ذیل کا خط ابو عبیدہ کو لکھا اس خط میں جیسا کہ ہم دیکھیں گے نہ حضرت خالدؓ کی معزولی کا فرمان ہے نہ اپنے خلیفہ ہونے کی خبر، بلکہ صرف حضرت ابو بکرؓ کی وفات کا ذکر ہے - یہ خط حضرت عمرؓ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور معتمد یرفأ کے ہاتھ شام بھیجا تھا - ابو عبیدہ کو یرفأ کی زبانی معلوم ہوا کہ عمرؓ، ابو بکر کے جانشین مقرر ہوئے ہیں نیز یہ کہ نئے خلیفہ نے شام کے فوجی افسران (خالد، یزید بن ابی سفیان، شُرحبیل، سعید بن زید، مُعاذ بن جَبَل، عمرو بن عاص) کے مسلمانوں کے ساتھ طرزِ عمل اور عام چال ڈھال کا حال معلوم کیا ہے - ابو عبیدہ نے فرداً فرداً سب کی تعریف کی اور اپنا اور مُعاذ بن جَبَل کا (جوان کے مشیر خاص اور عزیز دوست تھے) ایک مشترکہ خط حضرت عمر کے نام لکھ کر یرفأ کے ہاتھ مدینہ بھیجا]

"تم کو معلوم ہو کہ ابو بکر صدیق - رسول اللہ کے جانشین دنیا سے کوچ کر گئے، اِنّا للہ، خدا کی رحمت ہو ابو بکر پر جو حق گو، آمر بالقسط، آخذ بالعُرف، راستباز، حلیم اور نرم مزاج تھے، دعا ہے کہ خدا اپنے کرم سے ہم کو ارتکاب گناہ سے محفوظ رکھے اور اپنی خوشنودی کی نعمت سے سرفراز فرمائے، اس کی قدرت میں بلاشبہ سب کچھ ہے، والسلام۔"

حضرت ابوعبیدہ اور معاون کے مشترکہ خط کا خلاصہ

ہمیں معلوم ہے کہ جب ہم آپ کے ساتھ تھے تو آپ کو اپنے تزکیۂ نفس کی کتنی فکر رہتی ہے، اب آپ امت محمدؐ کے کالے گورے کے حاکم ہو گئے ہیں۔ آپ کے سامنے دوست دشمن، بڑے چھوٹے، کمزور طاقت ور سب بیٹھتے ہیں۔ ان سب کے آپ کے ذمہ حقوق ہیں اور سب کے لئے آپ کی میزان عدل میں حصہ ہے، لہذا آپ کو خوب دھیان رہے کہ ان کے ساتھ آپ کا برتاؤ کیسا ہوتا ہے۔ ہم آپ کو اُس دن کی یاد دلاتے ہیں جب سارے راز کھل جائیں گے، اور چھپی برائیاں طشت از بام ہو جائیں گی، گردنیں ایک "سلطانِ غالب" کے سامنے جھکی ہوں گی اور لوگ امید وبیم کا طوفان سینوں میں چھپائے اس کے فیصلہ کے منتظر ہوں گے۔ ہم نے سنا ہے کہ اس قوم میں ایسے لوگ ہوں گے جو ظاہر میں دوست اور باطن میں دشمن ہوں گے، خدا کی پناہ کہ ہمارا تعلق ان لوگوں سے ہو، پس اے عمر اس خط کا وہ مطلب نہ لینا جس کا ہم نے ارادہ نہ کیا ہو، ہم نے محض مخلصانہ جذبہ سے یہ خط لکھا ہے۔[1]

۲۳۔ ابوعبیدہ بن جرّاح کے نام

[یہ خط بے سیاق وسباق ہے، راوی نے صرف اتنا بتایا ہے کہ ابوعبیدہ نے جابیہ کے مقام پر یہ خط مسلمانوں کو پڑھ کر سنایا۔ جابیہ ابوبکر کے زمانہ میں فتح ہو چکا تھا۔ شاید یہ خط حضرت عمر کے ان ابتدائی خطوط میں سے ایک ہے جو خلیفہ ہو کر انھوں نے ابوعبیدہ کو لکھے تھے جب کہ وہ اور خالد دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ دمشق کے قلعہ کے مختلف حصوں پر مختلف کمانڈر مامور تھے، ابوعبیدہ کی کمان میں باب الجابیہ تھا، شاید جابیہ سے مراد یہاں باب الجابیہ ہو، اس صورت میں یہ خط ۱۲ھ یا ۱۳ھ کے اواخر میں لکھا گیا ہوگا۔]

---

[1] ازدی ص۳۳

" تم کو معلوم ہو کہ قانونِ اسلام وہی شخص نافذ کر سکتا ہے جس کی اخلاقی بنیادیں مستحکم ہوں، جو دین کی گہری بصیرت رکھتا ہو، جس کا چال چلن بے داغ ہو، ولا یحیق فی الحق علی جرأۃ (؟) جو صحیح کام کرنے یا حق بات کہنے میں ملامت کی پرواہ نہ کرے، والسلام علیک "[1]

۲۴۔ ابو عبیدہ بن جرّاح کے نام

[مذکورہ بالا خط کے جواب میں حضرت عمر نے ذیل کا خط لکھا، افسوس ہے اس خط کا ایک حصہ غیر مطبوعہ نسخہ کا ایک ورق ضائع ہونے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ گم شدہ ورق کے بعد یہ عبارت آتی ہے، ابو عبیدہ حضرت خالد سے کہہ رہے ہیں :- دنیوی منصب و امارت میری نظر میں اہمیت نہیں رکھتے، ہر چیز کا انجام فنا ہے، ہم دونوں بھائی بھائی ہیں، اگر ایک بھائی افسر یا کمانڈر ہو جائے تو دوسرے بھائی کو نہ تو کوئی دنیوی نقصان پہنچے گا نہ دینی، اس کے علاوہ میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ احتمال ہے اس بات کا کہ افسر آزمائشوں اور غلطیوں سے دوچار ہو" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گم شدہ ورق میں حضرت عمر کا ایک اور خط مشتمل بر معزولی خالد بھی وارد ہوا تھا، اور یہ پہلا نہیں (جیسا کہ مورخوں کا خیال ہے اور جیسا کہ ابتدا میں پیش کردہ خطوط سے ظاہر ہوتا ہے، ملاحظہ ہو برہان ماہ جولائی) بلکہ تیسرا تھا، فتوح اعثم میں وہ سارا واقعہ لکھا ہے جو خالد کی معزولی کا خط موصول ہونے کے بعد پیش آیا، ابو عبیدہ نے معزولی کے حکم اور اپنے سپہ سالار مقرر ہونے کی خالد کو خبر نہیں کی، جنگ ایک نازک مرحلہ میں تھی، خالد اپنی حربی لیاقت کے جوہر دکھا رہے تھے، ابو عبیدہ نہ چاہتے تھے کہ اس خبر سے ان کا حوصلہ پست ہو وہ حسب سابق خالد کی امامت میں نماز پڑھتے رہے کچھ دن بعد دوسرے لوگوں سے جب حقیقت حال کا علم ہوا تو انھوں نے ابو عبیدہ سے شکایت کرتے ہوئے مرکز کا فرمان مخفی رکھنے اور اپنی سپہ سالاری کا اظہار نہ کرنے کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے خود فراموشی اور انکسار میں ڈوبا ہوا وہ جواب دیا جس کا ابھی اوپر ذکر ہوا ہے۔]

[1] تاریخ عمر بن خطاب، ابن جوزی، مصر ص۹۶

"عبداللہ عمر امیرالمومنین کی طرف سے ابوعبیدہ بن جراح اور معاذ بن جبل کو سلام علیک، میں اس خدا کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، میں تم دونوں کو "خوف خدا" کی تاکید کرتا ہوں، خوفِ خدا جس سے مالک کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، جس میں تمہاری خوش نصیبی مضمر ہے جس کو ارباب ہوش دینی و دنیوی سرخروئی کے لئے نسخۂ کیمیا تصور کرتے ہیں۔ تمہارا خط موصول ہوا، تم نے لکھا ہے کہ خلافت سے پہلے تزکیۂ نفس کی آپ کو بہت لگن تھی، یہ تم نے کیسے جانا؟ تمہارے ان الفاظ سے ستائش کی بو آتی ہے، تم نے لکھا ہے کہ میں عرب قوم کا حاکم اعلیٰ ہو گیا ہوں اور اب بڑے چھوٹے، دشمن دوست، قوی اور ضعیف سب میرے سامنے بیٹھتے ہیں اور سب کے لئے میری میزان عدل میں حصہ ہے تم نے لکھا ہے کہ میں اس بات سے چوکنا رہوں کہ میرا برتاؤ ان کے ساتھ یکساں رہتا ہے، تم نے مجھے ایک آنے والے دن سے بھی ڈرایا ہے جو شب و روز کی گردش سے ضرور آئے گا، یہ گردش ہر نئے کو پرانا، ہر بعید کو قریب اور ہر وعدہ کو پورا کر دیتی ہے، یہ قیامت کا دن ہے جب سارے راز کھل جائیں گے، اور چھپی برائیاں ظاہر ہو جائیں گی۔ اور لوگ عاجزی کے ساتھ ایک "سلطانِ غالب" کے حضور میں دل میں امید و بیم کا اضطراب لئے فیصلہ کے منتظر ہوں گے، تم نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس قوم میں ایسے لوگ ہوں گے جو بظاہر دوست لیکن بہ باطن دشمن ہوں گے، میرا خیال ہے ابھی وہ وقت نہیں آیا، یہ منافقت قیامت کے قریب رونما ہو گی، جب دنیوی نقصان کا خوف یا دنیوی فائدہ کی خواہش سے لوگ سرگرم عمل ہوا کریں گے ...... (یہاں سے اصل نسخہ کا ایک ورق کم ہے)

۲۵۔ ابوعبیدہ بن جراح کے نام

[رجب ۱۵ھ میں مسلمانوں نے شام کی سب سے بڑی لڑائی یرموک (علاقہ فلسطین) میں لڑی، اس لڑائی میں رومی قیصر نے عربوں کے اخراج کی ایک شاندار کوشش کی جس میں قلمرو کی بہترین عسکری قوت سمیٹ کر کئی لاکھ فوج کی شکل میں جمع کی گئی تھی، اس کی تعداد مختلف مورخین

نے مختلف دی ہے۔ ۲ لاکھ چالیس ہزار، ۳ لاکھ، ۴ لاکھ اور آٹھ لاکھ، اس لشکر کا ایک بڑا حصہ موت یا فتح کا حلف لے کر آیا تھا، نزاکت میں قادسیہ سے زیادہ سنگین تھی، اس میں شکست کھا کر رومی قیصر قسطنطنیہ چلا گیا اور اس کی جارحانہ قوت شام میں ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ اس عظیم الشان فتح کی خوش خبری ابوعبیدہ نے مرکز کو دی تو حضرت عمر نے ذیل کا خط لکھا]

عبداللہ عمر امیر المومنین کی طرف سے ابوعبیدہ بن جراح کو سلام علیک، اس خدا کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، تمہارا خط آیا، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ خدا نے مشرکین کو ہلاک کیا، اور مؤمنین کو فتح عطا کی، اپنے فدائیوں کو عنایات سے نوازا، خدائے پاک کا ان نوازشوں کے لئے شکر گذار ہوں اور ان نوازشوں کو شکر کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی التجا کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ تم کو دشمن پر اپنی قوت تعداد یا سامان کے ذریعہ فتح نہیں ہوئی، بلکہ محض ایزدی مدد اور احسان اور کرم کی بدولت۔ خدا ہی کی مدد حقیقی مدد، اسی کا احسان حقیقی احسان اور اسی کا فضل حقیقی فضل ہے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ والحمد للّٰهِ رب العالمین، والسلام۔

۲۶- عمارؓ بن یاسر کے نام[۲]

[عیسائی ملت و دیانت کے مرکز ایلیا، (بیت المقدس) کا کئی بار محاصرہ ہوا مگر وہاں کے باشندوں نے قیصر کی مدد کے بھروسہ پر نیز مسلمانوں کی اجنادین، پھر فحل اور پھر یرموک میں شکست کی امید پر ہتھیار نہ ڈالے، فتح یرموک اور متروکہ علاقوں پر پھر قبضہ کرنے کے بعد ابوعبیدہ نے ایلیا کا از سر نو در ہر بار سے سخت تر محاصرہ کیا۔ شہر کے باشندے اس شرط پر سپر ڈالنے اور صلح کرنے پر راضی ہوئے کہ حضرت عمر خود آ کر شرائط صلح طے کریں۔ ابوعبیدہ کی صلح جو طبیعت نے یہ شرط مان لی، اور

---

[۱] فتوح شام واقدی میں فتح یرموک کی خوش خبری پر حضرت عمر کا جو جوابی خط نقل ہوا ہے وہ ازدی کے اس خط سے بہت مختلف ہے۔ واقدی کا یہ خط اگست کے برہان میں چھپا ہے ۔ (ازدی، ص۲۲۱)

[۲] عمار بن یاسر ۲۱ھ میں کوفہ کے گورنر ہوئے اور کوئی سولہ ماہ بعد ۲۲ھ میں اہل کوفہ کی شکایت پر معزول کئے گئے۔...

حضرت عمر کو بلایا، حضرت عمر نے آکر صلح لکھی ۱۵ھ، ان کے قیام کے دوران میں فلسطین کے گورنر عمرو بن عاص نے آکر کہا کہ یہاں کے باشندے انگور کا شربت پیتے ہیں، کیا مسلمان بھی اس کو پی سکتے ہیں؟ حضرت عمر نے اس کے بنانے کا طریقہ پوچھا تو انھوں نے کہا کہ عرق کو (سڑنے سے پہلے) پکایا جاتا ہے، جب پکتے پکتے اس کا قوام ایک تہائی رہ جاتا ہے تو اس کو بطور شربت پی تے ہیں۔ حضرت عمر نے اجازت دے دی اور ذیل کا خط عمار بن یاسر[1] (گورنر کوفہ) کو لکھا]

"تم کو معلوم ہو کہ میں شام گیا تھا، وہاں کے لوگ میرے پاس ایک شربت لاتے تو میں نے اس کے بنانے کی ترکیب پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ (انگور کے) عرق کو اس قدر پکایا جاتا ہے کہ اس کی کچاند دور ہو جاتی ہے اور اس کا وہ حصہ جو حرام ہے نکل جاتا ہے اور وہ حصہ جو اچھا اور حلال ہے بچ رہتا ہے، تمہاری کمان میں جو مسلمان ہیں ان کو ہدایت کردو کہ یہ شربت پیا کریں والسلام۔

۲۷۔ ابو عبیدہ بن جرّاح کے نام

[جب شام میں طاعون کی وبا بڑھی (۱۸ھ) اور حضرت عمر کو معلوم ہوا کہ ابو عبیدہ شام چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں (وہ عقیدۃً قضا و قدر سے بھاگنے کے مخالف تھے) تو حضرت عمر نے ان کو خطرہ سے نکالنے کے لئے ذیل کا خط لکھا]

"سلام علیک، ایک ضروری معاملہ آن پڑا ہے جس میں تم سے زبانی گفتگو کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا سخت تاکید ہے کہ اس خط کو پڑھتے ہی چل دو"

اس خط کے جواب میں ابو عبیدہ نے لکھا: ـــ امیر المومنین، آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ میری موجودگی کی آپ کو ضرورت ہے، مگر میں مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ ہوں، اور ان کو چھوڑنے

---

[1] عمار بن یاسر ۲۱ھ میں کوفہ کے گورنر ہوئے اور کوئی سولہ ماہ بعد ۲۲ھ میں اہل کوفہ کی شکایت پر معزول کئے گئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ خط اگر صحیح ہے تو صلح ایلیا (۱۵ھ) کے پانچویں سال لکھا گیا ہوگا۔

کے لئے کسی طرح دل تیار نہیں ہوتا، موت ہی مجھ کو ان سے جدا کر سکتی ہے، اس لئے ملتجی ہوں کہ اپنی تاکید واپس لے لیجئے اور لشکر میں رہنے دیجئے۔[۱]

۲۸- ابوعبیدہ بن جرّاح کے نام

[ابوعبیدہ کا خط پڑھ کر حضرت عمر کے آنسو نکل آئے، لوگوں نے پوچھا کیا خدانخواستہ ابوعبیدہ کا انتقال ہوگیا، بولے نہیں، لیکن سمجھنا یہی چاہئے۔ اس کے بعد ذیل کا خط لکھا۔]

سلام علیک، تم جہاں مسلمانوں کے ساتھ مقیم ہو وہ نشیبی علاقہ ہے، میں چاہتا ہوں۔ ان کو بلند اور صاف ستھری جگہ لے جا کر کیمپ لگاؤ۔[۲]

۲۹- ابوعبیدہ بن جرّاح کے نام

[ابوعبیدہ نے شام میں مرکز کو خبر دی کہ مسلمانوں کی ایک جماعت شراب نوشی کی مرتکب ہوئی ہے اور قرآن کی آیت: "فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ" کو بطور حجت پیش کرتی ہے کہ اس سے شراب سے اجتناب کا حکم نہیں نکلتا۔ حضرت عمر نے لکھا]

"ان لوگوں کو طلب کرو، اگر ان کا عقیدہ ہو کہ شراب حلال ہے تو ان کو قتل کر دو، اور اگر وہ تحریم کے قائل ہوں تو (بطور سزا) اسّی کوڑے مارو"

[اس خط کے بموجب ابوعبیدہ نے مرتکبین شراب کو بلایا اور مجمع عام میں ان سے دریافت کیا تو انھوں نے تسلیم کیا کہ شراب حرام ہے، چنانچہ ان کو حد لگائی گئی، پبلک میں رسوا ہو کر یہ لوگ ایسے شرمندہ ہوتے کہ گھر میں بیٹھ گئے اور باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ صحابی ابوجندل زیادہ حساس تھے، ان کا دماغی توازن خراب ہوگیا، اس کی خبر سپہ سالار نے مرکز کو دی اور حضرت عمرؓ سے ابوجندل کے نام تسلی آمیز خط لکھنے کی سفارش کی۔]

---

[۱] طبری، مصر، ۴/ ۲۰۱ [۲] طبری، مصر، ۴/ ۲۰۷

۳۰۔ ابوجندل کے نام

"عمر کی طرف سے ابوجندل کے نام، خدا ان لوگوں کی خطا کبھی نہیں معاف کرے گا جو اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں، اس سے کم درجہ کے خطاداروں کو اگر اس کی مرضی ہوگی تو معاف فرمادے گا، لہذا تم توبہ کرو، سر ندامت اُٹھاؤ، باہر نکلو، اور مایوس نہ ہو، اللہ عزوجل فرماتا ہے:- یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا، اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ"[1]

۳۱۔ خالد بن ولید کے نام

[حضرت عمر کو معلوم ہوا کہ خالد ایک شامی حمام میں غسل کرنے گئے (غالباً بمقام قنسرین) تو انھوں نے عصفر نامی ابٹن سے جو شراب سے گوندھا گیا تھا، مالش کی، اس اطلاع پر یہ خط لکھا گیا]

مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے (مرکب) شراب سے جسم کی مالش کی، حالانکہ خدا نے شراب کو خواہ وہ خالص ہو یا کسی چیز میں ملی ہوئی، دونوں طرح حرام قرار دیا ہے، جس طرح ظاہری اور پوشیدہ معصیت کو ممنوع فرمایا ہے۔ خدا نے شراب کو چھونے سے بالکل اسی طرح منع کیا ہے جس طرح اس کو پینے سے الا یہ کہ اس کو دھونے کے لئے چھونا پڑے، واضح ہو کہ شراب نجس ہے، اس کو جسم تک نہ لگاؤ، اور اگر غلطی سے لگالیا ہو تو آئندہ اس کا اعادہ نہ کرو۔"

خالد نے صفائی کے طور پر لکھا کہ ابٹن میں اتنا زیادہ پانی ملا دیا گیا تھا کہ شراب پانی کے حکم میں آگئی تھی، حضرت عمر نے جھنجھلا کر لکھا:-

"میں سمجھتا ہوں کہ مغیرہ کی اولاد اکھڑ ہوگئی ہے، خدا تم کو اس حالت میں دنیا سے نہ اُٹھائے۔"[2]

---

[1] طبری، مصر، ۴/۲۲۲-۲۳　[2] طبری ۴/۲۰۴

۳۲۔ مرکزی شہروں کے مسلمانوں کے نام

[سنہ ۱۷ھ میں خالد نے ابو عبیدہ کے ایما پر شام کی بازنطینی مملکت کی مشترکہ سرحد پر حملہ کیا، اس حملہ میں مسلمانوں کے ہاتھ بہت زیادہ دولت آئی، اور اس کی خبر ہر طرف پھیل گئی جب خالد ہیڈ کوارٹر (قنسرین) لوٹے تو دور دور سے حاجت مند ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں ین کے ایک بااثر اور خود دار قبائلی سردار اشعث بن قیس بھی تھے خالد نے ان کو دس ہزار درہم (تقریباً سوا پانچ ہزار روپئے) کا عطیہ دیا۔ خالد کی داد و دہش کی خبریں حضرت عمر کو پہنچیں، انھوں نے ابو عبیدہ کو لکھا کہ خالد کی ٹوپی اتاریں اور ان کے عمامہ سے ان کو باندھیں، اور دریافت کریں کہ اشعث بن قیس کو عطیہ ذاتی روپئے سے دیا یا سرکاری روپئے سے، اگر ذاتی روپیہ سے دیا تو فضول خرچی کی، اور دوسروں کے لئے بری مثال قایم کی، اور اگر سرکاری روپیہ سے دیا تو خیانت کے مرتکب ہوئے، نیز یہ کہ تحقیق سے جو بات ثابت ہو بہر حال خالد کو فوجی منصب سے معزول کیا جاتے۔ ابو عبیدہ نے خالد کو اپنے ہیڈ کوارٹر طلب کیا، پھر مجمع عام میں حضرت عمر کے ایلچی نے خالد سے پوچھا کہ اشعث کو عطیہ ذاتی روپئے سے دیا تھا یا سرکاری روپئے سے، خالد بالکل خاموش رہے اور اس کے اصرار کے باوجود مہر سکوت نہ توڑی، ابو عبیدہ جو خالد کے حربی کمالات اور خوبیوں کے بہت قدردان تھے، اور طبعاً مرنجان مرنج واقع ہوتے تھے، چپکے بیٹھے یہ رسواکن تماشا دیکھتے اور دل میں کڑھتے رہے خالد سے احتجاج کا ایک لفظ نہ کہہ سکے، رسول اللہ کے موذن بلال موجود تھے، وہ جہاد کے لئے ابوبکر سے اجازت لے کر شام کے محاذ پر آگئے تھے، صاف گو اور بے دھڑک آدمی تھے، انھوں نے کھڑے ہو کر کہا: امیر المؤمنین کا ایسا ایسا حکم ہے، یہ کہہ کر خالد کی ٹوپی اُتاری اور عمامہ سے ان کو باندھا اور وہی سوال کیا جس کا اوپر ذکر ہوا۔ خالد نے کہا میں نے ذاتی روپئے سے عطیہ دیا تھا، بلال نے ٹوپی اُٹھا دی، عمامہ کھول دیا اور معذرت کی۔ ابو عبیدہ خالد کی دل آزاری کے خیال سے نہ کہہ سکے کہ خالد تم کو معزول کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد حضرت عمر نے خالد کو مدینہ طلب کیا۔ خالد ابو عبیدہ کے ہیڈ کوارٹر سے اپنے ہیڈ کوارٹر قنسرین واپس ہوئے اور اپنی ماتحت فوج سے اس برتاؤ کی شکایت کی جو ان کے ساتھ مرکز کی طرف سے ہوا۔ ان سے رخصت ہو کر حمص پہنچے اور وہاں کے مسلمانوں کو بھی یہ رسواکن قصہ سنایا، پھر مدینہ چلے گئے۔ مدینہ پہنچ کر حضرت عمر سے ملاقات ہوئی تو بولے: عمر تم نے میرے ساتھ بدسلوکی کی ہے، میں مسلمانوں سے اس کی شکایت کر آیا ہوں۔ عمر نے پوچھا: یہ دولت تمہارے پاس کہاں سے آئی؟، انھوں نے کہا یہ ان حصوں پر مشتمل ہے جو مال غنیمت سے مجھ کو دئے گئے، ساٹھ ہزار سے جو کچھ زیادہ ہو وہ آپ لے سکتے ہیں۔ خالد کے سارے مال ومتاع کا تخمینہ لگایا گیا، تو اسی ہزار قیمت اٹھی، اس میں سے بیس ہزار حضرت عمر نے لے کر بیت المال میں جمع کر دئے، پھر خالد سے کہا: خدا کی قسم میں تمہاری عزت کرتا ہوں اور دل سے تمہارا قدردان ہوں، اب پھر کبھی تم کو ملامت کرنے کا موقع نہ دوں گا۔" اس واقعہ کے بعد سارے اسلامی مرکزوں (امصار) کو ذیل کا خط لکھا۔[1]]

"میں نے خالد کو ناراضی یا خیانت کی بنا پر معزول نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ خالد کی داد و دہش کے طالب ہو گئے اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اس طرح وہ اپنی محنت کی بجائے ان کے دست کرم کے محتاج ہو جائیں گے اور ان میں مفت خوری کی عادت پیدا ہوگی، میں نے مناسب سمجھا کہ خالد کا وسیلہ ہٹا کر ان کو اس بات کا احساس دلاؤں کہ حاجتوں کا ملجا و ماویٰ خدا ہے اور اس سے مدد کے طالب ہوں اور مفت خوری کی آزمائش میں نہ پڑیں۔"[2]

۲۳- یزید ابن ابی سفیان کے نام

[عام طور پر مشہور ہے کہ سنہ ۱۸ھ میں شام کے ہولناک طاعون سے (جس میں بقول بعض ۲۳ ہزار

---

[1] میں نے اس خط کا پس منظر ذرا تفصیل سے اس لئے لکھا ہے کہ حضرت عمر کے عتاب اور خالد کی معزولی و رسوائی کے بارے میں بعض مورخوں نے مبالغہ اور رنگ آمیزی سے کام لیا ہے۔ اوپر کا بیان غالباً سب سے زیادہ صحیح تصویر ہے [2] (طبری/۴/۲۰۵)

اور بقول بعض ۲۶ ہزار مسلمان ہلاک ہوئے) حضرت ابو عبیدہ کی وفات ہوئی، مرتے وقت انھوں نے اپنے مخلص دوست اور مشیر معاذ بن جبل کو اپنا جانشین مقرر کیا، چند دن بعد معاذ بھی طاعون کی نذر ہوئے انھوں نے مرتے وقت عمرو بن عاص کو جانشین مقرر کیا، مگر حضرت عمر نے شام کی فوجوں کی کمان ابو سفیان کے لڑکے یزید کو مفوض کی۔ ازدی کی فتوح شام میں لکھا ہے:- یزید سمجھدار، بردبار اور مہربان آدمی تھے، ہنس مکھ، عافیت پسند اور مقبول خاص وعام بھی تھے، اس کے علاوہ پرانے مہاجر اور رسول اللہ کے برگزیدہ صحابی تھے[1]

"تم کو معلوم ہو کہ میں نے تمام مفتوحہ شام کی فوجوں کا تم کو سالار مقرر کیا ہے، اور فوجوں کو لکھ دیا ہے کہ تم کو اپنا سپہ سالار مانیں اور تمہارے حکم کی تعمیل کریں، اور کسی معاملہ میں تمہاری صوابدید کی خلاف ورزی نہ کریں۔ جلد فوجیں مرتب کر کے قیساریہ کی طرف پیش قدمی کرو اور اس وقت تک محاصرہ کئے رہو جب تک یہ اہم مقام فتح نہ ہو جائے، شام کی فتوحات اس وقت تک مکمل اور فائدہ مند نہ ہوں گی جب تک قیساریہ کے باشندے سپر نہ ڈال دیں گے، وہ تمہارے پہلو کا خار ہیں۔ اس کے علاوہ جب تک شام میں ایک شخص بھی قیصر کا مطیع ومتبع ہے وہ شام کا خیال نہیں چھوڑے گا، اگر تم قیساریہ فتح کر لوگے تو شام سے اس کی توقعات منقطع ہو جائیں گی، امید ہے خدائے برتر وعظیم مسلمانوں پر نوازش کر کے قیساریہ ضرور فتح کرائے گا۔"

۳۴- فوجی کمانڈروں کے نام

تم کو مطلع کیا جاتا ہے کہ میں نے یزید ابن سفیان کو شام کی تمام فوجوں کا سپہ سالار مقرر کر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ قیساریہ پر چڑھائی کریں۔ ان کے حکم اور صوابدید کی پوری تعمیل لازم سمجھو۔ والسلام۔[2]

۳۵- معاویہ بن ابی سفیان کے نام

[قیساریہ کی فتح فتوح الشام ازدی اور فتوح البلدان بلاذری کے مطابق سنہ ۱۹ھ میں

---

[1] رجال کی کتابوں میں یزید کو فتح مکہ کے نومسلموں میں بتایا جاتا ہے۔ اس لئے ان پر پرانے مہاجر کا اطلاق صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ [2] (ازدی، صفحہ ۲۵۱ و ۲۵۲)

ہوئی یعنی ابو عبیدہ بن جراح کی وفات کے دوسرے سال، لیکن طبری کے راوی ۱۵ھ میں قیساریہ کی فتح بتاتے ہیں جب کہ ابو عبیدہ شام کے گورنر تھے۔ فتوح الشام ازدی کے مطابق یزید بن ابی سفیان نے حضرت عمرؓ کے حکم سے قیساریہ کا محاصرہ کیا اور جب محاصرہ نے طول کھینچا اور محصورین نقصان خطیر اٹھا کر صلح کے لئے کچھ کچھ مائل ہونے لگے تو وہ قیساریہ کی کمان اپنے بھائی معاویہ کو دے کر خود ہیڈ کوارٹر لوٹ گئے، کچھ دن بعد معاویہ نے محاصرہ کی گرفت سخت تر کر کے قیساریہ فتح کر لیا (فتوح الشام ازدی، ص۲۵۰)۔ طبری کے راوی کہتے ہیں کہ ۱۵ھ میں حضرت عمر نے براہ راست معاویہ کو قیساریہ کی مہم سپرد کی اور ذیل کا خط لکھا[۱]]

"واضح ہو کہ قیساریہ کی مہم تمہارے سپرد کرتا ہوں، فوجیں لے کر اس پر چڑھائی کردو، اور اہل قیساریہ پر فتح کے لئے خدا سے مدد کی التجا کرو، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ کا خوب ورد کرتے رہو، خدا ہی ہمارا مالک ہے، وہی ہمارا بھروسہ ہے، وہی ہمارا سردھرا ہے، اس سے ہم امید لگاتے ہیں، نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْر۔" (باقی)

[۱] طبری، مصر، ۴/ ۱۵۶

اَلعِلم وَالعُلَمَاء

ایک شاندار اور بابرکت کتاب

یہ جلیل القدر امام حدیث "علامہ ابن عبد البر" کی شہرۂ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے۔ کتاب کا ترجمہ مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی نے کیا ہے جو اس دور کے بے مثال ادیب اور مترجم سمجھے جاتے ہیں موصوف نے یہ ترجمہ مولانا ابو الکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا۔ علم اور فضیلت علم کے بیان، اہل علم کی عظمت اور اُن کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی۔ اس متبرک کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے۔ موعظتوں اور نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک مرتبہ ضرور پڑھئے۔ صفحات ۰۰ ۳ بڑی تقطیع۔ قیمت غیر مجلد للعہ۔ مجلد ۶عہ

تزک بابری

مترجمہ

(جناب محمد رحیم صاحب دہلوی)

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ	کہہ اے ملک کے مالک خدا، تو جس کو چاہے ملک
مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ	دے اور جس سے چاہے حکومت چھین لے - اور تو
تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ	جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے
مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ	تمام خوبیاں تیرے قبضہ میں ہیں - تو بے شک
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ	ہر چیز پر قادر ہے -

خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ اور ان کے بزرگ و برتر اصحابؓ اور گرامی احبابؓ پر قیامت تک لاتعداد درود پہنچیں -

ظہیر الدین محمد بابر ولد عمر شیخ مرزا تیموری لکھتا ہے - کہ میں نے اپنے زمانے کے حالات اور واقعات کے بارے میں یہ مختصر حال اپنی آل اولاد کے لئے بطور یادگار لکھا ہے[1]:-

تخت نشینی | میری عمر بارہ برس کی تھی اور ۸۹۹ھ کے رمضان کی پانچ تاریخ تھی کہ میں ملک فرغانہ کا بادشاہ بنا[2]۔

فرغانہ کرۂ زمین کے پانچویں حصے میں ہے - اور معمورۂ عالم کے کنارہ پر ہے - اس کے مشرق میں کاشغر، مغرب میں سمرقند، جنوب میں بدخشاں کی پہاڑیاں، اور شمال میں جنگل بیابان ہے - اب سے پہلے اس جنگل میں المالیغ[3]، الماتو[4] اور یانگی (جسے تاریخوں میں اُطرار[5] بھی لکھا ہے)

---

[1] بابر نے اپنی تزک ترکی میں لکھی تھی - بیرم خاں خان خاناں نے شہنشاہ اکبر کے حکم سے اس کا فارسی ترجمہ کیا - انگریزی میں الفنسٹن اور مسٹر جان لیڈی نے اس کے ترجمے کئے ہیں۔ [2] ۲ رجون ۱۴۹۴ء [3] المالیغ یا المالیگ سیب کے درختوں کے جھنڈ کو کہتے ہیں - یہ جگہ کاشان کے شمال میں الاتاغ کے پہاڑوں کے دوسری طرف ہے [4] الماتو اس زمین کو کہتے ہیں جہاں سیب بکثرت پیدا ہوتے ہوں [5] تاشقند اور ارال کی جھیل کے بیچ میں یہ مقام ہے - تیمور، چین پر حملہ کے

جیسے بہت سے شہر آباد تھے۔ مگر ازبکوں کے حملوں سے اب ایسی ویرانی ہے کہ کہیں نام کو بھی آبادی نہیں رہی۔

فرغانہ کا علاقہ اگرچہ بڑا نہیں ہے۔ مگر یہاں غلوں اور میووں کی پیداوار بہتات سے ہے۔ پہاڑوں کا سلسلہ اس علاقہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ صرف مغرب کی طرف جدھر سمرقند اور خجند ہیں پہاڑ نہیں ہیں۔ باہر کا دشمن اسی طرف سے اندر آسکتا ہے۔ دوسری کسی طرف سے نہیں۔

دریائے سیحون | دریائے سیحون[1] جو دریائے خجند کے نام سے مشہور ہے شمال و مشرق کے بیچ میں سے آکر فرغانہ کے درمیان میں بہتا ہوا مغرب کی طرف جاتا ہے اور خجند کی شمالی جانب اور دفناکت[2] (جسے اب شاہرخیہ کہتے ہیں) کے جنوب میں سے گذرتا ہے اور پھر شمال کی طرف مائل ہوتا ہوا ترکستان چلا جاتا ہے اور ترکستان کے نشیب میں سارا دریا ریگستان میں جذب ہو جاتا ہے۔

فرغانہ میں سات شہر ہیں۔ پانچ اس دریا کے جنوب میں اور دو شمال میں ہیں۔

اندجان | اندجان دریا کے جنوب کی طرف ہے اور فرغانہ کے بیچ میں ہے۔ یہ یہاں کا دارالحکومت ہے۔ اور بہت سرسبز مقام ہے۔

یہاں غلے اور میوے کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ انگور اور خربوزوں کی بہتات ہے اور یہ بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ دستور یہ ہے کہ خربوزوں کی فصل میں انھیں فالیز پر نہیں بیچتے۔ ناسپاتی یہاں سے اچھی کہیں نہیں ہوتی۔

اندجان کا قلعہ پورے ماوراءالنہر[3] میں سمرقند اور کیش کے قلعوں کے سوا سب سے بڑا قلعہ ہے

---

[1] وسطی ایشیا کا مشہور دریا ہے [2] اس کو تباکت اور فناکت بھی کہتے ہیں [3] اس کو ترکستان بھی کہتے ہیں۔ یہ وسطی ایشیا کا وہ علاقہ ہے۔ جہاں ترک نسل کے لوگ آباد ہیں۔ ایرانی قدیم زمانے میں اس کو توران کہتے تھے۔ فردوسی کے شاہنامہ کی رزمیہ داستان کا تعلق اسی توران سے ہے۔ انقلاب عالم نے اب لفظ ترکستان کو وسطی ایشیا کے نقشہ سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔ اور اب یہ علاقہ پانچ حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ (۱) ترکی کی موجودہ سلطنت (۲) بدخشاں اور بلخ کے کچھ علاقے جو اب افغانستان میں شامل ہیں (۳) سلطنت پاکستان میں صوبہ سرحد کے کچھ علاقے جنہیں پختونستان کہتے ہیں (۴) چینی حکومت میں سنکیانگ کا علاقہ۔ چینی زبان میں سنکیانگ، نو آبادی کو کہتے ہیں (۵) روسی ترکستان۔ اس علاقہ کو اب پانچ حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ازبکستان۔ ترکمانستان۔ تاجکستان

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ں کے تین دروازے ہیں۔ شاہی محل شہر کے جنوب میں ہے۔ شہر میں نو نہریں بہتی ہیں۔ عجیب
ت یہ ہے کہ یہ سب نہریں ایک جگہ سے نہیں نکلتیں۔ قلعہ کے چاروں طرف ایک سنگین خندق
ہے۔ خندق کے کنارے کنارے سڑک بنی ہوئی ہے۔ سڑک پر روڑی کا فرش ہے۔ قلعہ کے چاروں
رف محلے آباد ہیں۔ قلعے اور محلوں کے بیچ میں یہ سڑک حد بندی کا کام دیتی ہے۔

یہاں کے جنگل میں شکار کی بہت کثرت ہے۔ ہرن بڑا موٹا تازہ ہوتا ہے۔ مشہور ہے
ایک ہرن کا سالن اتنا ہوتا ہے کہ چار آدمیوں کا پیٹ بھر جاتے اور پھر بھی بچ رہے۔

یہاں کے رہنے والے سب ترک ہیں۔ شہر اور بازار میں کوئی آدمی ایسا نہیں جو ترکی زبان
نہ جانتا ہو۔ یہاں کے عام آدمیوں کی زبان بھی ایسی شستہ ہے۔ جیسے اہل قلم کی ہوتی ہے۔ میر علی
شیر نوائی کی تصانیف دیکھئے۔ حالانکہ وہ ہرات میں پلا بڑھا۔ مگر اس کی کتابیں ترکی میں ہیں۔

یہاں کے آدمی بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ خواجہ یوسف جو موسیقی کے مشہور استاد ہیں
اندجان ہی کے تھے۔ یہاں کی ہوا میں بدبو ہے۔ آنکھیں دُکھنی عام بات ہے اور ورم چشم کا مرض
بھی عام ہوتا ہے۔ اس کو طبیب اپنی زبان میں قرب کہتے ہیں۔

اوش | اوش، اندجان کے گوشہ جنوب و مشرق میں مشرقی جانب مائل ہے اور اندجان سے ۶ میل[1]
کے فاصلہ پر ہے۔ اوش کی آب و ہوا نہایت اچھی ہے۔ جگہ جگہ نہریں ہیں۔ بہار کا موسم نہایت
عمدہ ہوتا ہے۔ اوش کی فضیلت میں کئی حدیثیں ہیں۔

قلعہ کے جنوب و مشرق میں ایک خوشنما پہاڑ ہے۔ جنوب و مشرق کے بیچ میں پہاڑ کی چوٹی
پر ایک ٹیلا ہے۔ جسے براکوہ کہتے ہیں۔ سلطان محمود خاں[2] نے وہاں ایک چھوٹا سا مکان بنوایا تھا۔
میں نے ۹۰۲ھ (۱۴۹۶ء) میں اس کے نیچے پہاڑ کی چوٹی پر ایک بارہ دری بنائی۔ پہلا مکان اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کرغیز۔ قزاقستان۔ بخارا اور خیوا کے علاقے ترکمانستان میں شامل ہیں فرغانہ اور بدخشاں وغیرہ کو تاجکستان میں ملا دیا گیا ہے۔ روسی ترکستان کے ان پانچوں علاقوں میں اب بھی مسلمان بہت بڑی اکثریت میں ہیں

[1] چار فرسنگ۔

[2] سلطان محمود خاں، بابر کا ماموں تھا اور مغلستان کا حاکم تھا۔

سے اونچی جگہ ہے - مگر میری بنائی ہوئی عمارت اس سے بہتر ہے - وہاں سے شہر اور شہر سے باہر کی آبادی اچھی طرح نظر آتی ہے -

اندجان والی ندی[1] اوش کے محلوں میں سے ہوتی ہوئی اندجان جاتی ہے - اس ندی کے کناروں پر باغ ہی باغ ہیں - باغوں میں سے ندی کا منظر بہت خوب ہے -

یہاں بنفشہ بڑی کثرت سے ہوتی ہے - جگہ جگہ پانی کی نہریں بہتی ہیں - موسم بہار میں گل لالہ اور گلاب خوب بہار دکھاتا ہے - پہاڑ کے دامن میں باغ اور شہر کے بیچ میں ایک مسجد ہے - اس کا نام مسجد جوزا ہے - اس کے صحن میں تین حوض ہیں - پہاڑ میں سے ایک بڑی ندی بہتی ہوئی آتی ہے - اور ان تینوں حوضوں کو پانی سے لب بہ لب رکھتی ہے - حوض نہایت صاف و شفاف ہیں - مسافر اور راہ گیر جو ادھر سے گذرتے ہیں - یہاں دم لیتے ہیں - اوش کے اوباش ہنسی میں کہا کرتے ہیں کہ "ہر کس دریں میدان خواب کرد از یں[3] جو آب می گزراند"

میرے والد کے آخری زمانہ میں اس پہاڑ میں سے سرخ و سفید رنگ کا ابری کا پتھر نکلا تھا - اس پتھر سے چھریوں کے دستے وغیرہ بناتے ہیں - یہ پتھر بہت خوبصورت ہوتا ہے -

فرغانہ میں خوش بنائی اور آب و ہوا کے اعتبار سے اوش جیسا کوئی دوسرا شہر نہیں ہے -

مرغینان | مرغینان، اندجان کے مغرب میں ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے اور اچھا شہر ہے - وہاں انار اور خوبانیاں نہایت عمدہ ہوتی ہیں - انار کی ایک خاص قسم ہے - اسے دانۂ کلاں کہتے ہیں - اس میں مٹھاس کا رس ہوتا ہے یہ انار سمنان کے اناروں سے بھی اچھے ہوتے ہیں - . . . . . .

. . . .

. . . . خوبانیوں کی ایک خاص قسم ہے - اس کی گٹھلی نکال لیتے ہیں اور گٹھلی کی جگہ بادام رکھ کر اسے خشک کرتے ہیں اس کو سبحانی کہتے ہیں - یہ بہت لذیذ ہوتی ہے -

---

[1] یہ ندی دریائے سیر کے معاونوں میں سے ہے -
[2] سمنان، خراسان اور عراق کے بیچ میں دامغان کے قریب ایک شہر ہے -

یہاں جانور اور شکار بہت ہے ۔ سفید ہرن[1] قریب ہی مل جاتا ہے ۔

شہر کے باشندے سب کے سب تاجیک[2] ہیں ۔ یہ مفسد، لڑاکا اور فتنہ انگیز ہوتے ہیں۔ تمام ترکستان میں اپنی اس خصوصیت میں مشہور ہیں ۔ سمرقند اور بخارا میں جو مفسد ہیں۔ وہ مرغینان ہی کے رہنے والے ہیں ۔

ہدایہ[3] کے مصنف موضع رشدان کے باشندے تھے ۔ یہ قصبہ مرغینان ہی کے علاقہ میں ہے

اسفرہ | اسفرہ، مرغینان کے جنوب مغرب کی طرف ۳۶ میل کے فاصلہ پر پہاڑ کے نیچے آباد ہے ۔ اس میں جگہ جگہ نہریں بہتی ہیں ۔ درختوں کی کثرت ہے ۔ اور نہایت اعلیٰ قسم کے باغیچے ہیں۔ ان میں بادام کے درختوں کی بہتات ہے ۔ یہاں کے باشندے تاجیک اور پہاڑی ہیں ۔

یہاں سے جنوب کی جانب چار میل کے فاصلہ پر پہاڑ کے ٹیلوں میں پتھر کی ایک سل ہے ۔ اس کو سنگِ آئینہ کہتے ہیں ۔ اس کی لمبائی دس گز کے قریب ہے ۔ کہیں سے وہ اتنی اونچی ہے کہ آدمی کے قد کے برابر ہے اور کہیں سے اتنی نیچی ہے کہ آدمی کی کمر کے برابر ہے ۔ آئینہ کی طرح شفاف ہے اور اس میں ہر چیز کا عکس دکھائی دیتا ہے ۔

اسفرہ کے علاقہ میں پہاڑ کے نیچے چار گاؤں آباد ہیں ۔ اسفرہ ۔ وارخ ۔ سوخ ۔ ہشیار

جس زمانے میں شیبانی[4] خاں نے سلطان محمود خاں اور الچہ خاں کو ہرا کر تاشقند اور شاہرخیہ

---

[1] اس ہرن کو آہو وراق کہتے ہیں [2] تاجک انہیں کہا کرتے ہیں ۔ جو عرب میں پیدا ہوئے اور فارس میں پرورش پائی ۔ ترک انھیں تاجک اس نسبت سے کہتے ہیں کہ اُن کے بزرگ عرب سے آئے تھے ۔ اہل فارس اور ترک عربوں کو تازی یا تاجی کہتے ہیں ۔ [3] ہدایہ کے مصنف کا نام شیخ برہان الدین علی تھا ۔ [4] محمد شیبانی خاں ازبک امیرزادہ تھا ۔ اس کے بزرگ صاحبِ اقتدار تھے مگر اس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے تباہ ہو چکے تھے وہ ۸۵۵ھ میں ترکستان میں پیدا ہوا ۔ وہ بڑا بہادر اور باتدبیر آدمی تھا ۔ زمانے کے حادثات نے اس کو خاک میں ملانے کی کوشش کی لیکن اس باہمت اور مدبر شخص نے ہر رکاوٹ کو ہٹا دیا اس نے بہت سے آدمی جمع کر لئے اور تیمور کی اولاد کی نااتفاقی سے فائدہ اٹھا کر آہستہ آہستہ ان کے ملک پر قابض ہو گیا ۔ اور بڑا عروج پایا ۔ تمام ترکستان اور خراسان پر اس کا جھنڈا لہرا رہا تھا ۔ ۹۰۶ھ میں سمرقند فتح کیا ۹۱۳ھ میں خراسان پر قبضہ کر لیا ۔ وہ محمد شیبانی خاں ہی تھا ۔ جس نے بابر جیسے بہادر اور باتدبیر آدمی کو انگلیوں پر نچایا اور اسے ترکستان سے نکلنے پر مجبور کر دیا ۔ بابر جو شیبانی سے پے در پے شکستیں کھا کر ترکستان سے نکلا تھا ۔ ہندوستان آ کر یہاں کا شہنشاہ بنا ۔ شیبانی اگر اُسے ترکستان چھوڑ کر ہندوستان آنے پر مجبور نہ کرتا تو آج برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور شاید اس میں مغلیہ دورِ حکومت کا ذکر نہ ہوتا تفصیل حالات کے لئے

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

کو فتح کیا تھا۔ اس وقت میں نے سوخ اور ہشیار کی پہاڑیوں میں تقریباً سال بھر تک پریشانی میں اپنا وقت گذارا تھا اور پھر کابل پر چڑھائی کی تھی۔

خجند | خجند، اندجان کی مغربی جانب سو میل کے فاصلہ پر ہے اور بہت قدیم شہر ہے۔ شیخ مصلحت اور خواجہ کمالؒ وہیں کے باشندے تھے۔ وہاں کے میوے بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ انار کی لذت تو اتنی مشہور ہے کہ "سیب سمرقند و انار خجند" کہاوت بن گئی ہے۔ لیکن اب مرغینان کے انار زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ خجند کا قلعہ بلندی پر بنا ہوا ہے۔ دریائے سیحوں اس کے شمال میں بہتا ہے دریا اور قلعہ کے بیچ میں اتنا فاصلہ ہے جیسے تیر کی زد ہوتی ہے۔ قلعے اور دریا کے شمال میں ایک پہاڑ ہے۔ اس پہاڑ کا نام میوغل ہے۔ اس میں فیروزے کی اور کئی اور چیزوں کی کانیں ہیں۔ وہاں سانپ کثرت سے ہوتے ہیں۔

خجند کی شکارگاہ کے کیا کہنے۔ سفید ہرن، پہاڑی بکریاں، بارہ سنگے، جنگلی پرندے اور خرگوش بے تعداد ہیں۔ وہاں کی ہوا میں بدبو بہت ہے۔ آنکھیں دکھنے کا مرض عام ہے۔ کہاوت ہے کہ چڑیا کی آنکھیں بھی دکھتی تھیں۔ مشہور یہ ہے کہ ہوا میں اس خرابی کا اثر شمالی پہاڑوں کی وجہ سے ہے۔

خجند کے علاقہ میں ایک قصبہ کا نام کندبادام ہے۔ ہرموز[1] اور ہندوستان میں جو بادام جاتے ہیں۔ وہیں سے جاتے ہیں۔ وہ خجند سے بیس بچیس[25] میل مشرق کی طرف ہے۔

خجند اور کندبادام کے بیچ میں ایک جنگل ہے اس کا نام "ہادرویش" مشہور ہے۔ وہاں ہمیشہ ہوا کے جھکڑ چلا کرتے ہیں۔ مرغینان وہاں سے مشرق میں اور خجند مغرب میں ہے۔ مرغینان اور خجند میں جو آندھیاں آتی ہیں۔ وہ اسی جنگل میں سے اٹھتی ہیں۔ اس جنگل میں ہمیشہ آندھیوں اور ہواؤں کا زور و شور رہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہاں کسی زمانے میں کئی فقیر ہوا کے جھکڑ میں پھنس گئے اور ایسے بچھڑے کہ پھر نہ ملے۔ ان میں سے ہر ایک "یا درویش یا درویش[2]" چیختا چیختا مر گیا۔ اس وقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ملاحظہ فرمائیے "محمد شیبانی خاں" مؤلفہ محمد رحیم دہلوی مطبوعہ آل پاکستان ہسٹری کانفرنس کراچی۔

[1] ہرموز خلیج فارس کے دہانہ پر ایک جزیرہ ہے۔ وہاں کے موتی مشہور ہیں۔ انھیں ہرمزی موتی کہتے ہیں۔

[2] مدد درویش مدد درویش۔

سے اس جنگل کا نام "ہادر درویش" پڑ گیا۔

آخشی | دریائے سیحوں کے شمال کی طرف جو شہر ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام آخشی ہے۔ تاریخ میں اس کو آخشیکت بھی لکھا ہے۔ اسی لئے اثیر الدین شاعر کو اثیر الدین آخشیکتی کہتے ہیں۔ فرغانہ میں اندجان کے بعد آخشی سے بڑا کوئی شہر نہیں ہے۔ وہ اندجان کے مغربی جانب چھتیس [۳۶] میل کے فاصلے پر ہے۔ میرے والد نے اسی کو اپنا دار الحکومت بنایا تھا۔

دریائے سیحون آخشی کے قلعہ کی فصیل کے نیچے بہتا ہے۔ قلعہ اونچے پہاڑ پر بنا ہوا ہے۔ کھڈ کی گہرائیاں خندق کا کام دیتی ہیں۔ میرے والد نے جب اس کو دار الحکومت بنایا تو دو ایک دفعہ باہر کی طرف اور پشتے تعمیر کئے۔ فرغانہ بھر میں اس جیسا مضبوط قلعہ نہیں ہے۔

شہر کے محلے قلعہ کی فصیل سے ایک میل شرعی پر آباد ہیں۔ وہ جو مثل ہے "دہ کجا و درختاں کجا" شاید آخشی ہی کے لئے کہی گئی ہے۔

وہاں کا خربوزہ بڑا لذیذ ہوتا ہے۔ خربوزہ کی ایک قسم وہ ہے جسے میر تیموری کہتے ہیں۔ ایسا لذیذ خربوزہ شاید دنیا بھر میں نہ ہوتا ہوگا۔ ویسے تو بخارا کے خربوزے بھی مشہور ہیں۔ مگر ایک دفعہ اُن دنوں میں جب میں نے سمرقند فتح کیا تھا۔ آخشی اور بخارا سے خربوزے آئے اور وہ ایک مجلس میں کاٹے گئے۔ تو معلوم ہوا کہ بخارا کے خربوزے آخشی کے خربوزوں کی برابری نہیں کرتے۔

وہاں شکار بہت ہے اور جانور کثرت سے ہیں۔ دریائے آخشی کی طرف ایک جنگل ہے۔ وہاں سفید ہرن بڑی کثرت سے ہوتے ہیں۔ اندجان کی طرف بھی ایک بڑا لمبا چوڑا جنگل ہے۔ اس میں بارہ سنگے، پرندے اور خرگوش بہت ملتے ہیں اور خوب موٹے تازے ہوتے ہیں۔

کاشان | کاشان، آخشی کے شمال میں چھوٹا سا شہر ہے۔

جس طرح دریائے اندجان اوش کی طرف سے بہہ کر آتا ہے۔ اسی طرح دریائے آخشی کاشان سے آتا ہے کاشان کی آب و ہوا اچھی ہے۔ باغ نہایت صاف ستھرے ہیں۔ سب باغ دریا کے کنارے بیلے میں ہیں۔ اس لئے اس کو پانچ بھیڑوں کے بچوں کا چغہ کہتے ہیں۔

کاشان والے اپنے ہاں کی آب و ہوا کی عمدگی پر ناز کیا کرتے ہیں۔ اور ادش والے اپنے ہاں کی آب و ہوا پر فخر کرتے ہیں۔

فرغانہ کے چاروں طرف پہاڑوں میں ایسے گرمائی علاقے نہایت عمدہ ہیں۔ جہاں گرمی کا موسم گذارا جاسکے۔ اس پہاڑ میں ایک خاص قسم کی لکڑی ہوتی ہے جس کو تابول غو کہتے ہیں۔ وہ کہیں اور نہیں ہوتی۔ اس کے اوپر کا چھلکا سرخ ہوتا ہے۔ اس سے عصا، کوڑوں کے دستے اور پرندوں کے پنجرے بنائے جاتے ہیں۔ اس کو چھیل کر تیر کے گز بھی بناتے ہیں وہ بہت ہی اعلیٰ قسم کی لکڑی ہوتی ہے اور دور دراز ملکوں میں سوغات کے طور پر بھیجی جاتی ہے۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ ان پہاڑوں میں آدمیوں کی شکل جیسی گھاس[1] ہوتی ہے مگر اب تو کہیں سننے میں نہیں آتی۔ سنا ہے کہ تبتی کینیٹ کے پہاڑوں میں ایک خاص قسم کی گھاس ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگ اس کو ایتق اوتی کہتے ہیں۔ اس گھاس میں مہر گیا کی خاصیت ہے ممکن ہے یہی گھاس ہو۔ جس کا نام وہاں کے لوگوں نے یہ رکھ دیا ہو۔

فرغانہ کے پہاڑوں میں فیروزے اور لوہے کی کانیں ہیں۔ (باقی آئندہ)

---

[1] اس کو عربی میں یبروج الصنم اور فارسی میں مردم گیا کہتے ہیں یہ ایک گھاس ہوتی ہے۔ جسے آدمی کی شکل سے تشبیہ ہے۔

فلسفہ کیا ہے؟

یہ بھی ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کے قیمتی مقالات کا مجموعہ ہے۔ ہیگل کا قول ہے کہ "جس مہذب قوم کا فلسفہ نہیں ہوتا اس کی مثال ایک عبادت گاہ کی سی ہے جو ہر قسم کی زیب و زینت سے آراستہ ہے لیکن جس میں قدس الاقداس ہی کا وجود نہیں"۔

ڈاکٹر صاحب کے مقالات پڑھ کر آپ اپنے فلسفہ سے پوری طرح باخبر ہو جائیں گے۔ مقالات کے چند سرنامے ملاحظہ فرمایئے۔

قرآن اور فلسفہ کیا ہے؟ ہم فلسفہ کیوں پڑھیں، فلسفہ کی دشواریاں، وغیرہ

قیمت ایک روپیہ مجلد دو روپے۔

اسلام کا جمہوری نظام

از

(جناب محمد قطب الدین احمد صاحب)

وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ (آل عمران - ۱۵۹)

تمہید اسلام اپنا ایک خاص جمہوری نظام رکھتا ہے، جس کی مثال عہدِ حاضر کے نظامات میں ڈھونڈنا عبث ہے۔ قدیم وجدید طرز کی حکومتوں میں یہ اپنی ایک منفرد اور نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ نہ اس کو امریکہ کی طرز کی جمہوری حکومت کہہ سکتے ہیں، اور نہ اس کا دامن اشتراکی روس کے سیاسی نظام سے باندھا جاسکتا ہے۔ بعض باتوں میں ظاہری مماثلت کو دیکھ کر یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ اسلام کا طرزِ حکمرانی بھی ان ہی چیزوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جن پر موجودہ زمانے کی عظیم مملکتیں عمل پیرا ہیں۔ جس طرح گھوڑے اور گدھے کے اعضائے جسم کے باہمی اشتراک پر ایک سطحی نظر ڈال کر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ دونوں یکساں ہیں، ایسے ہی موجودہ سیاسی نظامات کو اسلام کے ہم پلہ قرار دینا بعید از حقیقت ہے۔

کائنات کا ہر گوشہ وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت کے مظاہر کا ایک تماشہ گاہ ہے جب موجودات میں اس قدر تنوع کے باوجود ایک طرح کی یک رنگی پائی جاتی ہے، تو پھر ایک ہی نوع کے نظاماتِ اجتماعی میں ایسی مشاکلت کا پایا جانا قطعی و ناگزیر کیوں نہ ہو۔ مگر اس سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کا جمہوری نظام بھی موجودہ نظامات ہی کی ایک قسم ہے۔ اصل و روح سے بیگانہ رہ کر محض شکل وصورت پر حکم لگانا کہاں تک فہم حقیقت میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ امریکی جمہوریت اپنی ایک خاص نوعیت رکھتی ہے، اشتراکی عمومیت ایک خاص طرز و روش کی حامل ہے، اور اسلامی جمہوریت ان سب سے الگ ایک مخصوص و ممتاز حیثیت پر فائز ہے

قبائے خلافت ہی ایک ایسی تشریف ہے جو اس کے قامتِ موزوں پر راست آسکتی ہے، امریکہ اور روس کا کوئی تراشیدہ ملبوس اس کے شائستہ اندام نہیں ہو سکتا۔

؟ بہ طراز زندگی قامت موزوں نازم   یک قبا نیست کہ شایستہ اندام تو نیست

جس نظام حکومت کی داغ بیل عہدِ رسالت میں ڈالی گئی، اور خلفائے راشدین کے دور میں جس پر ایک قصرِ شید تعمیر کیا گیا، وہی ہمارے لئے بطور ایک نصب العین کے کام دے سکتا ہے کہا جاتا ہے کہ حالات بدل چکے ہیں، زمانہ کو چودہ سال پیچھے لوٹایا نہیں جا سکتا۔ کون کہتا ہے کہ پیچھے لوٹو، اور وہی احوال و ظروف اپنے پر طاری کر لو۔ اسلام رجعت پسند نہیں بلکہ ایک ترقی پسند مذہب ہے۔ یہ آگے بڑھنا چاہتا، اور اس کی تمام تر تعلیمات آگے بڑھنے ہی کے لئے ہیں۔ جب ہی تو یہ ایک زندۂ جاوید مذہب ہے۔ یہ ایک نامی جسم ہے، جو ہر وقت پھلتا پھولتا اور نئے برگ و بار لاتا رہتا ہے۔ جمود و تعطل کو اس کے مزاج سے ایسی ہی بے گانگی ہے، جیسے سیلاب کے لئے تھمنا، سیماب کے لئے جمنا، اور مشک کا عطر بیزی سے محروم ہو جاتا ہے۔ حرکت و نفوذ اس کا مایۂ خمیر ہے۔ حالات اگر بدل جائیں، تو احکام میں بھی تبدیلی واقع ہو گی۔ اصول و کلیات اپنی جگہ اٹل ہیں، ان میں کبھی تغیر واقع نہیں ہو سکتا۔ ایک درخت اپنی اصل پر قائم رہ کر ہمیشہ نئے برگ و بار پیدا کرتا رہتا ہے، لیکن شاخوں اور پتوں کے تغیر سے اس کے اصل وجود میں کیا فرق آتا ہے، بلکہ اس سے تو اس کی زندگی کا ثبوت ملتا اور اس کے جماؤ اور استحکام میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اصل و روح پر قائم رہ کر ہر مفید طریق کار جو اسلام کے مزاج کے موافق ہو، وہ گویا عین اسلام ہی کا طریقہ ہے۔ ہر دانائی کی بات اور اچھی چیز مومن کی گم شدہ میراث ہے، جہاں وہ اس کو پاتا ہے اپنا لیتا ہے۔ "الحکمۃ ضالۃ المومن حیث وجدھا فھو احق بھا" میں اسی طرز و روش کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

باوجود اختیار و عمل میں ان تمام آزادیوں کے ہم اپنا ایک مخصوص نظامِ فکر رکھتے ہیں ہم کو دوسروں کی نقالی نہیں بلکہ خود اپنا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ تہذیب حاضر

کے ظاہری طمطراق اور چمک دمک کو دیکھ کر ہمیں مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں، جب کہ خود ہمارا دامن ایسے زروجواہر سے مالامال ہے، جو اگر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوں تو دنیا کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جائیں

فارغ ز خیرگی نگرد روئے آفتاب　　　ایں دیدہ آزمودۂ نظارۂ کسے ست

اس تمہیدی بیان کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اسلام کے جمہوری اصول

اس خصوص میں پہلی چیز جو اسلام پیش کرتا ہے، وہ حاکمیت کا تصور ہے، جس کو جدید اصطلاح میں اقتدارِ اعلیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسلام حاکمیت کو نہ کسی فردِ واحد کے لئے تفویض کرتا ہے، اور نہ کسی طبقے، جماعت یا قوم کو یہ حیثیت عطا کرتا ہے۔ جو ذاتِ مطلق اس حاکمیت کی سزاوار ہے، وہی اسلام کے نزدیک حاکمِ حقیقی اور مقتدرِ اعلیٰ ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے　　　حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

قرآن کی کوئی سورۃ اور سورۃ کا کوئی مقام ایسا نہیں جو خالقِ کائنات کی فرمانروائی، اور موجودات کی ہر شے پر اس کی احاطت وقدرت کو ظاہر نہ کر رہا ہو۔ بائے 'بسم اللہ' سے سین 'والناس' تک سارا قرآن اس کی بالادستی اور حاکمیت سے مملو ہے۔ ہم یہاں پر چند آیات بطور نمونے کے پیش کرتے ہیں:۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (انعام - ۵۷)	"حکومت بجز خدائے بلند و برتر کے کسی کا حق نہیں"
لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا	"خدا کے حقِ حکومت میں کوئی دوسرا شریک نہیں"
فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (المومن - ۱۲)	"حکومت اللہ ہی کے لئے ہے، جو بالادست اور بڑا ہے"
فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (المومنون - ۱۱۶)	"بلند و بالادست اور برحق حکمراں"
وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (یوسف - ۲۱)	"اللہ اپنی حکومت کے کاموں میں غالب ہے لیکن انسانی اکثریت اس حقیقت کو نہیں سمجھتی"

هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (انعام - ۶۱)	"اللہ اپنے بندوں پر زور اور غلبہ رکھنے والا ہے"
فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ (بروج)	"جس چیز کا ارادہ کرتا ہے کر گذرتا ہے"
لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (انبیاء - ۲۳)	"وہ اپنے اعمال میں غیر مسئول ہے"
بِيَدِهٖ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ	"وہی تمام اقتدار کا مالک ہے"
وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ (المومنون - ۸۸)	"وہ سب کو پناہ دیتا ہے، اور کوئی نہیں جو اس سے اوپر پناہ دینے والا ہو"
أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ	"خبردار خلق اس کی ہے اور امر بھی اسی کے لئے ہے"
يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ (الرحمن - ۳۳)	اے گروہ جن اور انسان کے اگر تم کو یہ قدرت ہے کہ آسمان اور زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو نکلو لیکن طاقت کے بغیر نکل نہیں سکتے جو تمہیں حاصل نہیں ہے۔
اَلْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ	"اس کی ذات منزہ عن الخطا ہے"
مَلِكِ النَّاسِ	"انسانیت عامہ کا فرمانروا"
أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ	"حکمرانوں کا حکمراں - سب سے بہتر فرمانروا"

کیا کسی فرد یا مجموعۂ افراد، یا کسی ادارہ پر ایسی غیر محدود حاکمیت کا اطلاق ہو سکتا ہے، جو اقتدار اعلیٰ کا اصل منشاء و مراد ہے۔ شاہی نظام، عدیدی نظام، یا عمومی نظام ان میں سے کسی کا بھی تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے کہ ایسا علی الاطلاق اقتدار کبھی کسی کو حاصل رہا ہے۔ مخلوق کی ہر فرمانروائی کے پیچھے کتنی طاقتیں ہیں جو ان کے ظاہری اقتدار پر پابندیاں عاید کر رہی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آئے دن نظامِ سیاست میں انقلابات آتے رہتے، بغاوتیں رونما ہوتیں، اور حکومتوں کے تختے اُلٹتے رہتے ہیں۔ آخر اس انسانی حاکمیت کی سریع الزوالی اور ہمہ وقت تغیر پذیری کی کیا وجہ ہے؟ اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوا کہ یہ سب بے اصل و باطل فرمانروائیاں ہیں۔ چنانچہ

ماہرین سیاسیات جب مختلف سیاسی نظامات میں اقتدار اعلیٰ کو تلاش کرتے ہیں تو انھیں اس کا کوئی صحیح مصداق نہیں ملتا۔

جب حقیقی حاکمیت خالقِ کائنات کی مان لی گئی تو خود بخود قانونی حاکمیت بھی اس کی تسلیم کی جائے گی۔ حکم و قانون کا سرچشمہ جب ذاتِ الٰہی قرار پایا تو دنیا میں حکومت کی جو صورت باقی رہتی ہے وہ خلافت و نیابت کی حیثیت رکھتی ہے۔ خدائی احکام و قوانین ہمیں انبیاء کے توسط سے معلوم ہوتے رہے ہیں، جو اپنی آخری اور مکمل صورت میں پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوتے۔ حکومت خدا کی، قانون خدا کا، ملک خدا کا، زمین خدا کی، تمام افرادِ نسلِ انسانی اس کے بندے،

"اَلْخَلْقُ کُلُّھُمْ عِیَالُ اللّٰہِ" سارى مخلوق خدا کا کنبہ،

"خَلِیْفَۃُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ" زمین پر اللہ کی نیابت کرنے والے،

اور کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ، ہر شخص حاکم اور ہر شخص اپنے زیردستوں کی بابت خدا کے پاس جوابدہ۔ کل انسان بحیثیت انسان کے آپس میں برابر، بزرگی و فضیلت صرف تقوے کو حاصل مگر جماعت کے نظم و انضباط کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر فرد کسی ایک مرکز سے وابستہ رہے کائنات کے ہر گوشے میں ہم دیکھتے ہیں کہ سنت الٰہی ایک خاص نظام پر کار فرما ہے۔ جسے قانونِ مرکز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انفس و آفاق میں یہی قانون کار فرما ہے۔ نظامِ شمسی اسی مرکزیت کے قانون پر چل رہا ہے۔ نباتات میں بھی یہی مرکزیت جاری ہے اور خود انسان کے وجود میں قلب اسی مقام پر فائز ہے۔ ایسے ہی انسانی معاشرہ کے لئے بھی ایک قائد یا امام کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ تشتت و افتراق سے محفوظ اور ایک ہی لڑی میں منسلک رہے۔ حضورِ رسالت کی حیاتِ طیبہ میں یہ مرکزیت ذاتِ رسالتؐ میں مرکوز تھی، اور آپ کے بعد خلفائے راشدین میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہی۔

خدا کی حاکمیت تسلیم کرنے سے جو چیز بطور نتیجہ کے پیدا ہوتی ہے۔ وہ انسانی مساوات، حریت اور باہمی اخوت ہے۔ قرآن کا اعلان ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ط (النسا - ۱)

" اے افرادِ نسلِ انسانی ! اپنے پروردگار (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو - وہ پروردگار جس نے تمہیں اکیلی جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا (یعنے جس طرح مرد کی نسل سے لڑکا پیدا ہوتا ہے - لڑکی بھی پیدا ہوتی ہے) پھر ان دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی :-

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے،

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ط (الحجرات - ۱۳)

" اے افرادِ نسلِ انسانی ! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری ذاتیں اور برادریاں قایم کر دیں تاکہ تم باہم شناخت کئے جا سکو - اللہ کے نزدیک بزرگ وہ ہے، جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو، بے شک اللہ جاننے والا باخبر ہے :"

مدینہ میں تاسیسِ حکومت کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ کی طرف سے جو اعلان حریت و مساوات عالمِ انسانیت کو پہنچایا گیا اس کے جستہ جستہ فقرے یہ تھے :-

" لوگو ! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے، اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے، ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر، اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقوے کے سبب - ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے قدموں تلے ہیں - سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں - تمہارے غلام ! تمہارے غلام ! جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ - عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے - تمہارا خون، تمہارا مال، اور تمہاری آبرو (تا قیامت) اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ دن، اس مہینے، اور اس شہر میں محترم ہے - ہاں !

مجرم اپنے جرم کا ذمہ دار ہے، ہاں! باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں، اور بیٹے کے جرم کا باپ جوابدہ نہیں۔ اگر کوئی حبشی بینی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو، اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔ تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں، اور آدمؑ کی خلقت مٹی سے ہوئی تھی، پس سب آپس میں برابر ہیں۔ جاؤ! اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاؤ، اب تم سب کے سب آزاد ہو۔"

یہ محض زبانی اعلان نہ تھا، بلکہ اس مساوات کی تعلیم آپ اپنے ہر قول و عمل سے مسلمانوں کو دیتے رہے۔ آپ نے اپنی نشست و برخاست، گفتگو اور تعلقات میں کبھی کسی امتیاز کو پسند نہیں فرمایا۔ آپ محفل میں اپنے ہم جلیسوں کے ساتھ اس طرح مل جل کر بیٹھتے کہ ناواقف کو یہ دریافت کرنا پڑتا کہ صدر محفل کون ہے۔ آپ جب تشریف لاتے تو تعظیماً کھڑے ہونا بھی آپ کو ناگوار گزرتا، اور یہ فرماتے کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے۔ ایک بار ایک صحابی نے کہا، اے آقائے من! آپ نے فرمایا مجھ کو آقا نہ کہو، آقا تو صرف ایک ہی ہے، اور وہ خدا کی ذات ہے۔ ایک بار ایک بدوی حاضر ہوا، اور ڈرتا ہوا خدمت نبوی میں آگے بڑھا، آپ نے اس کی اس حالت کو دیکھ کر ارشاد فرمایا، تم مجھ سے ڈرتے ہو، میں اس ماں کا بیٹا ہوں، جو قدید کھایا کرتی تھی۔

چہ عظمت دادہ یارب بخلق آں عظیم الشاں   کہ 'انی عبدہٗ' گوید بجائے قول 'سبحانی'

حضرت انسؓ دس برس تک خدمت نبوی میں رہے، لیکن ان کا بیان ہے کہ اس مدتِ طویل میں مَیں نے جتنی خدمت آپ کی کی، اس سے زیادہ آپ نے میری کی۔ مساوات کا یہ عالم تھا کہ تحکمانہ کام لینا اور جھڑکی دینا تو ایک طرف آپ نے کبھی یہ نہ فرمایا کہ یہ کام اس طرح کرنا چاہیئے تھا ایسا کیوں کیا۔ ایک مرتبہ آپ حضرت فاطمہؓ کے پاس ایک غلام کو لے کر تشریف لاتے، اس وقت حضرت فاطمہؓ کے پاس اتنا چھوٹا کپڑا تھا کہ وہ اس سے سر ڈھانکتی تھیں تو دونوں پیر کھل جاتے تھے، اور دونوں پاؤں چھپاتی تھیں تو سر کھلا رہتا تھا، یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا لَیْسَ علیكِ باسٌ، اِنّما ھو ابوكِ، کوئی مضائقہ نہیں، یہ تو تمہارا باپ ہے (تفسیر بیضاوی)

اس سے بڑھ کر اخوت و مساوات کا کون سا مقام ہو سکتا ہے، جس کا ذہنِ انسانی تصور کر سکتا ہے۔ جب متحدہ طور پر صحابہ کوئی کام کرتے، تو آپ بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک ہوتے۔ چنانچہ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت آپ سب کے ساتھ اینٹ اور پتھر اُٹھا رہے تھے۔ قانونی مساوات کا یہ عالم تھا کہ قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت چوری میں ماخوذ ہوئی۔ قریش نے آنحضرتؐ سے سفارش کرنے کے لئے حضرت اُسامہؓ کو آمادہ کیا، جن کو آپ بہت عزیز رکھتے تھے۔ لیکن جب اس واقعہ سے متعلق اُسامہؓ نے آپ سے سفارش کی تو آپ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا، اے لوگو! تم سے پہلی قومیں اس لئے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا (چوری کا ذکر صرف خصوصیت واقعہ کی بنا پر ہے، ورنہ اس سے مراد عام جرائم ہیں) تو لوگ اس کو چھوڑ دیتے، پر جب کوئی عام آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا دیتے۔ لیکن خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو اُس کے ہاتھ بھی ضرور کاٹے جاتے۔[1] یہ دعا لسانِ نبوت سے کئی مرتبہ سنی گئی، "خدایا! میں غریب ہوں، مجھ کو غریبوں میں زندہ رکھ، اور غریبوں ہی کے زمرہ میں اُٹھا۔" کھانے کے وقت آپ فرطِ انکسار سے یہ فرماتے، "میں خدا کا غلام ہوں، اس طرح کھاتا ہوں جس طرح ایک غلام کھاتا ہے۔"

خلفائے راشدین کا بھی یہی طرزِ عمل تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے پہلا خطبۂ خلافت جو دیا اس کے الفاظ یہ تھے، لوگو! میں تمہارا خلیفہ مقرر ہوا ہوں، گو میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ لوگو! میں پیروی کرنے والا ہوں، کوئی نئی بات کرنے والا نہیں ہوں۔ اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کرو، اور اگر کجروی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔ تم میں جو ضعیف ہے، وہ میرے نزدیک قوی ہے تا آنکہ میں اس کا حق نہ دلوا دوں، اور تم میں جو قوی ہے وہ میرے پاس کمزور ہے، جب تک کہ میں اس سے دوسرے کا حق واپس نہ لے لوں۔" حضرت عمرؓ اور ابی بن کعبؓ میں کسی معاملہ میں نزاع واقع ہوئی۔ زید بن ثابتؓ کے ہاں مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت عمرؓ جب ان کے پاس گئے، تو انھوں

---

[1] بخاری الشفاعۃ فی الحدود

نے تعظیماً جگہ خالی کردی۔ آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا۔ یہ پہلی ناانصافی ہے جو تم سے اس مقدمہ میں سرزد ہوئی، یہ کہہ کر اپنے فریق کے برابر بیٹھ گئے۔ جبلہ ابن ایہم غسانی ایک عیسائی والیٔ ملک نے عہد فاروقی میں اسلام قبول کیا تھا۔ طواف کعبہ کے موقع پر اس کی چادر کا ایک گوشہ کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آگیا۔ جبلہ نے اس کے ایک طمانچہ رسید کیا۔ اس نے بھی برابر کا جواب دیا۔ جبلہ نے غصہ سے بے تاب ہوکر حضرت عمرؓ سے شکایت کی، حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا جیسا تم نے کیا تھا اس کا بدلہ پایا۔ اس بات سے وہ ناراض ہوکر اسلام سے پھر گیا اور رومیوں سے جا ملا، لیکن خلیفۂ اسلام نے قانونِ مساوات کے پیشِ نظر اس کے ارتداد کی کچھ پرواہ نہ کی۔ ایک دفعہ حضرت علیؓ کی ایک گم شدہ زرہ یہودی کے پاس پائی گئی۔ آپ نے اسے واپس لینا چاہا، لیکن اس نے دینے سے انکار کیا۔ مقدمہ قاضی شریح کے پاس پیش ہوا۔ قاضی نے گواہ پیش کرنے کے لئے کہا، اس پر آپ نے اپنے صاحبزادہ حسن اور اپنے غلام قنبر کی شہادت پیش کی۔ قاضی نے کہا بیٹے کی باپ کے لئے اور غلام کی آقا کے لئے گواہی قبول نہیں کی جاسکتی۔ اس عدل وانصاف کا یہودی پر اتنا اثر ہوا کہ وہ اقبال جرم کے ساتھ مسلمان ہوگیا۔

عہدِ رسالت میں شوریٰ پر عمل آنحضرتؐ پیغمبر تھے، ہر موقع پر وحی و تنزیل کے ذریعہ آپ کی ہدایت کی جاتی تھی اس پر بھی آپ کو "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ، فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" کا حکم دیا گیا، یعنی معاملات حکومت میں کسی کام کے عزم و ارادہ سے قبل اہل الرائے سے مشورہ کرلیا جائے، اور جب صلاح مشورہ سے کوئی بات طے پاجائے تو پختہ عزم کرلیا جائے، اور اللہ کے بھروسہ پر کام شروع کردیا جائے۔ حضرت عائشہؓ کی شہادت ہے کہ میں نے رسول اللہ سے زیادہ کسی کو اس بارے میں نہ پایا کہ لوگوں سے مشورہ کرکے کام کیا جائے حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ میں نے آنحضرتؐ سے زیادہ کسی کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے نہیں دیکھا۔ عہدِ نبوت میں مختلف واقعات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ جب مدینہ میں مسلمانوں کو ایک گونہ امن وسکون حاصل ہوا تو نماز باجماعت کے اعلان کے لئے آپ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا، اور عبداللہ بن زیدؓ اور حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق، جنہیں رویائے صادقہ کے ذریعہ ہدایت کی گئی تھی، اذان کے لئے ان ہی کے بیان کردہ الفاظ اور طریقِ اعلان کو پسند فرمایا گیا تکذیب واقعہ افک کی بابت بھی

آپ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا جس میں حضرت عمرؓ، علیؓ اور اسامہؓ وغیرہ جیسے صحابہ شامل تھے۔ غزوۂ بدر میں آگے بڑھنا اور کنویں پر مقیم ہونا شوریٰ ہی کے ذریعہ طے پایا۔ فدیہ اُسارائے بدر کی بابت بھی مشورہ کیا گیا۔ مسجد نبوی میں منبر کی تنصیب، غزوۂ احزاب میں محصور ہو کر مدینہ کے اطراف خندق کا کھودا جانا، ایامِ خندق میں حملہ آوروں سے مدینہ کی ایک تہائی پیداوار پہ صلح کرنے کی بحث، اور حدیبیہ میں جنگ کا مسئلہ وغیرہ ایسے متعدد واقعات ہیں جن میں حضورؐ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا۔

خدمات پر تقرر میں اعلیٰ صلاحیتوں کا لحاظ خدمات ملکی پر تقرر میں کسی خاندان، قبیلہ، نسل، سن، آزاد یا غلام کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ جس کے کردار اعلیٰ ہوتے، یا جس میں اعلیٰ صلاحیتیں پائی جاتیں، اس کو مامور کیا جاتا۔ یہاں تک کہ نماز کی امامت جس کو شروع اسلام میں خاص اہمیت حاصل تھی، حضرت ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام، حضرت سالم کو مسجد قبا میں اس خدمت پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ وہی سالم مولیٰ ابی حذیفہ ہیں، جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں اپنے بعد ان کو خلیفہ مقرر کرتا۔ دعاۃ۔ سفراء، معلمین، کاتبانِ وحی، اور قائدین لشکر کے لئے بھی قریشی اور غیر قریشی کا کوئی لحاظ نہ رکھا جاتا تھا۔ سریہ موتہ میں حضرت زیدؓ کو امیر لشکر مقرر کیا گیا۔ آخری لشکر جو حضورؐ نے ترتیب دیا تھا، اس کی ایالت حضرت اسامہ کے تفویض کی گئی، جو ایک انیس سالہ نوجوان تھے، اور ایک آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ کے صاحبزادہ تھے، ان کے تحت حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کئے گئے۔ عمومیت کا ایک خاص وصف جس پر بڑے شد و مد سے زور دیا جاتا ہے، وہ یہی ہے کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیتوں کے لحاظ سے آگے بڑھنے اور ترقی پانے کے مواقع حاصل رہیں اسلام اس کی پوری تائید کرتا ہے۔ عہد رسالت اور دورِ خلافتِ راشدہ کی تاریخ کا کوئی صفحہ اُلٹ دیکھئے تو ہر موقع پر یہ چیز نمایاں نظر آئے گی۔

خلیفہ کا انتخاب جمہوریت کا ایک خاص عنصر معاملات حکومت کا باہم صلاح مشورہ سے طے پانا ہے۔ قرآن خود ذاتِ رسالت کو "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" کا حکم دیتا ہے، اور مسلمانوں کی حکومت کا یہ خاص وصف تبلایا گیا ہے، "وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" ان کی حکومت باہمی مشورہ سے ہے۔ اس آیت میں حکومت کی اضافت عام مسلمانوں کی طرف کی گئی ہے، جس سے یقینی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حکومت

اسلامیہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں، بلکہ جمہور اسلام کی ملک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا، اور یہ کام عام مسلمانوں کے انتخاب کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب حضرت عمرؓ کی تحریک اور مہاجرین و انصار کی تائید سے سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا، اور دوسرے دن آپ کے ہاتھ پر عام بیعت کی گئی۔ انصار و مہاجرین کی جماعت اور اہل مدینہ کو شروع اسلام میں ایک نمائندہ حیثیت حاصل تھی، جن کی پیروی اور تائید عامۃ المسلمین کیا کرتے تھے۔ موجودہ جمہوری ڈھکوسلوں سے اس وقت کی سادہ فطرت ناآشنا تھی، اور نہ خود کو کوئی صدر حکومت یا دیگر خدمات کے لئے پیش کرتا تھا، جھوٹے وعدوں اور سبز باغ دکھا کر قومی جذبات سے اس وقت کھیلا نہیں جاتا تھا۔ ارباب حل و عقد کی نظر انتخاب خود بخود قوم کے بہترین فرد پر پڑتی تھی، اور اس سے خواہش کی جاتی تھی کہ وہ اس خدمت کا بار اپنے کندھوں پر اٹھائے۔ جو شخص حکومت و اقتدار کا حریص ہوتا ہے اس کی دیانت و صداقت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ بخاری اور مسلم میں حضورؐ کا ارشاد ہے "بخدا ہم ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی منصب پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو، یا جو اس کا حریص ہو" ابو داؤد میں ہے

اِنَّ اَخْوَنَکُمْ عِنْدَنَا مَنْ طَلَبَہٗ — ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود اس کا طالب ہو

چنانچہ خلفائے راشدین میں سے کسی نے بھی اس خدمت کی بطور خود کوئی خواہش ظاہر نہیں کی۔

حضرت امیر علیہ السلام کی ذات گرامی پر جو اس طرح کی بدگمانیاں کی جاتی ہیں، وہ محض بے بنیاد اتہامات ہیں جو بعد میں افتراق انگیز عناصر نے اپنی مفاد پرستیوں کے تحت آپ کی ذات والا صفات سے منسوب کئے ہیں اگر فی الحقیقت حضرت علیؓ کے قلب مبارک میں ایسی کوئی خواہش ہوتی، تو خلفائے ثلاثہ میں سے آپ کسی کے ہاتھ پر بیعت نہ فرماتے۔ جس طرح سعد بن عبادہؓ نے حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، یا امیر معاویہ نے حضرت امیر علیہ السلام کی بیعت سے انکار کر کے مخالفانہ روش اختیار کی تھی۔ وہی صورت آپ بھی اختیار فرما سکتے تھے۔ حضرت علیؓ سرتاپا خلوص و للّٰہیت تھے۔ شیخین اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں آپ نے جس

بے نفسی سے کام کیا اور ہر اہم معاملہ میں اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید فرماتے رہے، وہ آپ کی بے لوث خدمات کے شاہد عادل ہیں۔ جب پہلی مرتبہ مصر کے بلوائی عبداللہ ابن ابی سرح والی مصر کی شکایت لے کر مدینہ میں جمع ہوئے تو حضرت علیؓ نے اپنی حسن تدبیر سے اس فتنہ کو فرو فرمایا، اور انھیں اپنے اپنے علاقوں میں واپس جانے پر رضامند کیا۔ چنانچہ یہ لوگ واپس جا چکے تھے، مگر راہ میں خلیفہ کا ایک جعلی خط ملا جس کو دیکھ کر پھر یہ دارالخلافہ واپس ہوئے اور حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا، جس میں آپ کی شہادت واقع ہوئی۔ اس موقع پر حضرت علیؓ نے اپنے دونوں صاحبزادوں حسنؓ و حسینؓ اور اپنے غلام قنبر کو حفاظت کے لئے بھیج دیا چنانچہ یہ سب اس مدافعت میں زخمی ہوئے مگر کسی کو مکان کے دروازہ سے اندر داخل ہونے نہ دیا۔ اگر حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کی ذراسی بھی خواہش ہوتی تو کیا اس موقع سے وہ فائدہ نہ اٹھاتے؟ ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ جب حضرت صدیقؓ بیعت عامہ کے وقت منبر پر تشریف فرما ہوئے اور آپ نے حاضرین پر نظر ڈالی تو حضرت علی مرتضیٰ نظر نہ آئے۔ آپ نے دریافت فرمایا علیؓ کہاں ہیں، انصار میں سے چند لوگ اٹھے اور حضرت علیؓ کو بلا لائے۔ حضرت صدیقؓ نے کہا آپ آنحضرت کے چچازاد بھائی اور داماد ہیں کیا آپ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہو، عرض کیا نہیں یا خلیفہ رسول اللہ اور آگے بڑھ کر آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔[۱]

حضرت ابوبکرؓ نے عمرؓ فاروق کو نامزد کرنے سے قبل ارباب حل و عقد اور ملت کے سربرآوردہ اصحاب سے مشورہ کیا، اور اس نتیجے پر پہنچے کہ سب لوگ حضرت عمرؓ کی خلافت پر باہم متفق ہیں جب آپ کو اس کا کامل اطمینان ہو گیا تو حالت مرض میں بالاخانہ پر تشریف لے گئے، شدت ضعف کے سبب کھڑے ہونے کی طاقت نہ تھی، آپ کی بی بی اسماء بنت عمیس دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہوئے تھیں، نیچے مسلمانوں کا مجمع عام تھا۔ آپ نے ان کو اس طرح مخاطب فرمایا: "کیا تم راضی ہو اس شخص سے جس کو میں تم پر اپنا جانشین بناؤں؟ خدا کی قسم میں نے غور و فکر کر کے رائے قائم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے اور اپنے کسی رشتہ دار کو مقرر نہیں کیا ہے۔ میں نے عمر بن الخطاب کو جانشین بنایا ہے۔ پس تم ان کی سنو اور

---

[۱] (ازالۃ الخفاء)

اطاعت کرو"۔ مجمع سے آوازیں آئیں، ہم نے سنا اور تسلیم کیا۔ اس کے بعد آپ نیچے اُتر آئے، اور حضرت عثمانؓ کو طلب کر کے اپنی یہ وصیت املاء فرمائی۔ "یہ عہد نامہ ابو بکر بن ابی قحافہ کی آخری زندگی کا ہے جب کہ وہ دنیا سے سفر کر رہا ہے، اور عالم آخرت کے داخلہ کی پہلی ساعت میں ہے۔ جہاں کا فر مومن بدعقیدہ عقیدت مند اور جھوٹا صداقت شعار ہو جاتا ہے۔ میں نے عمر بن الخطاب کو جانشین کیا لہذا ان کا حکم سنو اور مانو خوب سمجھ لو کہ اس بارے میں خدا، اس کے رسول، اور اس کے دین کی، اور خود اپنی اور تمہاری خیرخواہی ادا کرنے کی میں نے پوری کوشش کی ہے۔ اگر وہ عدل کریں گے تو ان کی نسبت میرا یہی خیال اور علم ہے، اور اگر وہ بدل گئے تو ہر شخص اپنے عمل کا پھل پائے گا۔ نیت میری بخیر ہے، غیب کا علم مجھے نہیں۔ جو لوگ ظلم کریں گے وہ جلد دیکھ لیں گے کہ وہ کس پہلو پر پلٹا کھائیں گے۔ تم پر سلام اور اللہ کی رحمت اور برکتیں ہوں" اس کے بعد حضرت عمرؓ کو تخلیہ میں طلب فرمایا اور بہت سی وصیتیں کیں اور پھر ہاتھ اُٹھا کر یہ دعا فرمائی: "اے اللہ میں نے یہ انتخاب صرف مسلمانوں کی بہتری کے ارادے سے کیا ہے اور اس اندیشہ سے کہ ان میں فساد نہ ہو۔ میں نے وہ عمل کیا ہے جس کو تو بہتر جانتا ہے۔ میں نے خوب غور و فکر کے بعد رائے قائم کی ہے۔ بہترین اور قوی ترین شخص کو جانشین کیا ہے جو سب سے زیادہ مسلمانوں کی راست روی کا خواہش مند ہے۔ میرے لئے تو کوچ کا حکم آچکا۔ اب میں ان کو تیرے سپرد کرتا ہوں، وہ تیرے بندے ہیں اور ان کی باگ تیرے ہاتھ میں ہے۔ اے اللہ ان کے حاکموں کو صلاحیت دے، اور میرے جانشین کو خلفائے راشدین کے زمرہ میں شامل کر اور اس کے ماتحتین کو صلاحیت عطا فرما"

ان واقعات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں شروع سے آخر تک "وامرھم شوریٰ بینھم" کی روح کار فرما ہے۔ حضرت صدیقؓ نے پہلے اکابر صحابہ سے مشورہ کیا، جب سب عمر فاروق کی خلافت پر متفق نظر آئے تو عام مسلمانوں کے سامنے اس تجویز کو پیش کیا گیا، جس کی سب نے یک زبان ہو کر تائید کی آخر میں آپ نے اپنی وصیت املاء فرمائی۔ احتیاط کا یہ عالم ہے کہ محض اپنی تجویز و رائے کے اظہار پر خدا سے ہر لغزش و خطا کی معافی چاہ رہے ہیں۔ کیا اس سے کہیں بھی اس امر کا شائبہ گذر سکتا ہے کہ آپ نے حاکمانہ اور آمرانہ انداز میں اپنے جانشین کو مامور فرمایا تھا؟ اس کا ہر اصول، ہر شرط، ہر صورت اور ہر قانون د

ضابطہ، دین کے تحفظ کے بعد اکابر امت کی مرضی، رائے عامہ، اور اجماع امت کے تابع ہے، جس میں شخصیت، خاندانی وراثت، اور شہنشاہیت کو کوئی دخل نہیں۔

جب حضرت عمرؓ زخمی ہوئے اور زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو آپ نے رسول اللہ صلعم کے معتمد ترین چھے اصحاب کی، جو سارے کے سارے عشرۂ مبشرہ میں سے تھے، ایک مجلس شوریٰ ترتیب دی، اور یہ ارشاد فرمایا کہ باہمی مشورہ سے ان میں سے کسی ایک شخص کو خلیفہ مقرر کریں۔ چونکہ یہ اصحاب تمام امت کی نظر میں ہر طرح پر اس منصب کے اہل تھے، اس لئے آپ نے انتخاب کو ان میں محدود کر دیا۔ اس مجلس نے انتخاب کا کام حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے سپرد کیا۔ انھوں نے مدینہ میں چل پھر کر عام لوگوں کی رائے معلوم کی، گھر گھر جا کر عورتوں تک سے پوچھا، مدرسوں میں جا کر طلباء سے دریافت کیا۔ مملکت کے مختلف گوشوں سے جو لوگ حج سے اپنے اپنے علاقوں کی طرف واپس جاتے ہوئے مدینہ ٹھہرتے تھے ان سے استصواب کیا۔ اس تحقیقات سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ امت میں سب سے زیادہ معتمد علیہ دو شخص ہیں۔ عثمانؓ و علیؓ۔ اور ان دونوں میں عثمانؓ کی طرف لوگوں کا میلان ہے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے حق میں فیصلہ ہوا، اور مجمع عام نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد علی مرتضیٰ کے پاس چند اصحاب نے حاضر ہو کر خلافت قبول کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا، "یہ معاملہ تمہارے فیصلہ کرنے کا نہیں ہے، یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کا کام ہے۔ جس کو اہل شوریٰ اور اہل بدر پسند کریں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملہ پر غور کریں گے۔" (الامامت والسیاست، ابن قتیبہ) اسی طرح پر مختلف جماعتیں آتی رہیں اور خلافت کے لئے شدت سے اصرار ہوتا رہا۔ پہلے آپ نے اس بارِ گراں کے اٹھانے سے انکار کیا، لیکن آخر میں مہاجرین و انصار کے اصرار سے مجبور ہو کر اس بارِ عظیم کے اٹھانے پر رضامندی ظاہر کی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اگر آپ حضرات کا یہی منشار ہے تو مسجد میں چلئے، "کیونکہ میری بیعت خفیہ طور پر نہیں ہو سکتی، اور مسلمانوں کی عام رضامندی کے بغیر اس کا انعقاد ممکن نہیں۔ (طبری جلد ۳) چنانچہ آپ مسجد نبوی میں تشریف فرما ہوئے، اور مہاجرین و انصار کی ایک کثیر تعداد نے، بعض روایات کے بموجب جس میں حضرت طلحہؓ

زبیر بھی شامل تھے، اپنی مرضی سے حلف اطاعت اُٹھایا۔

جب حضرت علیؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا، تو آپ سے یہ دریافت کیا گیا کہ آپ کے بعد کیا ہم آپ کے صاحبزادے حسنؓ سے بیعت کریں۔ اس پر آپ کی طرف سے یہ جواب دیا گیا، "نہ میں تم کو اس کا حکم دیتا ہوں، اور نہ اس سے منع کرتا ہوں، تم لوگ خود اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔" (طبری جلد ۴) گو آپ نے انتخاب خلیفہ میں جمہوری طریق کا لحاظ کر کے حضرت حسن کو نامزد نہیں فرمایا، اور جانشینی کے مسئلہ کو جمہور مسلمانوں پر چھوڑ دیا۔ لیکن اوصاف و کمالات کے لحاظ سے حضرت حسن سے بہتر اور کوئی شخصیت نہیں تھی۔ اہل عراق سب اس معاملہ میں ہم خیال تھے۔ چنانچہ قیس بن سعد انصاری نے بیعت میں سبقت کی اور کہا میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور محلین سے جنگ پر آپ سے بیعت کرتا ہوں۔ آپ نے کہا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کافی اور تمام شرائط پر حاوی ہے۔ اس کے بعد عام اہل عراق نے بیعت کی۔

یہ تھا وہ طریق انتخاب جو خلافتِ راشدہ کے تیس سالہ دور میں رائج اور اسلام کی روح کے عین مطابق تھا۔ اسی پر صحابہ کا تعامل رہا، اور ہر ایک نے اس کو بنظر استحسان دیکھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان میں سے کسی کا تقرر بھی وراثت یا باستبداد رائے نہیں ہوا، بلکہ مجمع عام میں مہاجرین و انصار کی (جو بمنزلہ ارکان خاص تھے) کثرت رائے سے، اور عام مسلمانوں کی (جو بمنزلہ ارکان عام تھے) تائید و تسلیم سے ہوا۔ حضرت عمرؓ نے صاف فرمایا تھا "خلافت صرف مشورہ سے طے ہو سکتی ہے، شریعت میں اس کے تعین کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔"

حضرت امیر علیہ السلام نے امیر معاویہ کے جواب میں اپنے چند بلیغ جملوں میں انتخابِ خلافت اور جمہوریت کے تمام ارکان کی نہایت خوش اسلوبی سے توضیح فرمائی ہے۔ امیر معاویہ کے جواب میں ارشاد ہوا کہ جس قوم نے ابوبکرؓ و عمرؓ کی بیعت کی تھی، اور جن شرائط پر بیعت کی تھی، اس نے انھی شرائط پر میری بھی بیعت کی ہے جو مجلس انتخاب میں موجود نہ ہو اس کو حق نہیں کہ اپنی رائے پر اڑا رہے، اور جو غیر حاضر ہے اس کو حق نہیں کہ اپنی غیر حاضری کی بنا پر انتخاب عام کو رد کر دے۔ حق مشورہ مہاجرین و انصار کا ہے۔ اگر وہ کسی ایک شخص پر متفق الرائے ہو جائیں اور اس کو امام مقرر کر دیں تو یہ ان کی تمام قوم کی رضائے عام پر دال ہے۔ پس اگر

کوئی ان کی متفق علیہ رائے کے خلاف اپنی کسی ذاتی منفعت اور جاہ طلبی کے تحت افتراق و فساد کا موجب ہو، تو واجب ہوگا کہ جس سے وہ علیحدہ ہوا ہے اس کے قبول پر مجبور کیا جائے، اور اگر اب بھی نہ مانے تو اجماع رائے مسلمین کی حفاظت کی بنا پر اس سے جنگ کی جائے۔ (نہج البلاغت)

خلیفہ کے اوصاف — چونکہ منصب خلافت متنوع حیثیتوں کو اپنے میں شامل کئے ہوتے ہے، اس لئے ہر حیثیت کے لحاظ سے ضروری صفات کی تعیین کر دی گئی۔ ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کیا جائے جس میں مفصلہ ذیل اوصاف پائے جائیں:۔ مسلمان ہو، آزاد ہو، مرد ہو، عاقل و بالغ ہو، صاحب رائے و نظر ہو، تدبیر و انتظام کی پوری قوت رکھتا ہو، احکام شریعت کا محافظ ہو، ان کو جاری و نافذ کرنے، اسلامی ممالک کی حفاظت اور دشمنوں کی روک تھام کے لئے جس قدر علمی و عملی قوتوں کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہوں، اتباع شریعت، عدل و انصاف، شجاعت و بسالت، شوکت و صولت، ساری صفتوں سے متصف ہو۔ شاہ صاحب رح نے ازالۃ الخفاء میں اگرچہ حضرت عمرؓ کی بابت اس جامعیت کمالات کے وصف کو بڑی حسن و خوبی سے بیان کیا ہے، مگر یہ صفت خلیفۂ اول اور خلیفۂ چہارم پر، اور کسی قدر حضرت عثمانؓ پر بھی حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ شاہ صاحب رح نے اسی وصف کو ان بلیغ الفاظ میں ظاہر کیا ہے:۔

"سینۂ فاروق اعظم را بمنزلۂ خانہ تصور کن کہ درہائے مختلف دارد در ہر درے صاحب کمالے نشستہ، در یک در مثلاً سکندر ذوالقرنین باآنہمہ سلیقۂ ملک گیری و جہاں ستانی و جمع جیوش و برہم زدن اعداء، و در در دیگر نوشیرواں باآنہمہ رفق و لین و رعیت پروری و دادگستری (اگرچہ ذکر نوشیرواں در مبحث فضائل حضرت فاروق سوء ادب است) و در در دیگر امام ابوحنیفہ یا امام مالکے باآں ہمہ قیام بہ علم فتویٰ و احکام، و در در دیگر مرشدے مثل سیدی عبدالقادر جیلانی یا خواجہ بہاء الدین، و در در دیگر محدثے بروزن ابوہریرہ و ابن عمر، و در در دیگر حکیمے مانند مولانا جلال الدین رومی یا شیخ فریدالدین عطار، مردماں گرداگرد ایں خانہ ایستادہ اند و ہر محتاجے حاجت خود را از صاحب فن درخواست می نماید و کامیاب می گردد۔"

عروج وزوال کے الٰہی قوانین

از

(جناب مولوی محمد تقی صاحب امینی)

قوموں کا عروج وزوال

تو گل از باغ می خواہی من از گل باغ می جویم — من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

دنیا تغیر وانقلابات کی آماجگاہ ہے۔ یہاں قوموں کی باہمی کشمکش ہے اور جماعتیں ایک دوسرے کے ساتھ زور آزمائی میں مصروف ہیں آج کوئی قوم برسر اقتدار ہے تو کل اس کی جگہ دوسری لے لیتی ہے پھر زیادہ دن نہیں گذرنے پاتے ہیں کہ وہ کسی اور کے لئے جگہ خالی کردیتی ہے۔

قدیم زمانہ میں "بابل ونینوا کو آباد کرنے والی قومیں"۔ "عاد وثمود جیسی پہاڑوں سے ٹکرانے والی طاقتیں"، "نمرود وفرعون" جیسی زیر وزبر کرنے والی شہنشاہیتیں۔ "روم وایران" جیسی تہذیب وتمدن کی شمع روشن کرنے والی سلطنتیں، اور نہ معلوم کتنی قومیں اور کتنی حکومتیں آسمانِ ترقی پر پہنچیں اور پھر ذلت ونامرادی کے گڈھے میں گر کر خاک ہو گئیں۔

یہ اُجڑی ہوئی بستیاں۔ یہ ظلم کی چکی میں پسنے والی قومیں۔ یہ خاک وخون میں لتھڑے ہوئے ملک یہ صحراؤں کے بھٹ اور پہاڑوں کے غاروں میں بھی گوشۂ عافیت نہ پانے والی آبادیاں اور تمام گمنام وبے بس قومیں جو آج کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گذار رہی ہیں دراصل یہ سب وہی ہیں جن پر اقبال وفیروزمندی کا آفتاب روشن ہو چکا تھا اور باغ وبہار کا مزہ لوٹنے کے بعد ہی انھیں یہ دن دیکھنے پڑے ہیں " سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ " اس مرحلہ پر دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ عروج وزوال کے بارے میں مسلمانوں کی تاریخ اتنا واضح اور مکمل نمونہ پیش کرتی ہے کہ جس کے بعد اور کسی قوم کی تاریخ دیکھنے کی

ضرورت نہیں رہ جاتی

یہ وہ قوم ہے جو اپنے ابتدائی زمانہ میں طوفان کی طرح اٹھی بجلی کی طرح چمکی اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی حکومت و مملکت کی حدیں اتنی وسیع کر لیں کہ داعیٔ انقلاب کی وفات کے بعد بارہ برس کے اندر چھتیس ہزار شہر اور قلعے فتح کر کے بائیس لاکھ مربع میل پر قبضہ کر لیا اور پہلی صدی ہجری ختم ہونے سے پہلے ہی ایک طرف تو مشرق میں "سندھ" اور "چینی ترکستان" تک اور دوسری طرف مغرب میں "ہسپانیہ" تک اپنے اقتدار میں لے لیا۔ علوم و فنون کی ترقی کے لحاظ سے مدتوں ساری دنیا پر اپنی فوقیت و برتری کا بے داغ سکہ چلایا۔ ذہنی و دماغی اور اخلاقی و مادی لحاظ سے صدیوں ایسی کامیاب حکومت کی کہ اپنے پاور ہاؤس سے پرانی دنیا کے تینوں براعظم کو روشنی پہنچاتی رہی، اب یہ وہی قوم ہے جس پر فلاکت و ادبار مسلط ہے۔ جو ذلیل و خوار ہے۔ جس کے بازو شل اور دماغ جامد ہیں جس میں جہاد و اجتہاد کی طاقت ناپید ہے۔ جو اپنے وطن سے بے وطن ہو رہی ہے اور وطن میں رہ کر غریب الوطنی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ جو آج کسی کی غلامی میں پھنستی ہے تو کل کسی اور کی محکومیت کا طوقِ لعنت پہنتی ہے جس کا دنیا میں نہ کوئی غم گسار باقی رہ گیا ہے اور نہ یار و مددگار۔ جس کی حالتِ زار پر نہ آسمان کو رونا آتا ہے اور نہ زمین کو " فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ "۔

اسی طرح تاریخ عالم پر نظر ڈالئے تو بہت سی ایسی مثالیں دکھائی دیں گی جو بلندیوں اور سرفرازیوں پر پہنچ کر گریں اور گر کر پست ہو گئیں اور بہت سی وہ ملیں گی جو پستیوں اور نامرادیوں سے اُٹھیں اور اُٹھ کر بلند ہو گئیں۔ مغرب میں قلعۂ الحمراء اور قصر الزہراء مشرق میں قلعۂ شاہجہانی اور تاج محل زبانِ حال سے اسی حقیقت کی شہادت پیش کر رہے ہیں۔

الغرض یہی نشیب و فراز۔ یہی اتار چڑھاؤ۔ یہی بناؤ بگاڑ ایک لامعلوم زمانہ سے چلا آ رہا ہے نہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ کسی ایک حالت پر سکون اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔

عروج و زوال بخت و اتفاق کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے اسباب و علل بھی ہوتے ہیں	ایسی حالت میں یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اس تغیر و انقلاب کے پس پشت کچھ قوانین و اسباب کار فرما ہوتے رہے ہیں؟ یا یہ سب کچھ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ رہا ہے؟

اس حقیقت سے فلسفہ کا طالب علم اچھی طرح واقف ہے کہ علت و معلول کی دنیا میں ہر ادنیٰ سے ادنیٰ تغیر اور معمولی سے معمولی انقلاب کے لئے اسباب و علل کا پایا جانا ضروری ہے۔

یہ اور بات ہے کہ اسباب و علل کی دنیا تک ہماری فہم نارسا کی رسائی نہ ہو اور وہ ہماری سمجھ میں نہ آسکیں اس بنا پر یہاں کسی شے کے اتفاقاً بلا کسی سبب کے ہو جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا البتہ وہ اسباب و علل کیا ہیں جن پر قوموں کا عروج اور زوال ہوتا رہتا ہے؟

اس سلسلہ میں ہمیں فلسفۂ تاریخ سے بہت کچھ رہنمائی مل سکتی ہے لیکن بدقسمتی سے اس کا جدید ایڈیشن جو ہمارے سامنے ہے وہ ایک ایسی فضا کا پیداوار ہے جس میں زندگی کی حقیقتوں میں سراغ رسانی کا معیار بدل چکا ہے اس لئے لازمی طور سے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ افراط و تفریط سے پاک ہو کر اس مسئلہ کا صحیح حل پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ پھر عروج کے جن اسباب کی طرف وہ نشاندہی کرتا ہے وہ بعض حیثیات سے اس قدر ناقص و نامکمل ہیں کہ ان پر پوری طرح قابو حاصل کر لینے کے بعد بھی حقیقی معنوں میں "انسانیت" اپنی تشنگی نہیں بجھا سکتی ہے چنانچہ جن لوگوں نے ڈاکٹر "لیبان" و "رینان" اور ان کے ہم خیال لوگوں کی کتابوں اور مقالات کا خورد بینی کی نگاہ سے نہیں بلکہ حقیقت بینی کی نگاہ سے مطالعہ کیا ہے وہ یقیناً ہماری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔ اور اسباب و علل کی دنیا تک پہنچنے کے لئے کہیں اور سے روشنی حاصل کرنے پر مجبور ہوں گے۔

بڑی ناقدر شناسی ہوگی اس موقع پر اگر ہم خلاقِ فطرت کے عطا کئے ہوئے دستورِ حیات (قرآن حکیم) میں اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں حالانکہ اس کا دعویٰ ہے کہ اس کے پیش کئے ہوئے "نظام" میں زندگی کے تمام "خد و خال" نمایاں کئے گئے ہیں نیز یہ کہ وہ "خالص فطری نقطۂ نگاہ" سے تمام بنیادی مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔

اس جگہ ہم "قرآن حکیم" میں متجسسانہ نظر ڈالنے سے پہلے ایک اہم حقیقت واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ آج ہمارے لئے کسی مسئلہ کو فطری طور پر سمجھنا اس لئے مشکل ہو گیا ہے کہ بے لگام عقل و ہوس کی موشگافیوں اور سرمستیوں نے ہمارے اوپر قبضہ جما رکھا ہے جس کی بنا پر ہر شے کے

دیکھنے اور سمجھنے کے لئے خوردبینی کی نگاہوں کی تلاش ہوتی ہے اور جب تک اسی نگاہ سے شئی کو دیکھ نہیں لیا جاتا اس پر اعتبار نہیں قائم ہوتا۔

اس سلسلہ میں صرف اتنی گذارش ہے کہ اگر آپ کے پاس غیر مسلح نگاہیں موجود ہیں تو اس ترجمان الفطرت (قرآن) کو انھیں نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کیجئے۔

اور اگر آپ نے اس کو مسلح نگاہوں سے دیکھا تو یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ جس قدر آپ سلجھاؤ کی کوشش کریں گے معاملہ اُلجھتا جائے گا۔ اور بالآخر یہ نتیجہ نکلے گا کہ

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت دیکھا کہ وہ ملتا ہی نہیں اپنے کو کھو آئے

قرآن حکیم کا بیان اس بارے میں زیادہ جامع اور حقیقت آمیز ہے	قرآن حکیم کی نظر میں جس طرح مادی دنیا کی کوئی شے اتفاقاً نہیں ہوتی اسی طرح معنوی دنیا یعنی انسانوں کی عمرانی و اجتماعی زندگی کی کوئی شے بھی محض بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں قرار دی جاسکتی بلکہ ہر ایک کے لئے اصول و ضوابط مقرر

ہیں جن کے ماتحت تغیر و انقلاب کی منزلیں طے ہوتی رہتی ہیں۔

چنانچہ قوموں اور جماعتوں کے جو احوال ذطرف "قرآن" میں بیان کئے ہیں ان میں گہری نظر ڈالی جائے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ وہ حق و باطل کی معرکہ آرائی۔ آزادی و غلامی کی کشمکش ظالم و جابر حکومتوں کی قہرمانی اور مظلوم و مقہور کے ہاتھوں ان کی ہلاکت و بربادی کی عبرت انگیز داستانیں اور لرزہ خیز حکایتیں ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک خاص طرز سے عروج و زوال کے اسباب۔ موت و حیات کے ضوابط اور بناؤ بگاڑ کے قوانین بیان ہوئے ہیں۔ اور ان کے بیان سے کسی قوم و جماعت کی محض تاریخ پیش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اسباب و علل کی دنیا کے چند ابدی حقایق ہیں جن کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

زمانۂ جدید کے مورخین نے تاریخی واقعات سے اجتماعی قوانین نکالے ہیں اور قوموں کی طبیعت کے اصول اخذ کئے ہیں جن کو دنیا دورِ جدید کا "شاہکار" سمجھتی ہے۔

لیکن قرآن حکیم نے آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے تاریخی حقایق سے اجتماعی قوانین۔

اخلاقی خصوصیات اور عقاید و اعمال کے خواص و نتائج سے بحث کی ہے اور ہر صاحب بصیرت کو اس بات کی طرف غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ دنیا کا ہر تغیر و انقلاب ہر اتار چڑھاؤ نہ کبھی بخت و اتفاق کا نتیجہ رہا ہے اور نہ رہتی دنیا تک ایسا ہونا ممکن ہے بلکہ اس سلسلہ میں ہمیشہ "قوانین فطریہ" کام کرتے چلے آئے ہیں وہ جس طرح ماضی میں پائے جاتے رہے ہیں بعینہ اسی طرح حال و مستقبل میں پائے جاتے رہیں گے۔

ان میں نہ کسی قسم کی تبدیلی پہلے ہوئی ہے اور نہ اب ہونے کا امکان ہے۔

قرآن کی خاص اصطلاحی زبان میں انھیں قوانین کو لفظ "سنۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے اور انھیں کی تشریح و توضیح اس کتاب کا "موضوع" ہے "سُنَّةَ اللهِ فِي الَّذِينَ خَلَوا مِن قَبلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبدِيلًا"

عروج و زوال کا نظام اہلیت و صلاحیت پر قائم ہے

اب ہم قرآن حکیم کی روشنی میں اس "زمین" کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں سب سے پہلے عروج و زوال کی تخم ریزی ہوتی ہے۔

اس سلسلہ کی آیتیں یہ ہیں

إِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَومٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِم ۱۳/۱۱

بے شک اللہ کبھی اس حالت کو نہیں بدلتا جو کسی قوم کو حاصل ہوتی ہے جب تک کہ وہ خود ہی ان چیزوں کو نہ بدلیں جو ان کے "انفس" کے ساتھ وابستہ ہیں

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللهَ لَم يَكُ مُغَيِّرًا نِعمَةً أَنعَمَهَا عَلَى قَومٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِم ۸/۵۳

یہ بات اس لئے ہوئی کہ اللہ جو نعمت کسی قوم کو عطا فرماتا ہے اسے وہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ اس قوم کے افراد ان چیزوں کو نہ بدلیں جو ان کے "انفس" کے ساتھ وابستہ ہیں۔

دونوں آیتوں میں لفظ "مَا بِأَنفُسِهِم" نہایت غور و فکر کا مستحق ہے اس کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد عروج و زوال کے بارے میں "سنت اللہ" کی بنیاد واضح ہو جاتی ہے اس لئے

اس موقع پر کچھ تھوڑی سی تشریح کی ضرورت ہے۔

قومی و جماعتی زندگی میں انقلاب کے دو درجے ہوتے ہیں، پہلا درجہ ذہنی انقلاب کا ہوتا ہے اور دوسرا عملی انقلاب کا۔ پہلے افکار و احساسات اور تصوراتِ زندگی میں تبدیلی ہوتی ہے جس سے سوچنے سمجھنے کی بنیادیں متعین ہوتی ہیں پھر انھیں بنیادوں پر عمل کی دیواریں استوار ہو کر پوری عمارت کی تشکیل ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ باہری دنیا کی تبدیلی اندرونی تبدیلی پر موقوف ہے اور "عالمِ آفاق" کا تغیر "عالمِ انفس" کے تغیر کا رہینِ منت ہے۔ اسی بنا پر انقلاب خواہ عروج کی طرف ہو یا زوال کی طرف سب سے پہلے اس کی تخم ریزی قلب و دماغ اور ذہن و افکار میں ہوتی ہے پھر اس کی برگ و باری اور تناور درخت بننے کے لئے دنیا کی وسیع اور کشادہ آبادی کی ضرورت پڑتی ہے۔

مذکورہ آیتوں میں قرآنِ حکیم نے اپنے معجزانہ انداز میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی قوم عزت و اقتدار اور عروج کی نعمت سے سرفراز ہے تو جب تک اس کے اندر اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت باقی رہتی ہے قدرت اس کو سلب نہیں کرتی۔

اور جب وہ ذہنی و فکری اور پھر عملی و اخلاقی لحاظ سے اس بات کا ثبوت فراہم کر دیتی ہے کہ اب وہ اس نعمت سے متمتع ہونے کے قابل نہیں رہ گئی تو قدرت اس نعمت کو اس سے سلب کر لیتی ہے۔

اسی طرح جس قوم پر فلاکت و ادبار اور زوال مسلط ہے تو جب تک خود اس قوم کو احساس نہیں ہوتا اور سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ میں بنیادی تبدیلی پیدا کر کے اعمال و اخلاق کے ذریعہ نعمتوں سے سرفراز ہونے کا استحقاق نہیں ثابت کر دیتی اس وقت تک قدرت دوسری قوم کو ہٹا کر اس کی جگہ اس قوم کو نہیں بٹھاتی اور جب مستحق ہونے کا ثبوت فراہم ہو جاتا ہے اور اس اثنار میں دوسری قوم مہلت و ڈھیل کی ساری منزلیں طے کر چکی ہوتی ہے تو پھر وہ ہٹا دی جاتی ہے اور یہ قوم اپنا جائز مقام پیدا کر لیتی ہے۔

حاصل یہ کہ کسی قوم کے جب تباہی و بربادی کے دن آتے ہیں تو سب سے پہلے فکر و نظر میں تبدیلی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ رفتہ رفتہ زندگی کے جواہر فنا کرکے زندہ رہنے کی اہلیت و صلاحیت کھو دیتی ہے۔

اسی طرح جس قوم کو ابھرنا ہوتا ہے تو پہلے فکر و نظر کی اصلاح ہوتی ہے پھر "جواہر" کی نشو و نما ہو کر رفتہ رفتہ زندگی کی اہلیت و صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

الغرض دنیا میں قوموں اور جماعتوں کا نظام جد و جہد، سعی و طلب اور فکر و عمل کی صلاحیتوں پر قائم ہے خوابوں کی دنیا میں رہنے والی قومیں اور دور سے "سراب" کو دیکھ کر پانی سمجھنے والی جماعتیں کبھی کامیابی کی منزل سے ہم کنار نہیں ہو سکتیں۔

اور لفظ "ما بانفسھم" میں جس طرح تمام ان صلاحیتوں کی طرف اشارہ ہے کہ زندگی کی گاڑی چلانے کے لئے جن کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح تمام ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کی طرف بھی اشارہ ہے جن کے دور کئے بغیر اس گاڑی کا چلنا محال اور دشوار ہوتا ہے۔

قدرت کی نظر میں اہلیت و صلاحیت "افادیت" کے پیمانہ سے ناپی جاتی ہے

اس کی مثال بالکل یوں سمجھئے کہ دنیا ایک باغ ہے اور اس کے مالک کے سامنے باغ کے آراستہ کرنے کا ایک نقشہ ہے جس میں اس بات کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ یہ مخلوق کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور نافع ثابت ہو۔

مالک کو ایسے باغباں کی تلاش ہے جس نے ٹھیک ٹھیک اس نقشہ کے مطابق "افادیت" کے تمام خد و خال نمایاں کرنے کی مشق کی ہو۔ جب تک یہ نہ ملے گا حسب حیثیت "افادیت و صلاحیت" کے پیش نظر ہر ایک کو موقع دیا جاتا رہے گا لیکن جب اس قسم کا باغباں مل جائے گا تو "حق" صاحب حق تک پہنچانے میں کسی قسم کا دریغ نہ ہوگا۔

عہ جرمن کے مشہور فلسفی "نٹشے" نے نفس کی یہ تعریف کی ہے۔
"خیالات و احساسات کی تہ میں ایک زبردست حاکم اور ایک نامعلوم فلسفی مضمر ہے جسے نفس (سلف) کہا جاتا ہے لیکن "النفس" اس موقع پر اس سے زیادہ وسیع اور عام ہے اور اندر کی تمام ان قوتوں میں شامل ہے جن کا اثر بناؤ یا بگاڑ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر "النفس" کو "آفاق" کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے سنریھم آیتنا فی الآفاق و فی انفسھم ۴۲/۵۳

قرآن حکیم کی درج ذیل آیت میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۱۳/۱۷

اللہ نے آسمان سے پانی برسایا جس سے نالے ندیاں اپنی مقدار کے مطابق بہنے لگیں اور سیلاب کی "رو" نے اوپر اوپر جھاگ پیدا کر دیا۔ ایسی جھاگ اس وقت بھی پیدا ہوتی ہے جب کہ زیور اور دوسری چیزیں بنانے کے لئے دھاتوں کو آگ میں پگھلاتے ہیں۔

اللہ حق و باطل کی ایسی ہی مثال دیتا ہے دیکھو جھاگ تو ناچیز اور ناکارہ ہو کر معدوم ہو جاتی ہے اور جو چیز نفع مند اور کارآمد ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے۔

پانی سونا چاندی اور دوسری دھاتیں چونکہ "نافع" ہیں اس لئے باقی رہتی ہیں اور اوپر آئی ہوئی جھاگ "غیر نافع" ہے اس لئے ختم ہو جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں جو بحیثیت مجموعی "نافع" ہو اس کو پائیداری حاصل ہوتی ہے اور جو غیر نافع ہو...... وہ رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے۔

سیلِ آب پر ابھر ابھر کر آنے والے تنکے بے فیض اور بے ٹھکانے ہوتے ہیں لیکن زرخیز مٹی تہ میں بیٹھ کر جم جاتی ہے! ایسے ہی پگھلی ہوئی دھاتوں کی سطح پر پیدا ہونے والی جھاگ بے قدری سے ہٹا دی جاتی ہے مگر خالص دھات اپنی افادیت کی وجہ سے قابل قدر ہوتی ہے۔

قرآن حکیم قیام و ثبات کے لئے "بقاء انفع" کا نظریہ پیش کرتا ہے	اس آیت میں دراصل "بقاء انفع" کا نظریہ پیش کیا گیا ہے اس میں اور علمی دنیا کے "بقاء اصلح" کے نظریہ میں وہی فرق ہے جو انسان اور

مالک تعالیٰ کے "نظریہ" میں ہونا چاہیے۔

"انسانیت" کے تمام گوشوں کو سمجھنے کے لئے جو وسعت اور بلندی پہلے میں ہے وہ نہ دوسرے میں ہوسکتی ہے اور نہ ہے۔

ایک تو یہ انسان کی بنیاد حیوانیت پر رکھی جائے اور حیوان کی ترقی یافتہ شکل سمجھ کر اسی زاویۂ نگاہ سے اس کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اور دوسری یہ کہ انسان کی بنیاد "اخلاق" پر رکھی جائے اور اس کو دنیا میں اللہ کا نائب وقائم مقام مانا جائے پھر اس کے مسائل حل کئے جائیں۔

ان دونوں میں بڑا فرق ہے اور عملی میدان میں دونوں کا اثر بالکل دو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوگا۔

پہلی راہ وہ ہے کہ جس پر چل کر مفکرینِ عالم "انسانیت" کے مسائل حل کرنے میں مصروف ہیں اور آپ غور فرمائیے کہ "نایافت" کے طعنے سے بچنے کے لئے کس طرح "انسانیت" کے "اقدار" بدلتے جارہے ہیں۔

اور دوسری "راہ "قرآن" کی ہے کہ ابتدائے آفرینش سے جب کبھی انسان نے اس راہ کو اپنایا ہے دنیا امن وشانتی کا گہوارہ بن گئی ہے اور انسانوں کے درمیان سے تمام "دوئی" کے پردے ہٹ گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہزاروں سال کی مسلسل جستجو کے بعد جدید انسان نے خارجی حقیقت کی "عکاسی" کے لئے جو آئینہ تیار کیا ہے اس میں سوائے "اپنے" عکس کے تقریبًا ساری چیزیں اس نے دیکھ لی ہیں باہر کی دنیا کا پتہ لگانے میں وہ بہت حد تک کامیاب ہے لیکن خود انسان کے بارے میں ابھی بہت سے سوالات باقی ہیں جن کا تشفی بخش جواب اُسے نہیں مل سکا۔

اور یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جب تک انسان ٹھیک اپنا پتہ نہ لگائے گا اس وقت تک دنیا کے دیگر مسائل کا خاطر خواہ حل نہ ڈھونڈھ سکے گا۔

قرآن کا کام بس انسان کی حقیقت واشگاف کر کے اس کا مقام متعین کر دینا ہے جو انسانی عقل کے دسترس سے باہر کی چیز ہے۔

اس کا کام ہست و بود کی نیرنگیوں کی تحقیقات میں الجھنا نہیں ہے جو بہت حد تک انسان کے قابو میں ہیں۔

جو لوگ دنیا کے لئے "نافع" ہوتے ہیں ان کے چند خصائل و اعمال	پھر آگے چل کر قرآنِ حکیم نے ان لوگوں کے اعمال گنائے ہیں جو احکامِ حق قبول کر کے دنیا کے لئے "نافع" ثابت ہوتے۔

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۔ ۱۳/۲۰	جو لوگ اللہ کے ساتھ اپنی عبودیت کا عہد پورا کرتے ہیں اور قول و قرار کو توڑتے نہیں (اللہ کی غلامی میں سچے اور کامل ہیں)
وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ	جن رشتوں کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا انہیں جوڑے رکھتے ہیں (ظلم و ناانصافی سے توڑتے نہیں بلکہ ہر رشتہ اور ہر تعلق کا حق ادا کرتے ہیں)

"پہلی آیت تمام حقوق اللہ کو شامل ہے اور دوسری تمام حقوق العباد کو"

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۱۳/۲۱	اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور حساب کی سختی سے اندیشہ ناک رہتے ہیں (آخرت کی فکر سے بے پرواہ نہیں ہوتے اور ہر وقت اللہ کے سامنے جواب دہی کا تقویٰ پیش نظر رہتا ہے)
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ	اپنے رب کی رضا جوئی کی خاطر، ہر طرح کی سختیوں اور ناگواریوں کو برداشت کرتے ہیں (اس راہ میں ہر طرح کی ناگوار حالتیں صبر و ثابت قدمی کے ساتھ جھیل لیتے ہیں اور شدتوں محنتوں کو پیٹھ نہیں دکھاتے)
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ	نماز اس کی ساری شرطوں کے ساتھ قائم رکھتے ہیں

وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً — جو کچھ کماتے ہیں صرف اپنے ہی اوپر نہیں خرچ کرتے بلکہ دوسروں پر کھلے اور پوشیدہ ہر حال میں خرچ کرتے ہیں

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ — برائی کو بھلائی کے ساتھ دفع کرتے ہیں (برائی کے مقابلہ برائی کرنا ان کا شیوہ نہیں بلکہ کوئی ان کے ساتھ کتنی ہی برائی کرے یہ اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آتے ہیں)

اوپر جن جن باتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں بعض وہ ہیں جن کا تعلق براہ راست "اخلاق" سے ہے اور بعض وہ ہیں جو ایک خاص زاویہ نگاہ کے مطابق اخلاق کو پیدا کرنے والی ہیں مجموعی حیثیت سے جن اخلاقی اوصاف کا تذکرہ قرآن حکیم کے مختلف مقامات میں ملتا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

اطاعت حق۔ ضمیر کی آزادی۔ شجاعت و بہادری۔ سچائی۔ انصاف و رحم۔ رواداری ایفائے عہد۔ امانت و دیانت۔ عفو و درگذر۔ دشمن سے اچھا برتاؤ۔ مساوات۔ ایثار و قربانی۔ توکل و اعتماد۔ اطمینان و خودداری۔ شیریں کلامی۔ میانہ روی۔ عزم و استقلال۔ پیش بینی۔ امید۔ احتساب نفس (اپنے اعمال کے متعلق حساب لینا تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ آج اچھے کام کتنے ہوئے ہیں اور برے کام کتنے گر برائیاں زیادہ ہیں تو ارادہ کرے کہ کل ان میں کمی کی کوشش ہوگی اور نیکیاں ہیں تو مزید اضافہ کا ارادہ کرے حتی کہ اس کا دل اور عملی طاقتیں سرتاسر نیک ہوجائیں) ذمہ داری کا احساس۔ ہر کام میں ایمانداری۔ حیار و شرافت۔ عفت و پاکدامنی ہمدردی و غمخواری۔ محبت و مروت۔ صبر و ثبات۔ اخلاص و بےنفسی۔ نیکی سے الفت اور برائیوں سے نفرت۔ بےغرض دوسروں کی خدمت کا جذبہ وغیرہ۔

عروج و زوال کا سنگ بنیاد اخلاق پر رکھا جاتا ہے — دراصل یہی وہ اخلاقی جوہر ہیں جن پر قوموں اور جماعتوں کی زندگی کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور انہیں سے قوت و طاقت اور عزت و سلطنت حاصل ہوتی ہے

کیوں کہ یہ اخلاق ہی کی شان ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی "نیابت" کا رنگ پایا جاتا ہے اسی بنا پر داعی انقلابؐ نے فرمایا

تخلقوا باخلاق اللہ (الحدیث) اللہ تعالیٰ والے اخلاق کو اپنے اخلاق بناؤ

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ دنیا کی جو قوم اور جو جماعت ان اوصاف سے جتنی متصف ہوگی اسی مناسبت سے اہلیت وصلاحیت پیدا کر کے زمین میں اللہ کی "نیابت" کی مستحق ہوگی اور وہی مجموعی حیثیت سے خلق خدا کے لئے "نافع" ثابت ہوگی [1]

---

[1] اس موقع پر فلسفۂ تاریخ کے دو مشہور استاد کی رائے نقل کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا - علامہ ابن خلدون کہتے ہیں -

قوموں کی ترقی نہ مادی طاقت کی فراوانی سے ہوتی ہے اور نہ صرف عقل ودماغ کی ترقی سے بلکہ اس کے لئے قومی عصبیت اور اخلاق کی ضرورت ہے -

وہ اخلاق جن سے قوموں میں زندگی پیدا ہوتی ہے اور عزت وسلطنت ملتی ہے یہ ہیں عمدہ اور اچھی عادتیں مظلوم وبیکس کے باتوں کی برداشت - مکروہات ومصائب پر صبر کرنا - محنت ومشقت اور جدوجہد سے جی نہ چرانا - حق بات کو بغیر کسی رعونت کے سننا اور اس کی پیروی کرنا - عہد اور وعدوں کو پورا کرنا - ضعیف الحال لوگوں کے ساتھ انصاف اور شفقت سے پیش آنا اور بذل وسخاوت سے کام لینا - مسکینوں سے تواضع کے ساتھ ملنا - دادخواہوں کی فریاد سننا - عزت کی حفاظت کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دینا - لوگوں سے کرم وعفو کے ساتھ پیش آنا - مہمانوں کی میزبانی کرنا مکروریا اور نقض عہد سے پرہیز کرنا وغیرہ وغیرہ (مقدمہ ابن خلدون حصہ اول ودوم میں سیر حاصل بحث موجود ہے)

اور ڈاکٹر لیبان" کہتے ہیں

ہر قوم میں انقلابات وتغیرات صرف اخلاق کے ذریعہ ہوتے ہیں اور وہی ان کے مستقبل کا سنگ بنیاد رکھتا ہے . . . .

قومی زندگی کی بنیاد صرف اخلاق کے ستونوں پر قائم ہے عقل ودماغ کا حصہ ان میں بہت کم ہے . . . .

جب کسی قوم کا شیرازۂ اخلاق درہم برہم ہو جاتا ہے تو وہ مر جاتی ہے اور اخلاقی اوصاف میں اسی قدر تنزل پیدا ہوتا ہے جس قدر قوم عقل ودماغ میں ترقی کرتی ہے . . . .

جماعت انسانی کا نظام - مذہب کی بنیاد - سلطنتوں کا معیار صرف اخلاق کی سطح پر قائم ہے عقل کو اس میں کوئی دخل نہیں . . . .

تمام قومیں اخلاق ہی کے ذریعہ حس وحرکت کرتی ہیں اور صرف غور وفکر سے دنیا کا کام نہیں چلتا ہے -

عقلی انقلابات میں ذہانت دوسرے درجہ کا انقلاب ہے اصلی سنگ بنیاد صرف اخلاق ہے -

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اور جو قوم جس قدر اخلاقی جوہر کو ختم کردے گی اسی مناسبت سے وہ رفتہ رفتہ زندگی کی اہلیت وصلاحیت کھو کر تباہ و برباد ہو جائے گی کیوں کہ جو خرابی اس راہ سے آتی ہے اس کی براہ راست زوالِ انسان کی بنیاد پر پڑتی ہے جس کی بنار پر وہ زندگی کے تمام گوشوں میں سرایت کر کے اس کے پورے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے۔

اس بارے میں چند آیتیں یہ ہیں

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ١٧/١٦	اور جب ہمیں کسی شے کو ہلاک کرنا ہوتا ہے تو اس بستی کے خوش حال لوگوں کو حکم (تکوینی) دیتے ہیں پس وہ نافرمانی میں سرگرم ہو جاتے ہیں جس کی بنار پر عذاب کی بات ان پر ثابت ہو جاتی ہے پھر (باداش عمل میں) انھیں برباد و ہلاک کر ڈالتے ہیں
وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ٦/١٣٢	ہر ایک کے اس کے اعمال کے مطابق درجے ہیں اور تمہارا پروردگار ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے
فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ٦/٦	ہم نے ان کے گناہوں کی وجہ سے انھیں ہلاک کر دیا
فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ٣/٥	اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا

اسی طرح قرآن حکیم نے جہاں کہیں قوموں کی ہلاکت و بربادی یا ان کے عروج و اقبال کا ذکر کیا ہے دونوں کا سبب اعمال و اخلاق کو قرار دیا ہے۔

اس کی نظر میں ترقی و کامیابی بھی اسی راہ سے آتی ہے اور ذلت و ناکامی بھی اسی راہ سے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لیکن وہ کارخانوں اور کتابوں کے اوراق میں نہیں ملتا ہے بلکہ اس کی تحصیل کے لئے دفتر کے دفتر الٹنے پڑتے ہیں اور مختلف قوموں سے واقفیت حاصل کرنی ہوتی ہے ......

جب عقل غیر معمولی نشو و نما حاصل کر لیتی ہے تو اکثر اخلاق کو فنا کر دیتی ہے ......

پھر ڈاکٹر موصوف اپنے دعویٰ کے ثبوت میں مختلف قوموں کی مثال پیش کرتے ہیں مثلاً

رومن قوم اپنے تنزل و انحطاط کے زمانہ میں عقلی حیثیت سے اپنے آبار و اجداد کی بہ نسبت زیادہ طاقتور تھی تاہم چونکہ اپنی آبائی وراثت یعنی اقدام ۔عزم ۔شجاعت ۔ جانبازی غرض ان تمام اخلاق کو جن کے ذریعہ ان کے آبار و اجداد نے ترقی کی وہ کھو چکی تھی اس لئے بالآخر تنزل کے غار میں گر پڑی۔

اخلاق ہی کی استواری نے ہندوستان کے تیس کروڑ باشندوں کو ساٹھ ہزار انگریزوں کا غلام بنادیا ...... ہے حالانکہ عقلی حیثیت سے ہندوستان میں بہت سے لوگ ہیں جو انگریزوں کے دوش بدوش کھڑے ہو سکتے ہیں بلکہ بعض کو فلسفیانہ مباحث میں ان پر ترجیح دی جا سکتی ہے (ملاحظہ ہو انقلاب اسلام ص ۹ و ۵۳ و ۵۴ و ۸۳)

اخلاق نہ ہونے کی صورت میں تمدن خود تمدن کا دشمن ثابت ہوتا ہے

اس سلسلہ میں اگر آپ پوری دنیا کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور قوموں کے اتار چڑھاؤ کی رفتار دیکھنے میں نہایت دقیقہ رسی سے کام لیں نیز اخلاقیات کے دائرہ کو ظاہری مراسم تک محدود نہ رکھیں تو دنیا کی ہر قوم اسی حقیقت کی شہادت پیش کرتی نظر آئے گی۔

یہ ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم کا سنگ بنیاد دوسری قوم کے کھنڈر پر رکھا جاتا ہے اور بالعموم ہر جانے والی قوم آنے والی سے مادی قوت وطاقت اور وسائل و ذرائع میں بڑھی ہوئی ہوتی ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سا بنیادی عنصر ہے جو اس کو اپنا مقام چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے۔

اصل بات یہی ہے کہ تمدنی عیش وعشرت اور بے آہنگ عقل وہوس کی نمائش اخلاقی جواہر کو فنا کر کے اس کا حوصلہ پست کر دیتی ہے اور مقابل کی قوم عزم وہمت کے ساتھ نیا حوصلہ لے کر میدان میں آتی ہے جو اخلاقی اقدار کا ایک لازمی عنصر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسی حالت میں فوجی تفوق اور قوت وطاقت کے دیگر وسائل و ذرائع کچھ کام نہیں دیتے اور بہت سی مسلح و متمدن قومیں اُن کے لئے جگہ خالی کر دینے پر مجبور ہوتی ہیں جو دیکھنے میں نہایت پست لیکن اخلاقی اقدار کی تخم ریزی ہو جانے کی بنا پر فوجی اسپرٹ و دیگر لوازم حیات ان میں موجود ہوتے ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ علوم و فنون کی ترقی اور مادی وسائل قومی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سب کی حیثیت ثانوی ہے اصلی سنگ بنیاد "اخلاقی اقدار" ہیں۔ اخلاقی طاقت مادی وسائل کی کمی کی تلافی کر دیتی ہے لیکن مادی وسائل کی فراوانی اخلاقی فقدان کی تلافی نہیں کر سکتی اس کی تفصیلی بحث آگے آئے گی۔

ان تمام حقیقتوں میں ہماری غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ کسی قوم کے اُبھار کی ابتدائی حالت سامنے نہیں ہوتی بلکہ اس وقت کی حالت کو دیکھتے ہیں جب کہ قوم ترقی کر چکی ہوتی ہے اس لئے وہ بنیادی باتیں ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں جن پر ترقی کی بنیاد ہے۔

ادبیات

غزل

از

(جناب روشؔ صدیقی)

حرفِ آساں لب آشنا نہ ہوا میں زمانے کا ہم نوا نہ ہوا

بوئے گل کیوں نہیں گریباں گیر یہ تو موسم بہار کا نہ ہوا

حادثے کتنے دل پہ گذرے ہیں کس قیامت کا سامنا نہ ہوا

وہ غمِ دو جہاں کو کیا جانے جو ترے غم میں مبتلا نہ ہوا

وہم امید و یاس باطل ہے کیا ہوا عاشقی میں کیا نہ ہوا

تجھ سے ہو کر جدا یہ دل اے دوست پھر کسی حال میں جدا نہ ہوا

وہ، جو مفہوم تھا محبت کا جاں نثاری سے بھی ادا نہ ہوا

بندگی ہی میں کچھ کمی ہوگی بندگی میں اگر بھلا نہ ہوا

چشمِ پُرنم ہے ساغرِ لبریز رند کیا ہے جو پارسا نہ ہوا

اُس کے وعدے نے بات تو رکھ لی لاکھ شرمندۂ وفا نہ ہوا

کتنے درماں شناس ملتے ہیں کیوں کوئی درد آشنا نہ ہوا

ہم نے جادو کیا غزالوں پر کوئی ہم سا غزل سرا نہ ہوا

حق پرستی کہاں کہ ہم سے روشؔ

ان بتوں کا بھی حق ادا نہ ہوا

غزل

از جناب الم مظفرنگری

یہ نہ کہئے سعیٔ پیہم کا کوئی حاصل نہیں
کیا مسافر کے لئے صبح سحر منزل نہیں

لذتِ ہمدردیٔ انساں اسے حاصل نہیں
آشنائے غم جہاں میں جس کسی کا دل نہیں

اے شناورِ غفلت یک لمحہ سے بھی ہوشیار
دامنِ ہر موجِ طوفاں دامنِ ساحل نہیں

ہے سبق آموز ہر نظارۂ بزمِ جہاں
اک حقیقت ہے فریبِ جلوۂ باطل نہیں

خرمنِ گل سے تمہارا واسطہ ہے بجلیو!
آشیاں پر حملہ زن ہونے سے کچھ حاصل نہیں

سرحدِ فانوس سے پروانہ اور آگے بڑھے
گرم رفتارِ وفائے غم ہے یہ منزل نہیں

عقل کی نیرنگیوں سے کھیل لینے دو اسے
ذہن آوارہ شناسائے مزاجِ دل نہیں

اے الم تائید عزمِ نوجواں سے وقت پر
غالب آ جانا ہر اک مشکل پہ کچھ مشکل نہیں

غزل

(از جناب اشفاق علی خاں ایڈوکیٹ شاہجہانپوری)

کر گیا بے باک میرے دل کو زنداں اور بھی
ہو گیا رنگِ جنوں میرا نمایاں اور بھی

علم و حکمت، عزم و ہمت، شعر و نغمہ، ذوق شوق
ہیں ابھی میری حدیثِ دل کے عنواں اور بھی

تو نے دیکھی ہے فقط میرے تموّج کی نمود
میرے قلزم میں نہاں لاکھوں ہیں طوفاں اور بھی

پھر ابھی ہوتا ہے تازہ قصّۂ طور و کلیم
ایک تجلی اے نگاہِ برق ساماں اور بھی

جس کی ارزانی کبھی آئی نہ پاسِ حق کے کام
اُس لہو کو فطرۃً ہونا ہے ارزاں اور بھی

رکھ لیا میں نے ہی کچھ تیری خدائی کا بھرم
ورنہ میرے سامنے آئے تھے یزداں اور بھی

ہے مرے شعرِ غزل کا اور ہی کچھ آب و رنگ
یوں تو ہیں اشفاق محفل میں غزل خواں اور بھی

شئونِ علمیہ

لڑکا یا لڑکی قدیم زمانے سے انسان اس فکر میں رہا ہے کہ معلوم کرے کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی۔ ایک قدیم مصری نوشتہ میں جنین کے پہچاننے کا یہ طریقہ لکھا ہے کہ جو اور گیہوں کے دانوں کی دو پوٹلیاں لو۔ ان کو حاملہ عورت کے پیشاب میں روزانہ تر کرو۔ اگر جو کے دانے پہلے پھوٹیں تو حمل لڑکے کا ہے اور گیہوں پہلے پھوٹے تو لڑکی کا۔

اب جدید سائنس دانوں نے اس مسئلے کو دوسرے طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی۔ بعض ڈاکٹروں کا یہ کہنا ہے کہ جنین لڑکا ہو تو حرکت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ حرکت تیسرے مہینے سے شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن لڑکے کے قلب کی حرکت ذرا سست ہوتی ہے۔ یعنی لڑکے کی حرکتیں ۱۲۱ ہوتی ہیں تو لڑکی کی ۱۴۴۔

دوسرے ڈاکٹروں نے لاشعاعی امتحان سے معلوم کرنا چاہا۔ انھوں نے جنین کی وضع اور کمر کی شکل سے دریافت کرنا چاہا کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ لیکن ان طریقوں میں خطائی صد اتنی زیادہ تھی کہ ان طریقوں کو ترک کر دیا گیا۔

بلجیم کے ایک ماہر جنینیات نے ایک "بے خطا" حل تجویز کیا۔ حمل کے ساتویں مہینے میں اگر اس رطوبت کے چند قطرے حاصل کئے جائیں جس میں جنین گھرا رہتا ہے اور پھر ان قطروں پر چند کیمیائی عمل کئے جائیں تو اگر نیلی رنگت پیدا ہو تو لڑکا ہوگا۔ اگر سرخ ہو جائے تو لڑکی ہوگی ماہر جنینیات کا کہنا ہے کہ ۵۲ عورتوں میں یہ طریقہ صد فی صد کامیاب رہا۔ لیکن اس رطوبت کے قطرے حاصل کرنے میں خطرہ بھی ہے اس لئے مسئلہ اپنی جگہ جالب توجہ رہا۔

اب پیرس کے ایک ڈاکٹر ژان رسمان نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ کو حل کر لیا ہے۔ اور جنین کی جنس دریافت کرنے کا ایک آسان طریقہ حاصل ہو گیا ہے۔

طریقہ یہ ہے کہ حاملہ عورت کا پیشاب پچکاری کے ذریعہ نابالغ نر خرگوش میں داخل کیا جائے سان فرانسسکو کے دو ڈاکٹروں نے دس آزمائشی عورتوں میں اس طریقے کو استعمال کیا۔ ان کی شہادت یہ ہے کہ جب پیشاب نے خرگوشوں کے غدود میں امتلا پیدا کر دیا تو لڑکیاں تولد ہوئیں اور جب خرگوشوں میں کوئی غیر معمولی بات مشاہدے میں نہیں آئی تو ولادت لڑکوں کی ہوئی۔ اس سے ان ڈاکٹروں نے یہ نتیجہ نکالا کہ حمل میں لڑکی ہو تو حاملہ کے پیشاب میں وہ جنسی ہارمون موجود ہوتے ہیں جو خرگوش کے جنسی اعضا میں ایک عمل پیدا کر دیتے ہیں۔ اس طریقہ کی تکمیل کر کے ڈاکٹروں نے ۹۴ فی صد کامیابی حاصل کی۔

شکاگو کے ڈاکٹر گستاد ریپ نے حاملہ عورت کے دیگر افرازات جیسے آنسو، پسینہ، تھوک میں نر ہارمون کا پتہ لگایا۔ ڈاکٹر ریپ نے ڈاکٹر رچرڈسن کے ساتھ کام کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ جنین اگر لڑکا ہو تو وہ اتنے نر ہارمون پیدا کرتا ہے کہ وہ حاملہ کے تھوک میں بھی آ جاتے ہیں۔ لیکن لڑکی ہو تو وہ نر ہارمون نہیں خارج کرتی۔

پس اس لعابی آزمائش کو کام میں لا کر دونوں سائنس دانوں نے ۲۲۱ ولادتوں میں سے ۲۱۸ کی جنسیت صحیح صحیح بتلا دی۔ یہ گویا ۹۸ فیصد کامیابی ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ "اگر حاملہ کو ذیابیطس نہ ہو اور وہ اسپرین جیسی دوائیں نہ استعمال کرے تو ہماری آزمائشیں درست ٹھیریں اور ہم کو ۱۰۰ فی صد کامیابی حاصل ہو۔

اب پیرس کے ڈاکٹر رسمان نے یہی دعوی کیا ہے کہ انھوں نے اس لعابی آزمائش کو مکمل کر لیا ہے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۲ء سے لے کر ختم سال ۱۹۵۳ء تک انھوں نے فرانس میں کوئی ۱،۰۲۰،۰۰۰ عورتوں میں آزمائش کی۔ یہ گویا سالانہ شرح پیدائش کا ۱۲ فی صد ہے۔

ایک دوسرے فرانسیسی کیمیاداں شارل ولبر نے امریکہ میں اپنا مستقر قائم کیا ہے تاکہ ڈاکٹر رسمان کے ایجاد کردہ سادہ لعابی آزمائش کو ترویج کرے۔ ڈاکٹر رسمان نے یہ دعوی کیا ہے کہ انھوں نے وہ اشیاء دریافت کر لی ہیں جو نر جنین کے خارج کردہ ہارمونوں کے

ساتھ حمل کے ایک معین زمانے میں نکلتی ہیں۔ اگر ہارمون موجود ہیں تو ولادت لڑکے کی ہوگی نہ ہوں تو لڑکی کی ہوگی۔ ڈاکٹر دلبر کا کہنا ہے کہ یہ عمل بہت ہی سادہ ہے۔

حمل کو جب چوتھا یا پانچواں مہینہ ہوتا ہے تو ایک صبح حاملہ کو ذریعہ ڈاک ایک چھوٹا سا کاغذی پاپڑ بھیجا جاتا ہے۔ وہ ایک خاص کیمیائی عرق میں بھیگا ہوتا ہے۔ ناشتہ کرتے یا دانت مانجنے سے پہلے وہ اس پاپڑ کو اپنی زبان پر رکھتی ہے اور اپنے لعاب سے اسے تر کر دیتی ہے۔ پھر ایک لفافہ میں اس پاپڑ کو بند کر کے دلبر کے تجربہ خانے بھیج دیتی ہے اور فیس کے پانچ ڈالر بھی ملفوف کر دیتی ہے۔

تجربہ خانے میں اس پاپڑ پر ایک عمل کیا جاتا ہے۔ اگر وہ ارغوانی ہو جائے تو جنین لڑکا ہے۔ اگر بے رنگ رہے تو لڑکی ہے۔ چند دنوں کے بعد اس کو ذریعہ ڈاک اطلاع دے دی جاتی ہے کہ ولادت لڑکے کی ہوگی یا لڑکی کی۔ پھر حاملہ اسی مناسبت سے کپڑے وغیرہ تیار رکھتی ہے۔

دلبر جنسیات کی ضمانت دیتا ہے۔ اگر پیش گوئی غلط نکلے تو فیس واپس کر دی جاتی ہے۔ دلبر کا کہنا یہ ہے کہ ہم صرف ۲ فی صد خطا کرتے ہیں اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ پیدائش جڑواں کی ہو یا پاپڑ زبان پر حمل کے چوتھے مہینہ سے قبل یا پانچویں مہینے کے بعد رکھا گیا ہو۔ اس وقت بھی ہم کو دقت ہوتی ہے جب کہ شوہر صاحب مذاق پر اتر آتے ہیں اور پاپڑ اپنی زبان پر رکھ لیتے ہیں۔

ان تمام نتائج کے باوجود امریکہ کی میڈیکل ایسوسی ایشن نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے لیکن دلبر اس کو اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری آزمائش کو کوئی طبی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یہ تو صرف پر امید والدین کی تسکین کا ایک ذریعہ ہے۔

(ن۔ا۔ع)

تبصرے

نامعلوم انسان از جناب محمد یوسف صاحب کوکن ایم۔ اے وجناب محمد محی الدین صاحب بی۔ اے تقطیع،
کلاں ضخامت ۳۰۸ صفحات ٹائپ جلی اور خوشنما قیمت مجلد پندرہ روپیہ پتہ:- مدراس یونیورسٹی۔

ڈاکٹر الکسس کیرل (Alexis Carrel) جو فرانس کا مشہور سائنسداں ہے اپنے پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا اور اس حیثیت میں اس نے فرانس، امریکہ اور دوسرے ملکوں میں جنگ عظیم اول ودوم میں بڑی شاندار خدمات انجام دیں وہ میڈیسن اور سائنس دونوں کا نامور عالم اور محقق بھی تھا چنانچہ علاج معالجہ کے شغل کے ساتھ وہ میڈیسن اور سائنس ان دونوں پر بڑی مفید اور بلند پایہ تحقیقات بھی کرتا رہا جن کے صلہ میں یورپ اور امریکہ کے مختلف علمی اداروں نے اس کو بیش قدر انعامات اور اعزازات بھی دیئے۔ موصوف نے ۵ نومبر ۱۹۴۴ء کو اپنے ملک فرانس کے شہر پیرس میں وفات پائی۔ "نامعلوم انسان" (Man The unknown) اسی ڈاکٹر الکسس کیرل کی مشہور و معروف کتاب ہے۔ جو سب سے پہلے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی اور ہاتوں ہاتھ نکل گئی۔ اس کے بعد سے اب تک برابر اس کتاب کے نئے ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے انسان اور اس کی زندگی کے مختلف روحانی۔ مادی۔ سماجی اور اخلاقی پہلوؤں پر خالص علمی اور سائنٹفک نقطۂ نظر سے بڑی عجیب وغریب بحث کی ہے۔ اور موجودہ مغربی تمدن کا تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ انسان اگرچہ مادی اعتبار سے ترقی کر رہا ہے لیکن اس کی یہ مادی ترقی اس کے جسمانی۔ اخلاقی۔ روحانی زوال کا بہت بڑا سبب ہے اور اس حیثیت سے انسان بڑی سرعت کے ساتھ تباہی وبربادی کی طرف جا رہا ہے۔ موصوف نے ناقابل انکار وتردید دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ہمارا جدید تمدن غلط مقاصد کی پیروی کر رہا ہے۔ اس تمدن کا جدید طرز فکر۔ اور اس کا پیدا کیا ہوا سماج انسان کو بجائے مسرت کے ہلاکت کی طرف لے جا رہا ہے اس کے

ساتھ ہی موصوف نے ان فطری قوانین کی توضیح کی ہے جن کی پیروی انسان کے لئے بشرطیکہ وہ صنعتی تمدن کی ہلاکت آفرینیوں سے نجات حاصل کرسکے۔ موجب فلاح و بہبود ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف نے جن پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اسلام سے ملتے جلتے ہیں بلکہ حق یہ ہے ان کے ذریعہ اسلامی تعلیمات اور اسلام کے نظام زندگی کی تائید ایک ایسے مؤثر اور سائنٹفک طریقہ پر ہوتی ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ایک انصاف پسند شخص کو خصوصاً اور مشرقی عادات و اطوار کی عموماً صداقت و حقانیت کا اعتراف کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی بنا پر جس طرح اٹھارہویں صدی میں روسو کی کتاب معاہدۂ عمرانی نے فکر و خیال کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا تھا ابھی حال میں اس کتاب نے یورپ اور امریکہ کے ارباب فکر و نظر کی دنیا میں بھونچال پیدا کردیا ہے ہم آئندہ کسی اشاعت میں اس کتاب کے بعض نہایت اہم چیدہ چیدہ اقتباسات پیش کریں گے، یہی بلند پایہ اور انقلاب آفریں کتاب ہے جس کا ترجمہ جناب محمد یوسف اور جناب محی الدین نے کیا ہے اصل کتاب تو علمی۔ تحقیقی اور فکری اعتبار سے جس مرتبہ و مقام کی ہے وہ تو ہے ہی۔ لیکن لائق مترجمین نے بھی کمال کر دکھایا ہے۔ جنوبی ہند میں بیٹھ کر اس قدر شستہ و رفتہ اور شگفتہ اردو زبان میں اتنی ضخیم اور سائنٹفک کتاب کا ترجمہ کردینا زبان اور اس کے اسالیب بیان پر قدرت کی روشن دلیل ہے۔ پھر خود مدراس یونیورسٹی بھی کچھ کم قابل داد نہیں ہے جس نے عہد حاضر کی ایک بلند پایہ علمی کتاب کو اردو کے جامہ میں ملبوس کرا کے بصرف زر کثیر بڑے اہتمام کے ساتھ اس کو شائع کیا۔ یونیورسٹی اور لائق مترجمین دونوں ارباب علم اور قدر دانان اردو کی طرف سے اس مبارک کام کے لئے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

ایک نادر روزنامچہ از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی تقطیع خورد۔ ضخامت ۲۰۷ صفحات کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے پتہ:- ادارۂ فروغ اردو۔ ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ۔

ضلع ہردوئی میں ایک بہت پرانا قصبہ سندیلہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں مولوی سید مظہر علی نام کے ایک بزرگ تھے جنہوں نے عربی۔ فارسی اور اس زمانہ کے مطابق انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور معمولی سی حالت سے ترقی کرکے قصبہ کے اعیان و امرا میں شامل ہوگئے۔ موصوف

۱۸۳۹ء کو پیدا ہوئے اور دسمبر ۱۹۱۱ء کو انتقال کیا۔ انھوں نے اپنا ایک روزنامچہ بڑی پابندی اور اہتمام کے ساتھ لکھنا شروع کیا تھا جس میں وہ دنیا بھر کے حالات و واقعات جو انھیں معلوم ہوتے رہتے تھے، ان کا تذکرہ کرتے تھے اور ان پر اپنی رائے درج کرتے تھے۔ مرحوم یہ روزنامچہ ۱۸۶۴ء سے اپنے یوم وفات تک یعنی کامل پینتالیس سال بلاناغہ لکھتے رہے، چنانچہ یہ روزنامچہ جو اب تک مرحوم کے خاندان میں محفوظ ہے اٹھارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جن کے فلسکیپ سائز کے صفحات کی تعداد آٹھ ہزار ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی روزنامچہ کا خلاصہ ہے، جو پانچ ابواب پر تقسیم ہے پہلا باب "واقعات ہند"۔ دوسرا "ریاستیں اور تعلقے"۔ تیسرا "واقعات بیرون ہند"۔ تیسرا اور پانچواں "ذاتی اور مقامی حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخی اعتبار سے یہ روزنامچہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ روزنامچہ نویس کسی خارجی دباؤ یا اثر کے ماتحت کوئی واقعہ توڑ مروڑ کر نہیں لکھتا۔ بلکہ جیسا کچھ دیکھتا، جو سنتا اور محسوس کرتا ہے بعینہ اسی کو درج کر دیتا ہے۔ لائق مرتب نے شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ جس میں سندیلہ کی تاریخ، مولوی سید مظہر علی مرحوم کے حالات و سوانح اور روزنامچہ کی خصوصیات پر شگفتہ اور دلنشین پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے۔ اُمید ہے ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے محظوظ اور شادکام ہونگے۔

بشریٰ — از مولانا سید شاہ محمد عثمان غنی تقطیع خورد ضخامت ۸۰ صفحات، کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۱۲ر پتہ: غنی بکڈپو۔ دریاپور پٹنہ ۴

یہ سیرت مقدسہ پر چھوٹا سا رسالہ ہے جو بچوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے زبان بہت سہل اور دلنشین ہے اور واقعات کی ترتیب اخلاق آموز ہے۔ اس کو بچوں اور بچیوں کے نصاب تعلیم میں شامل کرنا مفید ہوگا۔

معیار کا تنقید نمبر — مرتبہ نجم الاسلام صاحب تقطیع کلاں ضخامت ۱۶۹ صفحات۔ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ/ پتہ: دفتر ماہنامہ معیار۔ خندق اسٹریٹ میرٹھ

یہ میرٹھ کے ماہنامہ ادبی رسالہ معیار کا خاص نمبر ہے، جس میں کچھ مضامین ادب اور تنقید

کے جدید نظریوں اوران کے تجزیہ وتحلیل سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض مضامین ادب اور اسلام سے متعلق ہیں۔ مل ملاکر سب مضامین کی تعداد سولہ ہے۔ دوتین مضامین کو چھوڑکر اکثر و بیشتر مضامین بڑے سنجیدہ، مدلل اور بصیرت افروز ہیں اس نمبر کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے متعدد مقالات "تعمیر پسند ادب" سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں "ترقی پسند ادب" پر کڑی تنقید کرکے اس کی خامیوں اور بے راہ رویوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور اسلام کے نظریۂ حیات کی روشنی میں ادبی قدروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح کی کوشش ہمارے ادب کو ایک صحیح ڈگر پر بھی ڈال دیگی اور اس کو ایک خاص قسم کی توانائی اور صحت بھی بخشیگی۔ ہمارے نوجوان ادیبوں میں اس جدید طرز فکر کا نشوونما ادب کے لیے بھی نیک فال ہے اور اسلام کے لیے بھی۔ ارباب ذوق کو اس نمبر کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

کتابت، طباعت دیدہ زیب قیمت سالانہ سات روپیے۔

المحمود مقام اشاعت نمبر ۱۸۱ گلی نمبر ۳۲۔ رنگون (برما)

یہ ماہنامہ جامعہ عربیہ دارالعلوم تانوے رنگون کے مقاصد کا ترجمان ہے اور اسی ادارے کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے۔ "المحمود" اب سے چودہ سال پہلے ۳۹ء میں نکلا تھا مگر ۴۱ء کے آخر میں جب جنوب مشرقی ایشیا میں ہنگامۂ کارزار گرم ہوا تو المحمود بھی اس کی لپیٹ میں آگیا اور اس کی اشاعت بند ہوگئی

مفتی برما اور جامعۂ عربیہ دارالعلوم کی روح رواں مولانا محمود داؤد یوسف کی ہمت قابل داد ہے، جنھوں نے نہایت صبر آزما اور نازک حالات میں ملت کی خدمت کا بیڑا اٹھا اور جامعہ دارالعلوم کے ساتھ المحمود کو بھی دوبارہ جاری کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ برما جیسے ملک میں مولانا محمود داؤد اور اُن کے خاندان کا وجود ہر حیثیت سے نعمتِ باردہ ہے، موصوف نے اپنے شہرۂ آفاق اور صاحبِ خیر والد کا نام خوب روشن کیاہے اور دل وجان سے علم و مذہب کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جامعہ عربیہ دارالعلوم اور دوسرے مفید اداروں کا قیام ان کے

اس جذبۂ خدمت کے لئے شاہد عدل ہے جہاں تک برما کا تعلق ہے اس کے لحاظ سے ماہنامہ المحمود ایک صاف، ستھرا اور نکھرا ایا پرچہ ہے، جس میں تمام مضامین عام فہم طرز میں لکھے جاتے ہیں اوران مضامین کا تنوع بھی خاصا دلچسپ ہوتا ہے اس وقت رسالے کے دو شمارے ہمارے سامنے ہیں جن میں تاریخی مضامین تو بہت ہی ہیں، عام مذہبی، ادبی اور معلوماتی مضمونوں کی بھی کمی نہیں ہے۔

رسالے کے باقاعدہ نگراں مولوی ابراہیم احمد صاحب مظاہری اور مدیر مولوی عبدالولی صاحب مظاہری اور شریک مدیر مولوی عبدالحمید صاحب مظاہری، مظاہری، مظاہر العلوم سہارنپور کی طرف نسبت ہے ان سب حضرات نے اسی درسگاہ میں تعلیم پائی ہے۔

ہم المحمود جیسے ماہنامے کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اوراس کی زندگی اور ترقی کے خواہاں ہیں۔ (ح)

بُرھَان

جلد ۳۵ شمارہ ۴

اکتوبر ۱۹۵۵ء مطابق صفر المظفر ۱۳۷۵ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اچھا ہی ہوا کہ اتر پردیش میں ذبیحۂ گاؤ قانوناً ممنوع ہو گیا۔ البتہ رنج اس کا ہے کہ جب یہ ہونا ہی تھا تو پہلے ہوتا تاکہ فریب خوردگانِ عنوانِ وفا کو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے جن جانی و مالی نقصانات سے دوچار ہونا پڑا ہے وہ پیش نہ آتے۔

میں بھی گھٹ گھٹ کے نہ مرتا جو زباں بدلے   خنجر اک تیز سا ہوتا مرے خونخوار کے پاس

اگر کوئی آپ سے سوال کرے کہ لندن میں کون سی زبان بولی جاتی ہے۔ اور پیرس کے لوگ کون سی زبان میں گفتگو کرتے ہیں؟ تو آپ اس کا جواب یہی دیں گے تاکہ لندن میں انگریزی اور پیرس میں فرنچ بولی جاتی ہے۔ اگر اسی طرح چند سال پہلے آپ سے یہ دریافت کیا جاتا کہ لکھنؤ اور دلی کی زبان کیا ہے؟ تو کیا آپ کو یا کسی اور کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ کہنے میں تامل ہوتا کہ ان دونوں کی زبان اردو ہے؟ ہرگز نہیں۔ لیکن انقلاب اس کو کہتے ہیں کہ چند برسوں کے الٹ پھیر میں ہی جو بات کل تک روزِ روشن کی طرح صاف اور واضح تھی اور جو دو اور دو چار کی طرح بدیہی تھی۔ وہ آج اس قدر پیچیدہ اور ناقابل فہم ہو گئی ہے کہ اب اس پر لاکھ دلائل لائیے۔ ہزار ثبوت پیش کیجئے مگر وہ کسی کی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ یہ سمجھ میں نہ آنا اس لئے نہیں ہے کہ اردو زبان کچھ بدل گئی یا وہ کچھ سے کچھ بن گئی ہے۔ وہ آج بھی وہی ہے جو پریم چند، رتن ناتھ سرشار دیا شنکر اور بالمکند کے زمانہ میں تھی۔ اس میں وہی معصومیت کے ساتھ طرحداری اور سادگی کے ساتھ پرکاری اب بھی ہے جو جوالا پرشاد۔ ہرگوپال۔ اور دیا نرائن کے عہد میں تھی اور جس کی وجہ سے گھروں کے اندر مائیں اپنے بچوں کو لوریاں اسی زبان میں دیتی تھیں۔ دلی اور لکھنؤ کی گلیوں میں بچے اسی زبان میں گیت گاتے پھرتے تھے۔ ہندو اور مسلمان۔ امیر اور غریب عالم

جاہل۔ سرکاری اور غیر سرکاری۔ عورت اور مرد۔ بوڑھے اور جوان سب اسی زبان میں بولتے گنگناتے اور گاتے تھے۔ البتہ ہاں اس سوال کی پیچیدگی کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا مخاطب وہ شخص ہے جس نے نہ سمجھنے کی قسم کھالی ہے اور جس نے عہد کر لیا ہے کہ آپ جو کچھ کہیں گے اس پر وہ نہیں مزور کہے گا۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو پھر آپ کی بات خواہ کیسی ہی گفتنی ہو آپ اس کے شنیدنی ہونے کی توقع کیسے کر سکتے ہیں ؟

لکھنؤ کی نسبت تو آپ نے سن ہی لیا ہوگا کہ ایک موقع پر کہنے والے نے اپنی ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ کہہ دیا کہ وہاں اُردو بولی ہی نہیں جاتی ہے۔ اب دلی کی باری ہے وہاں کی اسمبلی میں اس زبان کا معاملہ درپیش ہے۔ اس کا حشر کیا ہوگا۔ وہ بھی کسی پر مخفی نہیں ہے ممکن ہے کسی کو بعد میں اس کا پچھتاوا ہو کہ

کیا بلا عرضِ مدعا کر کے بات بھی کھوئی التجا کر کے

لیکن اُردو کے قدر دانوں کو اس سے دل شکستہ اور مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ مدعا طلبی کی راہ میں کبھی ایسی منزل بھی آتی ہے جب کہ محض عرضِ مدعا کر گذرنا ہی حصولِ مدعا سے زیادہ لذت بخشِ کام و دہن ہوتا ہے اور ناکامِ تمنا اپنی ناکامی پر پشیمان و دل گرفتہ نہیں ہوتا بلکہ وہ صاف کہتا ہے ؎

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں لیکن اسے جتا تو دیا جان تو گیا

پارلیمنٹ میں آج کل ہندو وراثت کا بل پیش ہے جس کو پارلیمنٹ کی مقرر کردہ ایک مشترکہ کمیٹی نے تیار کیا ہے۔ اس بل میں تجویز کیا گیا ہے کہ ایک مرد کے مرنے پر اس کی بیٹی۔ بیٹے، ماں اور اس کی بیوہ ان سب کو برابر برابر حصہ دیا جائے اس سلسلہ میں انگریزی کے اخبار اسٹیٹسمین مورخہ ۲ر اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ایک ہندو فاضل کا خط چھپا ہے جس میں وہ لکھتا ہے۔

اگر بیوہ کو برابر کا حصّہ ملتا ہے تو اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ لیکن کیا یہ مناسب ہے کہ کوئی عورت اور اس کا بھائی دونوں ایک دوسرے کے برابر حصّہ پائیں اگر ایسا ہوا تو ایک ہندو کی جائداد چند ہی روز میں ختم ہو جائے گی۔ بہن اور بھائی دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے۔ اور تقسیمِ جائداد میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ کیوں کہ ایک عورت کو تین طرف سے حقِ وراثت پہنچتا ہے۔ ایک حق بحیثیت بیٹی کے۔ دوسرا حق بحیثیت بیوی کے اور تیسرا حق بحیثیت ماں کے۔ برخلاف مرد کے کہ اس کے لئے صرف ایک ہی حق ہے۔ تو پھر کیا اس کے باوجود عورت اور مرد دونوں کا حقِ وراثت برابر ہو سکتا ہے ؟

دنیا کے تمام مذاہب و قوانین و دساتیر میں یہ شرف صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے عورت کا حقِ وراثت تسلیم کیا ہے۔ عہدِ جدید میں جہاں کہیں عورت کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے وہ بلاشبہ اسلام کے ہی خوانِ کرم کی زلہ ربائی کا نتیجہ ہے۔ لیکن چوں کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس بنا پر اس کی ہر تعلیم بادن تولہ پاؤ رتی کی مصداق ہے کہ نہ اس میں کوئی کمی ہو سکتی ہے اور نہ بیشی اس لئے کوئی قوم جب کبھی اسلام کے کسی قانون کو اپناتے ہوتے اس میں اپنی طرف سے کانٹ چھانٹ کرے گی اس کا انجام یہ ہی ہو گا کہ قانون کا مقصد خاطر خواہ طریقہ پر حاصل نہیں ہو سکے گا، چنانچہ وراثت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے اسلام عورت کا حقِ وراثت تسلیم کرتا ہے مگر ساتھ ہی اس کا اعلان یہ بھی ہے کہ " وللذکر مثل حظ الانثیین " یعنی مرد کو دوہرا حصّہ ملنا چاہئے۔ کیا عجیب بات ہے کہ آج ایک ہندو فاضل قرآن مجید کے اس حکم کی تصدیق میں بعینہٖ وہی بات کہہ رہا ہے جو اب سے کم و بیش سوا دو سو سال پہلے حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی رحمۃ اللہ علیہ قرآن کے اسی حکم کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرما گئے ہیں۔ " فبای حدیث بعدہٗ یومنون "؟

نقشہ شام

(ماخوذ از تاریخ الاسلام السیاسی، تصنیف ڈاکٹر حسن ابراہیم)
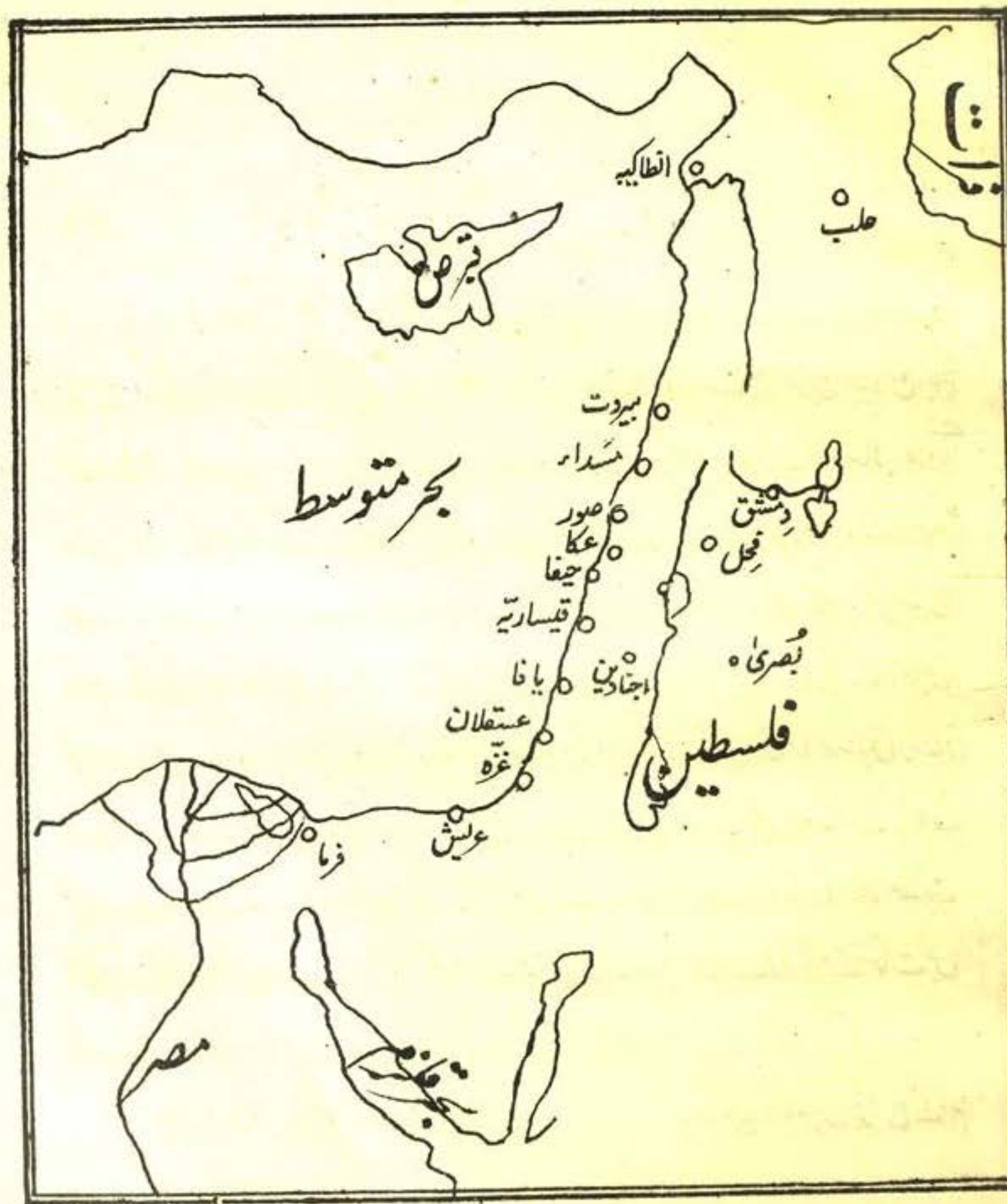
حضرت عمر کے سرکاری خطوط

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق
(استاذ ادبیات عربی - دہلی یونیورسٹی)

(۴)

۳۶- ابو عبیدہ بن جراح کے نام

[ساحل شام کے اہم ترین شہر قیساریہ کی فتح عرب مورخوں نے ان تاریخوں میں بتائی ہے: سنہ ۱۶ھ (بقول سیف بن عمر، طبری ۴/ ۱۵۶) سنہ ۱۸ھ، سنہ ۱۹ھ اور سنہ ۲۰ھ (فتوح البلدان، بلاذری مصر، ص ۱۴۷، ۱۴۹)، فتوح الشام واقدی، مصر، ۲/ ۲۰ نے فتح کا مہینہ رجب اور سال ۱۹ دیا ہے بلاذری کی رائے بھی سنہ ۱۹ھ کے حق میں ہے۔ ذیل کا خط بقول واقدی ابو عبیدہ کو لکھا گیا اور ابو عبیدہ جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں اور جیسا کہ مشہور ہے سنہ ۱۸ھ کے طاعون میں وفات پا چکے تھے، لیکن فتوح شام واقدی کی رو سے وہ سنہ ۱۹ھ اور اس کے بعد کئی سال تک زندہ رہتے ہیں، واقدی کے مطابق عمرو بن عاص نے مصر پر ابو عبیدہ کے زیر حکم لشکر کشی کی تھی، بقول واقدی ذیل کے خط کا سیاق وسباق یہ ہے کہ ابو عبیدہ نے سنہ ۱۹ھ میں فتح قیساریہ کی خوش خبری جس شخص کی معرفت بھیجی، وہ نہایت پر تکلف کپڑوں میں ملبوس تھا جو رومی مفتوحین کے مال غنیمت سے مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے، حضرت عمر کو یہ لباس دیکھ کر افسوس ہوا، ان کے پاس یہ خبر بھی پہنچی کہ شام کے عرب زندگی کے تنعمات میں پڑتے جا رہے ہیں۔]

بسم اللہ الرحمن الرحیم، عبد اللہ عمر بن خطاب کی طرف سے ابو عبیدہ عامر بن جراح کے نام،

میں اس خدا کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اس کے نبی محمد پر درود بھیجتا ہوں" مجھے اس خبر سے مسرت ہوئی کہ خدا نے مسلمانوں کو فتح عظیم عنایت کی اور قیصر کے وہ خزانے عطا کئے جن کا رسول اللہ نے وعدہ کیا تھا، عنقریب کسریٰ کے خزانے بھی مسلمانوں کے قبضہ میں آجائیں گے، خدا کا ان عنایات کے لئے بہت بہت ممنون ہوں۔

(۲) مجھے معلوم ہوا ہے کہ بدو عرب (غالباً ان سے مراد وہ عرب ہیں جو فتوحات کے بعد بعض رومی علاقوں میں آباد ہو گئے تھے) لذائذِ دنیوی کے شیفتہ ہو گئے ہیں، دنیا نے ان کے سامنے گرفتاری کا جال بچھا دیا ہے اور انھوں نے دنیوی فریب کا دامن تھام لیا ہے، جنّت کے لطف اور لذت کی طرف سے نظر ہٹالی ہے۔ ساٹن اور ریشم کے کپڑوں میں اترا کر چلتے ہیں، گیہوں کی روٹی اور حلوہ کے عادی ہو گئے ہیں، تن و زبان کی لذتوں نے آخرت کی طرف سے ان کو غافل کر دیا ہے، ابن جراح! مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ نماز کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور مفروضہ نمازوں کو چھوڑتے جا رہے ہیں، ان عربوں کی سرکوبی کے لئے فوراً رسالے بھیجو، ان کی بے راہ روی پر چشم پوشی سے نہیں بلکہ سختی سے کام لو ورنہ خود تم کو ان کے ہاتھوں نقصان پہنچے گا۔ ان میں سے اگر کوئی اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کرے جو اسلام کی طرف سے اس پر عائد ہوتا ہے تو اس کو حدِ شرعی لگاؤ۔

(۳) تم کو یاد رہے کہ تم حاکم ہو اور ہر حاکم خدا کے سامنے رعیت کی بے راہ روی کے لئے جواب دہ ہے۔ خدا نے کہا ہے: اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ، وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ، رسول اللہ نے تمہارے بارے میں فرمایا ہے: "ابوعبیدہ اس قوم کے امین ہیں"۔ پس امانت کا پورا پورا حق ادا کرو۔ اور جو نماز نہ پڑھے اس کو سزا دو۔

(۴) رسول اللہ اور ہم باتیں کرتے ہوتے کہ نماز کا وقت آجاتا، تب وہ اور ہم نماز میں ایسے مشغول ہو جاتے گویا نہ وہ ہم کو جانتے ہوں نہ ہم ان کو۔

(۶) رسول اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسجدوں کو اپنا گھر قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ مسجدوں میں عبادت کرتے ہیں وہ میرے مہمان ہیں اور بڑا خوش نصیب ہے وہ شخص جو گھر پر پاک

وصاف ہو کر مجھ سے ملنے آئے، ایسے شخص کی عزت میزبان پر لازم ہے۔

(۷) رسول اللہ نے فرمایا ہے: سارے فرائض خدا نے میرے لئے صرف دنیا تک فرض کئے ہیں مگر نماز ایسا فرض ہے جس کو آسمان پر ادا کرنے کی بھی تاکید ہے۔

(۸) میرا خط پا کر عمرو بن عاص کو حکم دینا کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ مصر پر فوج کشی کریں، عامر بن ربیعہ اور دوسرے مشایخ صحابہ کو پیش پیش رکھیں اور اُن کے مشورہ کے مطابق عمل کریں۔

(۹) اس کے علاوہ کچھ فوج جو آسانی سے الگ کر سکو ربیعہ اور محمدؐ بن صالح کے علاقہ کی طرف بھیجو، خدا سے دعا ہے کہ تمہاری مدد فرمائے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ[1]

۳۷۔ ابو عُبیدہ بن جرّاح کے نام

[فتوح الشام واقدی میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے ذیل کا خط شام اور مصر کی فتح کے بعد لکھا۔ مصر (فسطاط) کی فتح اکثر عرب مورخوں کی رائے میں ۲۰ھ یا اس کے بعد واقع ہوئی اور جیسا کہ جمہور کا خیال ہے ابو عبیدہ ۱۸ھ کے طاعون عمواس میں مر چکے تھے، اس لئے اس رائے کو نظر میں رکھتے ہوئے فتح مصر یا اس کے بعد ابو عبیدہ کا زندہ ہونا صراحتًہ محال ہے۔ لیکن ایک مورخ سیف بن عمر نے مصر کی فتح ۱۶ھ میں بتائی ہے۔[2] اس کی رو سے بلاشبہ مصر کی فتح ابو عبیدہ کی زندگی میں واقع ہوئی ہوگی۔]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ عبداللہ عمر امیر المؤمنین کی طرف سے عامر بن جراح کو سلام علیک، میں اس معبود کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اس کے نبی محمد پر درود بھیجتا ہوں۔

(۲) تم نے کفار کو قتل کرنے میں بڑی تن دہی سے کام لیا اور خدائے جبار کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کی اور ایسے ایسے عمدہ کام کئے جن کا انعام روز جزا میں تم کو ملے گا۔ فرائض کی انجام

(۱؎ فتوح الشام واقدی، مصر، ۲/۲۱) (۲؎ طبری مصر، ۴/۲۱۶)

دہی میں ہم نے کبھی تم کو تساہل کرتے نہیں دیکھا، تم اپنے بنی کے جادہ پر بوجہ احسن گام زن رہے اور اسلام کی سربلندی کے لئے جیسا چاہئے جدو جہد کی، خدا تمہاری اور ہماری کوششوں کو قبول فرمائے اور ہماری اور تمہاری لغزشوں کو معاف کرے۔

(۳) میرا یہ خط پاکر عیاض بن غنم کی سرکردگی میں ایک فوج ربیعہ اور بکر کے علاقہ (میسوپوٹامیہ) کو روانہ کرو، مجھے خدائے بزرگ و برتر سے امید ہے کہ وہ یہ علاقے عیاض بن غنم کے ہاتھوں فتح کرائے گا۔

(۴) میں عیاض کو تاکید کرتا ہوں کہ خدا سے ڈریں اور اس کی خوشنودی کے لئے ہر ممکن کوشش اور قربانی سے دریغ نہ کریں، جہاد کے معاملہ میں قطعاً کوتاہی نہ کریں، اور سچے مجاہدوں کے نقش قدم پر چلتے رہیں اور خدا کے اس حکم کو جو اُس نے سید المرسلین پر نازل فرمایا سر آنکھوں پر رکھیں:

یَا اَیُّھَا النبی جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَالسلام علیک وعلی جمیع المسلمین وبرکاتہ۔[1]

۳۸۔ عیاض بن غنم کے نام

[عیاض شامی افواج کے ایک بڑے کمانڈر اور ابو عبیدہ کے خاص مشیروں میں تھے۔ بے نفسی اور ایثار ان کی نمایاں خصوصیت تھی۔ ذیل کا خط جزیرہ (دیارِ بکر و ربیعہ یا میسوپوٹامیہ) پر فوج کشی کے بارے میں ہے اس کی فتح بقول واقدی ۱۸ھ میں، بقول ابن اسحاق ۱۹ھ میں اور بقول سیف بن عمر ۱۶ھ میں ہوئی۔[2]]

عبداللہ عمر امیر المؤمنین کی طرف سے عیاض بن غنم کو سلام علیک۔ ہم نے ہمیشہ تم کو مسلمانوں کے مصالح اور بہبودی کے لئے سرگرم عمل پایا ہے اور تم ہمیشہ مسلمانوں کو عملِ صالح کی ترغیب دیتے رہے ہو، تمہارے اسلاف کا بھی یہی ستودہ طریقہ تھا، تم کو دُنیا اور عقبیٰ میں انعامِ ایزدی کی بشارت دیتا ہوں۔ تمہارا ظاہر و باطن جب ایسا ہے تو مجھے قوی امید ہے کہ دین و دنیا میں ہمیشہ کامراں رہو گے اور تمہارا ذکر خیر باقی رہے گا۔

---

[1] (فتوح الشام واقدی، مصر، ۲/ ۵۷) [2] (طبری، مصر، ۴/ ۲۲۵)

(۲) مجھے خبر ملی ہے کہ رومی سواروں نے جزیرہ میں بڑی فوجیں جمع کی ہیں، جن کی اطلاع تم کو بھی ہوئی ہوگی - میں چاہتا ہوں کہ ان کے مقابلے میں ایک فوج بھیجی جائے جو ان کو نکال باہر کرے، اس فوج کا سالار بہادر، دانا، اور خدا ترس آدمی ہونا چاہیئے، اس معاملہ پر میں نے خود غور کیا اور ساتھی صحابہ سے مشورہ کیا، ہم سب کی متفقہ رائے ہے کہ اس مہم کو تمہارے سپرد کیا جائے۔

(۳) اس خط کو پڑھ کر یزید بن ابی سفیان (کمانڈران چیف افواج شام) سے اس قدر فوج جو تمہارے مقصد کے لئے کافی ہو لے لو، اور جزیرہ کی طرف روانہ ہو جاؤ -

(۴) اپنا شعار "خوف خدا" کو بناؤ اور اس مالک سے ڈرتے رہو جو تمہارے ظاہر و باطن کا حال ایک سا جانتا ہے -

(۵) تمہارے سامنے جو مسائل اور قضیئے آئیں ان کو قرآن کی رو سے طے کرو اور اگر قرآن میں ان کا حل نہ ملے تو سنت رسول اللہ اور ابوبکر کی طرف رجوع کرو -

(۶) دشمن کی کثرت اور اپنی قلت سے دل تنگ نہ ہو اسلامی فوج بہت سے معرکوں میں دشمن سے کم رہی ہے مگر فتح اسی کو نصیب ہوئی -

(۷) تم کو معلوم ہے کہ رسول اللہ نے جنگ خندق کے موقع پر ہم سے کہا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب کسریٰ اور قیصر کے ملک تمہارے قبضہ میں ہوں گے اور ان کی دولت سے تم بہرہ ور ہو گے، تم نے دیکھ لیا عیاض کہ خدا نے رسول اللہ کی پیش گوئی سچ کر دکھائی اور ہم کو کسریٰ اور قیصر کے ملکوں پر تصرف عطا کیا، کفار مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر و مغلوب ہوئے، سب نے ہماری بالادستی تسلیم کی اور جزیہ دینا منظور کیا، قیصر روم ہرقل شام سے ڈر کر قسطنطنیہ بھاگ گیا ہے - یہ سب خدا کی عنایت اور کرم کا نتیجہ ہے - اور ہم پر اس کا شکر بجالانا واجب ہے -

(۸) میں نے یزید بن ابی سفیان کو خط لکھا ہے کہ تم کو جزیرہ کی سرزمین میں رومی افواج سے نمٹنے کے لئے جس قدر فوج کی ضرورت ہے تمہارے ساتھ بھیج دیں[1]

---

[1] (فتوح اعثم کوفی صفحہ ۵۲)

۳۹- عیاض بن غنم کے نام

[سلہ میں جزیرہ پہنچ کر عیاض نے سب سے پہلے رَقّہ کا قلعہ بند اور اہم شہر بذریعہ صلح فتح کیا، اس کے بعد ایک دوسرے اہم شہر رُہا پر چڑھائی کی اور اس کو بھی بذریعہ صلح قبضہ کیا۔ اگلی مہم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ شام سے دو ہزار سواروں کی کمک آگئی، اس کے لیڈر بُسر بن ابی ارطاۃ تھے، انھوں نے عیاض سے اپنے فوجیوں کے لئے اس مال غنیمت سے حصہ طلب کیا جو رَقّہ اور رُہا کی چڑھائی کے دوران میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا، عیاض نے کہا کہ دونوں شہر تمہارے آنے سے پہلے فتح ہو چکے ہیں اور مال غنیمت بھی تقسیم ہو چکا، تم نے ان کی فتح کے لئے کوئی قربانی نہیں کی اس لئے مال غنیمت میں تمہارا کوئی حق نہیں ہے، بُسر کو یہ بات پسند نہ آئی، اور انھوں نے برہم ہو کر عیاض سے گفتگو کی، عیاض نے کہا کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے، تم شام واپس جا سکتے ہو اور چاہو تو یہیں ٹھہرے رہو۔ بُسر غصہ ہو کر شام چلے گئے اور یزید بن ابی سفیان سے جا کر شکایت کی، یزید نے شکایتی خط حضرت عمر کو لکھا اور انھوں نے ذیل کا خط تحقیق حال کے لئے عیاض کو رقم فرمایا۔]

"واضح ہو کہ یزید بن ابی سفیان نے بُسر بن ابی ارطاۃ کی سرکردگی میں ایک فوج شام سے تمہاری مدد کے لئے بھیجی، وہ فوج تم نے لوٹا دی۔

(۲) اس فوج کے بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ تمہارے کام آئے، تمہاری عسکری قوت میں اضافہ ہو اور تمہارے دشمن یہ جان کر کہ تمہارے پاس برابر کمک آرہی ہے دل شکستہ ہوں اور ہراساں ہو کر جلد تمہارے مطیع و منقاد ہو جائیں۔

(۳) میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کمک تم نے کیوں لوٹا دی، اس خط کو پڑھ کر حقیقت حال سے مطلع کرو۔ والسلام[1]

---

[1] (فتوح اعثم کوفی ص۵۶)

۴۰- عیاض بن غنم کے نام

[مرکز کے نوشتہ بالا خط کے جواب میں عیاض نے لکھا: رقہ اور رہا دونوں بسر کے پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کے قبضہ میں آچکے تھے اور جو سامان ملا تھا وہ بھی تقسیم ہو چکا تھا، بسر نے جب حصہ مانگا تو میں نے کہا کہ یہ دونوں مقام تمہاری آمد سے پہلے اور تمہاری مدد کے بغیر فتح ہوئے ہیں، اس لئے مال غنیمت میں تمہارا حق نہیں ہے، تمہاری مدد سے جو مال غنیمت ملے گا اس میں تم کو شریک کیا جائے گا، بسر ناراض ہو گئے، میں ڈرا کہیں مخالفت پر آمادہ نہ ہو جائیں یا فوج میں پھوٹ پڑ جائے جس سے دشمن کا حوصلہ بڑھے اور مہموں کی جلد تکمیل میں دیر ہو، میں ان کی مدد سے بھی بے نیاز تھا، اس لئے میں نے ان سے معذرت چاہی اور گذارش کی کہ شام سے واپس چلے جائیں۔ حضرت عمر کو عیاض کی یہ "صفائی" بہت پسند آئی اور انھوں نے ان کے تدبر کو خوب سراہا اور ذیل کا خط لکھا۔]

"تمہارا خط ملا، ان اسباب کا علم ہوا جن کی بنا پر تم نے بسر بن ابی ارطاۃ اور ان کی فوج کو شام لوٹا دیا، اطمینان ہوا کہ جو قدم تم نے اٹھایا وہ صحیح تھا اور جو روش تم نے اختیار کی معاملہ فہمی پر مبنی تھی، خدائے بزرگ اسلام و مسلمانوں کی طرف سے تم کو جزائے خیر دے۔

(۲) مسلمانانِ مدینہ کی خدا سے دعا ہے کہ جب تک "عمر" زندہ ہے تم کو سرکاری منصب پر بحال رکھے، اور جب اس کو موت آئے اور تم ہنوز زندہ ہو، تو وہ اپنے جانشین خلیفہ کو وصیت کرے کہ سرکاری منصب پر تم کو برقرار رکھے اور جب تک تم زندہ رہو تم کو معزول نہ کرے۔

(۳) ہر طرح خوش دل رہو، اور فوجی مہموں کی سربراہ کاری میں جیسا کہ تاکید ہے ہر ممکن کوشش سے کام لو، والسلام۔"

۴۱- عیاض بن غنم کے نام

[فتح جزیرہ کے بعد]

"عبداللہ عمر امیر المؤمنین کی طرف سے عیاض بن غنم کو سلام علیک - اس خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے جزیرہ کا صوبہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح کرایا اور ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدلا، اب مجھے ان کی تنگ دستی یا افلاس کا ڈر نہیں ہے، بلکہ ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں مغرور ہو کر وہ تباہ نہ ہو جائیں -

(۲) تم نے جزیرہ کی مہم کو جس بلیغ کوشش اور خوش سیرتی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا اس پر خدا تم کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے گا -

(۳) اس خط کے مضمون سے واقف ہو کر فوج کے ایک لائق افسر کو جس کے قول اور فعل پر تم کو اعتماد ہو جزیرہ میں اپنا جانشین مقرر کر دو اور خود شام واپس چلے جاؤ - (شام کے گورنر) یزید بن ابی سفیان کی طبیعت ناساز ہے اور تمہارے وہاں پہنچنے سے پہلے اگر ان کا انتقال ہو گیا تو وہ ملک ضائع ہو جائے گا اور مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جائے گا، اس لئے جتنی جلد ممکن ہو سکے جزیرہ سے چل دو"[1]

۴۲- معاویہ بن ابی سفیان کے نام

[عیاض جزیرہ کے محاذ سے لوٹ کر ابھی اپنے ہیڈ کوارٹر حمص (شام) پہنچے تھے کہ بیمار ہو کر راہی ملک بقا ہوئے - یزید بن ابی سفیان پہلے سے دمشق (ہیڈ کوارٹر) میں علیل تھے چند روز بعد وہ بھی چل بسے، فتوح البلدان بلاذری، مصر، میں ان کی موت ۱۸ھ کے اواخر میں بتائی گئی ہے - ان کے بھائی معاویہ شروع سے شام کے مورچہ پر تھے، اور اپنی محنت اور معاملہ فہمی کی بدولت برابر ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے، یزید کی وفات کے وقت وہ قیساریہ فتح کر چکے تھے - حضرت عمر نے ان کی کاردانی اور کارگذاری سے متاثر ہو کر یزید کے بعد ان کو شامی افواج کا کمانڈر ان چیف مقرر کیا[2] اس حیثیت سے انھوں نے مرکز کے زیر ہدایت ان

[1] فتوح اعثم ص۲۱۶ [2] (فتوح البلدان، بلاذری، مصر ص۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹ و طبری، مصر ۴/۲۰۲)

ساحلی شہروں کو زیرنگیں کیا جو ہنوز رومی تصرف میں تھے۔]

"تم کو معلوم ہو کہ خدا تعالیٰ نے اسلام کو سربلند اور معزز کیا، اور مشرکوں کو خوار کر کے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ پیغمبر خدا نے اپنی اُمت سے شام اور دوسرے ملکوں کی فتح کی جو پیش گوئی کی تھی اور جباروں کے خزانوں اور مال و متاع کے حصول کی جو بشارت دی تھی وہ پوری ہوئی۔

(۲) ان فتوحات میں خاص طور پر قیساریّہ کو اہمیت حاصل ہے جس کی نظیر مضبوطی اور قلعہ بندی میں سارے شام میں نہ تھی، اور جس کو رومی ناقابلِ تسخیر خیال کرتے تھے۔

(۳) اب غزّہ اور عَسقَلان (بندرگاہ) کے ضلعوں اور متعلقہ بستیوں کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔

(۴) رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ تم شام میں فتوحات حاصل کرو گے، میں تم کو دو دلھنوں کی فتح کی بشارت دیتا ہوں یعنی غزّہ اور عسقلان، آپ نے فرمایا کہ وہ وقت دور نہیں جب بہت سے مسلمان ساحل سمندر پر آباد ہوں گے، تم کو چاہیئے کہ عسقلان میں جو ایک عمدہ ساحلی شہر ہے فروکش ہو، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب مشرق و مغرب میں خانہ جنگیاں شروع ہوں اور شہروں اور قریوں میں رہائش دشوار ہو جائے تو تم کو عسقلان میں آباد ہونا چاہیئے، نیز یہ کہ ہر چیز کا ایک عمدہ حصّہ ہوتا ہے اور شام کا عمدہ شہر عسقلان ہے۔

(۵) خط کا مضمون پڑھ کر بلا تاخیر عسقلان پر چڑھائی کر دو، اور اس کو اور اس کے مضافات کو رومی اقتدار سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرو، امید ہے کہ یہ نفیس شہر اور متعلقہ بستیاں خدائے برتر تمہارے ہاتھوں فتح کرائے گا۔

(۶) عسقلان پہنچ کر ہر روز وہاں کے حالات و وقائع سے مجھ کو مطلع کرتے رہو، والسلام"[1]

---

[1] (فتوح اعثم کوفی صہ ۱۶)

۴۳۔ معاویہ بن ابی سفیان کے نام

[معاویہ جب شام کے ساحلی مقام (عکا، صور، صیدا، یافا وغیرہ) فتح کر چکے تو مرکز کو لکھا کہ اگر اجازت ہو تو جزیرۂ قبرص پر چڑھائی کردوں۔ قبرص ساحلِ شام سے اتنا قریب ہے کہ وہاں کے پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دیتی ہے، جزیرہ بہت زرخیز اور قدرتی نعمتوں سے مالامال ہے، بہت سے اقسام کے میوے اور پھل وہاں ہوتے ہیں اور اس پر قبضہ کرنا بھی آسان ہے۔
حضرت عمر نے مصر کے گورنر عمرو بن عاص سے سمندری سفر کے بارے میں رائے لی تو انھوں نے خطرات کا مہیب نقشہ کھینچا اور فوج کشی کی مخالفت میں رائے دی تو حضرت عمر نے معاویہ کو ذیل کا خط لکھا۔]

"تم کو معلوم ہو کہ خدا نے اُمتِ محمدؐ کی بہبودی اور غمگساری کا بار میرے کندھوں پر رکھا ہے، اس بار سے عہدہ برآ ہونے کے لئے میں ہر وقت خدا کی مدد کا محتاج اور طالب ہوں، میں کسی طرح مناسب نہیں سمجھتا کہ ان کو سمندر کے خطروں میں مبتلا کروں اور ان کو کشتیوں پر سوار کر کے جزیرۂ قبرص پر چڑھائی کی اجازت دوں۔

(۲) تاہم مزید اطمینان کے لئے میں نے اس معاملہ میں استخارہ کیا اور اُن لوگوں کی رائے معلوم کی جو سمندر کے حالات سے واقف ہیں اور سمندری سفر کا تجربہ رکھتے ہیں، ان کی رائے یہی ہے کہ اس خطرناک اقدام سے اجتناب کیا جائے۔

(۳) لہٰذا تم قبرص پر چڑھائی کا خیال چھوڑ دو اور پھر کبھی سمندری جہاد کے باب میں خط وکتابت نہ کرنا۔ والسلام[1]

۴۴۔ معاویہ بن ابی سفیان کے نام

قضاء (فیصلۂ مقدمات) کے بارے میں تم کو خط لکھتا ہوں جس میں محض تمہاری خیراندیشی

[1] (فتوح اعثم ص۶۲)

کا جذبہ کارفرما ہے۔ پانچ باتیں گرہ میں باندھ لو دنیا میں بھی سرخرو رہوگے آخرت میں بھی۔

(۱) جب مدعی اور مدعیٰ علیہ کوئی مقدمہ لے کر آئیں تو مدعی سے گواہ عادل طلب کرو اور مدعیٰ علیہ سے قطعی حلف لو۔

(۲) مظلوم کے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤ تاکہ اس کی ہمت بڑھے اور زبان کھلے۔

(۳) پردیسی کے ساتھ التفات برتو، ورنہ وہ اپنا حق چھوڑ کر گھر لوٹ جائے گا اور اس کی حق تلفی کی ساری ذمہ داری تم پر ہوگی۔

(۴) مدعی اور مدعیٰ علیہ کو ایک نظر سے دیکھو۔

(۵) اگر صحیح فیصلہ تم کو نہ سوجھے تو دونوں کے درمیان صلح کرانے کی ہر ممکن کوشش کرو۔[1]

---

[1] عقد الفرید، مصر ج ۱ یہ خط تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ کئی کتابوں میں بیان ہوا ہے۔ ابو یوسف نے کتاب الخراج مصر، ص ۱۱۷، اور ابن جوزی نے تاریخ عمر، مصر ص ۱۳۲ پر اس کا مکتوب الیہ ابو عبیدہ بن جراح کو قرار دیا ہے، عقد الفرید میں اس کا مکتوب الیہ معاویہ کو بتایا ہے۔

عثمانؓ
صرف تاریخ کی روشنی میں

از

(ڈاکٹر طہٰ حسین)

مترجم

(جناب مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمایئے "برہان" بابتہ ماہ اپریل ۵۵ء)

پھر بہتوں نے ان میں سے خلوص سے کہئے یا خود غرضی سے یہ چاہا کہ نبیؐ کے ساتھ غزوات میں شریک نہ ہونے اور مصائب برداشت نہ کرنے کی تلافی اس وقت کی فتوحات میں شرکت اور اس کی راہ میں مصیبتیں اُٹھا کر کردیں، چنانچہ جب عربوں نے اس طرف رُخ کیا تو یہ لوگ چاہے سُستی سے چاہے چستی سے بہرحال ہمرکاب ہوگئے ان میں سے بہتوں کا مقصد تو دنیا تھی اور کچھ تھوڑے سے آخرت کے چاہنے والے بھی تھے، ان کے لیڈر اور سردار خوب سمجھ رہے تھے کہ وہ فتح مکہ کی پیداوار ہیں اور ان کا درجہ اسلام کے سابقین اولین سے کم ہے، یہ احساس ان کے لئے سخت کوفت کا باعث تھا اور ان میں احساسِ کمتری کے جذبات پیدا کررہا تھا، پھر وہ بھی جانتے تھے کہ ان کے بارے میں حضرت عمر کی رائے کیا ہے؟ اور اسی وجہ سے وہ فاروق اعظم سے برہم تھے اور چاہتے تھے کہ جہاد میں شرکت کرکے اور شدائد اور مصائب کا مقابلہ کرکے ثابت کردیں کہ ان کے بارے میں خلیفہ ثانی کی رائے کس قدر حقیقت سے دور ہے، اور یہی مطلب ہے اس جملے کا جو خالد بن ولید کی زبان سے اس وقت نکلا جب وہ شام کی کسی لڑائی میں گرپڑے اس وقت عکرمہ ابن ابوجہل کی ران پر اپنا

سر رکھے ہوئے خالد بن ولید نے کہا "حنتمہ کا لڑکا سمجھتا ہے کہ ہم لوگ اللہ کی راہ میں جان دینا نہیں جانتے،" حنتمہ حضرت عمر کی والدہ کا نام ہے۔

پس قریش کے لئے حضرت عمرؓ کے مسلک میں جو شدت تھی اس کی بنیاد یہ تھی کہ وہ ان کے اندرونی حالات سے اچھی طرح باخبر تھے، وہ جانتے تھے کہ ان کی طبیعت کیسی ہے، اپنا پوزیشن باقی رکھنے اور متوقعہ درجات تک پہنچنے کے وہ کتنے حریص اور کٹر ہیں چاہے اس سلسلہ میں خود خلیفہ مشکلات اور مصیبتوں کا شکار ہو جائے ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو ریشم کا کرتا پہننے کی اجازت دے دی تھی، ایک دن عبدالرحمٰن حضرت عمرؓ کے پاس آئے، ان کے ساتھ ان کا نوجوان لڑکا بھی تھا جس کے جسم پر ریشمی قمیص تھی، حضرت عمرؓ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا یہ کیا؟ اور گریبان میں ہاتھ ڈال کر نیچے تک قمیص چاک کر دی، عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کیا آپ نہیں جانتے کہ رسول اللہ نے مجھے ریشمی کپڑے پہننے کی اجازت دے رکھی ہے صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓ نے فرمایا، ہاں جانتا ہوں تمہاری ایک مجبوری پر تم کو اجازت دی گئی لیکن تمہارے لڑکے کو تو اس کی اجازت نہیں

اس طرح حضرت عمرؓ کو خطرہ لگا رہتا کہ مہاجرین رسول اللہ صلعم کی تھوڑی سی دی ہوئی رخصت کو بڑھا کر زیادہ کر دیں گے اور غیر مہاجر قریشی تو جن معاملات میں نبیؐ کی طرف سے کوئی رخصت نہیں اس میں بھی اپنی طرف سے اضافہ۔ حضرت عمر دریا کے خطرات سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لئے حضرت معاویہ کو بحری جہاد سے روکتے رہے لیکن غالب گمان یہ ہے کہ اس احتیاط میں حضرت عمر کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ بحری جہاد میں جس پر حضرت معاویہ کو بڑا اصرار تھا مواقع سے فائدہ اٹھانے کے امکانات رہا کرتے ہیں جس کے لئے قریش ہر وقت پا بر کاب رہا کرتے ہیں حضرت عمر یہ اپنی ذمہ داری تصور فرماتے تھے کہ وہ عام مسلمانوں کو قریشی نوجوانوں کی ان معرکہ آرائیوں سے دور رکھیں جن میں مواقع سے فائدہ اٹھا لینے کے جذبات کام کر رہے ہوں، یہ تو آپ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت نے قریشیوں کو ایک جدید امتیاز کا مالک بنا دیا تھا، حضرت عمر

اسی امتیاز میں خطرہ دیکھ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ اس کی حد بندی کردی جائے اور اس کو بے لگام نہ ہونے دیا جائے۔

حضرت عثمان جس رعایا کے خلیفہ بنے اس کے ایک طبقے کا یہ حال تھا اور اس کے پیش نظر ذی النورین کے سامنے دو ہی راستے تھے، یا تو وہ فاروق اعظم کی طرح شدت سے کام لیتے اور ممتاز مہاجر صحابہ کو مدینہ میں روکے رکھتے قریشیوں سے اپنے اندیشوں کا اظہار کرتے رہتے اور ایک مقررہ حد سے آگے ان کو بڑھنے نہ دیتے، حکومت کے معاملات اور حکمرانی کے عہدوں پر عام عربوں بلکہ عام مسلمانوں میں سے انھیں افراد کو مقرر فرماتے جو ذمہ داری سنبھالنے کے پورے اہل ہوتے، یا پھر نرمی کی راہ اختیار فرماتے اور قریش کے لئے راستہ صاف کر دیتے جس پر چل کر وہ ذاتی مفاد کی نہ ختم ہونے والی منزلوں پر پہنچے، آگے کی سطروں میں آپ پڑھیں گے کہ حضرت عثمان نے اپنی مرضی سے کہئے یا مجبور ہو کر یہی دوسرا راستہ اختیار کیا۔

انصار رعایا حضرت عثمان کی رعایا میں دوسرا طبقہ انصار کا تھا۔ اسلام میں انصار کا درجہ بیان سے بے نیاز ہے، قرآن مجید میں ان کی تعریف محفوظ ہے، نیز نبیؐ نے ان کے لئے رعایت کے جو احکام دیئے ہیں وہ بھی برحق و برقرار ہیں، تم یہ جانتے ہو کہ حضرت ابوبکر کی اس روایت کے بعد کہ "امامت قریش میں ہے" خلافت میں انصار کا حصہ نہیں رہا، تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ صدیق اکبرؓ نے فرمایا تھا "ہم امیر اور تم وزیر"، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ انصار سے مشورہ لیا کرتے تھے جس طرح مہاجرین سے مشورہ فرماتے تھے، یہی حال حضرت عمرؓ کا بھی تھا، حضرت عثمانؓ نے بھی انصار سے مشورہ لینے میں کبھی کوتاہی نہیں کی، لیکن یہ تینوں خلفاء ان انصار سے مشورہ لیا کرتے تھے جو رسول اللہ صلعم کے صحابہ تھے لیکن انصار کی وہ نئی نسل جو صدیق اکبرؓ کے زمانے میں قابل ذکر نہ تھی لیکن حضرت عمرؓ کے عہد میں کچھ سمجھنے بوجھنے لگی، اور حضرت عثمانؓ کے دور میں تو ان کی آتش احساس بہت تیز ہو چکی تھی، اس نئی نسل اور اس کے نوجوانوں کو عام عربوں میں کوئی امتیازی شان حاصل نہ تھی، حضرت عمرؓ عمال اور حکمرانی کے عہدوں کے سلسلے میں صرف قریش تک اپنی تلاش محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ

آپ کی نگاہِ انتخاب پورے عرب کی طرف اُٹھتی تھی، اور اگر فاروق اعظم زندہ رہتے تو وہ انصار کے نوجوانوں کو مطمئن کر دیتے کہ حکومت دوسروں کی طرح ان کے حقوق کا بھی خیال رکھتی ہے اور اس سلسلے میں اس کی طرف سے کوئی بے نیازی یا کوتاہی نہیں ہو سکتی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ کے طرزِ عمل اور روش سے ممتاز انصار صحابہ پورے اخلاص کے ساتھ خوش تھے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عام انصار اور خاص طور پر نوجوان طبقہ قریش کی امتیازی سیادت اور چودھری پنے سے سخت تنگ اور نالاں تھا، اور کیوں نہ ہوتا بدر کے موقع پر انصار ہی نے تو قریشیوں کو نیچا دکھایا تھا، مہاجرین کے ساتھ مکہ میں داخل ہونے والے ہر طرف سے آئے ہوئے انصار ہی تو تھے، ان حالات میں انصار کی تسلی اور اُن کے سکون کا یہ بہت بڑا سامان تھا کہ حضرت عمرؓ قریشیوں کے لئے بڑے سخت تھے اور ان کو عام مسلمانوں پر کوئی فوقیت اور امتیاز نہیں دینا چاہتے تھے، پس حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہو جانے کے بعد انصار کے نقطۂ نظر کا دار و مدار خلیفہ کے طرزِ عمل پر تھا، اگر خلیفہ حضرت عمرؓ کے نقشِ قدم پر چلا تو ان کو بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح دنیاوی امور میں حصہ لینے کا پورا پورا موقع ہوگا اور اگر اس نے قریش کو ترجیح دی اور ان کی طرفداری کی تو انصار یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ ایک مطلق العنان اور مطلبی سیادت ہے، اور ان کا درجہ قریش کے بالمقابل متبعین کا درجہ ہے اور وہ امامت کے علاوہ معاملات میں بھی ان کی برابری کے نہیں ہو سکتے، آگے چل کر آپ پڑھیں گے کہ حضرت عثمانؓ نے جبراً قہراً یا خوشی خوشی قریش کو ترجیح دی، اور اس ترجیح کا انصار کے دلوں پر بہت بُرا اثر پڑا جس کے نقوش بعد میں ہونے والے انقلابات اور فتنوں میں نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ کی رعایا میں تیسرا گروپ مذکورہ بالا دو طبقوں کے علاوہ حضرت عثمانؓ کی رعایا میں ایک تیسرا گروپ ان عام عربوں کا تھا جو دل سے یا بادل ناخواستہ مسلمان ہوئے تھے، اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے ان کو جہاد اور فتوحات کے لئے روانہ کر دیا تھا، یہ لوگ فتوحات کے بعد اپنے اپنے شہروں اور سرحدوں میں مقیم ہو گئے تھے، یہی لوگ ایک طرف مسلمانوں کی حفاظت کے لئے دیوار کا مرتبہ رکھتے تھے دوسری طرف مسلمانوں کی فوجی طاقت تھے، جس سے مزید فتوحات کا سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا، اسلام نے ان

سے وعدہ کیا تھا کہ سب لوگ مساوی ہیں، برابری کا درجہ رکھتے ہیں ہاں فضیلت کی چیز تقویٰ، اہلیت اور آزمائش ہے، پس یہی عام عرب درحقیقت اسلام کا سرمایہ اور اس کی دولت تھے، جیسا کہ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے، انھیں لوگوں نے فتوحات کیں، دشمن کو زیر کیا، اللہ کا دین دنیا کے گوشوں تک پہنچایا اس لئے یہی حقدار ہیں ان کے سوا کسی کو ترجیح نہ دی جائے، لیکن ان تمام خصوصیات کے بعد چوں کہ یہ نئے نئے مسلمان ہیں، عہدِ جاہلیت سے قریب ہیں، ابھی وہ بھولے نہیں کہ اُن میں سخت دشمنی اور عداوت، عصبیت اور تفاخر کے جذبات ہیں، تکبّر اور غرور کے جو اوصاف وہ شروع سے رکھتے تھے اب اُن میں جدید امتیازات کا اضافہ ہو چکا ہے جو پہلے سے زیادہ شاندار اور اعلیٰ ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کے لئے مدبرانہ سیاست یہی تھی کہ اول تو ان کے دلوں سے وہ پُرانی عصبیت اور گھمنڈ مٹایا جائے، پھر خالص اسلامی تربیت کے اثرات ان میں پیدا کئے جائیں اور عدل و مساوات کی وہ عملی مثال ان کے سامنے پیش کی جائے جس کا خدا نے وعدہ کیا ہے۔ حضرت عمر نے اسی سیاست کو عملی جامہ پہنانا چاہا تھا چنانچہ انھوں نے حتی الامکان دلوں کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی عصبیت اور دماغوں میں بیٹھی ہوئی کدورت کو دور کیا اُن شاعروں تک کو متنبہ کیا جو اشعار اور قصائد میں عہدِ جاہلیت کے تفاخر کا بیان کرتے تھے، بڑے بڑے شہروں میں صحابہ کو مقرر فرمایا کہ وہ شہر والوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیں احادیثِ نبوی کا درس دیں، اور دین کی تعلیمات انھیں سکھائیں، اور اس طرح ایک خالص اسلامی سماج پیدا کریں، حضرت عمر نے ایک فریق کو دوسرے پر فوقیت اور امتیاز کا موقع نہیں دیا، اور نہ حکومت کے معاملات میں کسی ایک قبیلے اور محلے کو ترجیح دی، بلکہ عام لوگوں کو بالکل مساویانہ مواقع پیش کئے، چنانچہ گورنری کے لئے مضر، ربیعہ، اور یمن سے افراد کا انتخاب کیا، پھر ان سب پر سخت نگرانی رکھی، حضرت عثمان کے فرمانوں میں تم نے پڑھا ہو گا کہ وہ یعنے حضرت عثمان اور اُن کے گورنر فاروق اعظم کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں گے لیکن آگے چل کر تم دیکھو گے کہ حضرت عثمان نے گورنروں کے اپنے عہدوں پر باقی رکھنے کی ایک سال کی وصیت کے پورا ہوتے ہی اپنی پالیسی مجبور ہو کر یا خوشی سے بہرحال بدل دی، اور قریش عام عربوں پر ممتاز اور مسلط ہو گئے، چنانچہ بڑے شہروں

اور جلیل القدر مناصب پر قریش ہی مقرر کئے گئے دوسروں کو یہ موقع نہیں دیا گیا۔

حضرت عثمان کی رعایا کا چوتھا عنصر | مفتوحہ ممالک کے شہری حضرت عثمان کی رعایا میں چوتھا عنصر تھے، ان کے بارے میں اسلام کا مسلک بالکل صاف ہے کہ جو کچھ ان پر واجب ہو ان سے وصول کیا جائے اگر وہ اپنا حق ادا کردیں تو پھر ان کے لئے وہی تمام حقوق ہیں جو مسلمانوں کے لئے ہیں، حضرت عثمان اس مسلک سے بخوبی واقف تھے اور جیسا کہ ان کے فرمانوں میں بتایا گیا ہے وہ اور ان کے گورنر اس مسلک کے پابند بھی تھے۔

لیکن حضرت عثمان کے دور میں کہیں ذمیوں کی کوئی آواز کانوں میں نہیں پڑتی اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے ساتھ اسلامی مسلک کے مطابق سلوک کیا گیا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مغلوب اور بے بس تھے، اور سیاست میں قابل ذکر حصہ لینے کا ان کو موقع نہ تھا ورنہ کوئی بتائے کہ اس گفتگو کا کیا مطلب ہے جو ایک دن حضرت عثمان اور حضرت عمرو بن العاص کے درمیان ہوئی، حضرت عثمان عمرو بن العاص کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

—قد درّت تلک اللقاح بعدک یا عمرو! — اے عمرو تمہارے بعد اس اونٹنی نے تو دودھ دیا

عمرو بن العاص نے جواب دیا کہ

نعم وھلکت فصالھا، ہاں لیکن بچے تو سب مر گئے

حضرت عثمان کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ بیت المال میں حضرت عمرو بن العاص کے زمانہ گورنری میں جو رقم آیا کرتی تھی وہ عثمانی عہد کے گورنر ابن ابی سرح کی رقم سے کم تھی، حضرت عمرو بن العاص کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ آمدنی کا یہ اضافہ ذمیوں پر زیادتی کی بنا پر تھا، پھر اس واقعے سے دو ہی نتیجے نکالے جا سکتے ہیں یا تو عمرو بن العاص خراج کی آمدنی کا کچھ اپنی ذات کے لئے بچا لیتے ہوں گے اور بیت المال میں داخل نہ کرتے ہوں گے، یا پھر یہ کہ ابن ابی سرح ذمیوں اور اہلِ معاہدہ سے مقررہ رقم سے زیادہ وصول کرتے ہوں گے اور یہ دونوں باتیں بری ہیں۔

اور پھر معاملہ رعایا کے ساتھ ناہموار یالیسی تک محدود نہیں رہا، حضرت عمر تو قریش کے لئے

نہایت سخت تھے وہ قریش کی سطح عام عربوں کی سطح کے برابر تصور فرماتے تھے، وہ کسی قبیلے کو دوسرے قبیلے پر کوئی فضیلت اور فوقیت نہیں دیتے تھے، حضرت عثمان یہ مساوات بھی قایم نہ رکھ سکے، چنانچہ انھوں نے قریش کو تمام عربوں پر قصداً یا سہواً فوقیت دی بلکہ وہ تو ایک قبیلۂ قریش میں بھی مساوات باقی نہ رکھ سکے اور اس کی ایک پارٹی کو دوسری پارٹی پر ممتاز کر دیا اور دانستہ یا نا دانستہ ایک کو بڑھایا دوسرے کو گھٹایا، کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر کو کچھ خطرہ سا تھا کہ مساوات پورے طور پر باقی نہ رہ سکے گی اور انصاف چل نہ سکے گا اسی لئے انھوں نے حضرتِ عثمان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا تھا کہ اگر وہ خلیفہ ہو جائیں تو عوام پر بنی اُمیہ اور ابو معیط کا خاندان مسلط نہ کر دینا اس طرح آپ نے حضرت علی سے بھی چاہا تھا کہ اگر خلافت کے مسند نشین وہ ہو جائیں تو عبد المطلب اور بنی ہاشم کے ہاتھ میں عوام کی لگام نہ دے دینا، حضرت عثمان نے حضرت عمر کی بات نہیں مانی اور لوگوں کی گردنوں پر بنی اُمیہ اور ابو معیط کو سوار کر دیا، کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے بھی فاروق اعظم کا کہنا نہیں مانا اور جب وہ خلیفہ ہوئے تو اپنے چچا کی اولاد میں سے تین کو بصرہ، مکہ اور یمن پر حاکم بنا دیا اور مالک اشتر کو کہنا پڑا "کہ پھر بوڑھے کی جان کیوں لی گئی" لیکن اس کے باوجود میرے نزدیک حضرت عثمان کے عمل اور حضرت علی کے اقدام میں بہت بڑا فرق ہے، خود حضرت علی نے گورنروں کے بارے میں جب حضرت عثمان پر اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ حضرت عمر نے بھی تو کوفہ پر مغیرہ بن شعبہ کو مقرر کیا تھا حالانکہ وہ کوفہ میں موجود نہ تھے، اور پھر انھوں نے معاویہ کو حاکم بنایا، اس جواب پر حضرت علی نے فرمایا کہ حضرت عمر اپنے گورنروں پر رعب اور شدید نگرانی رکھتے تھے اور تمہارے گورنر تو من مانے حاکم ہیں ان کو تمہاری کچھ پروا نہیں، اپنی طرف سے احکام جاری کرتے ہیں اور نام خلیفہ کا لگاتے ہیں اور آپ ان کے احکام میں کچھ رد و بدل بھی نہیں کر سکتے، اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت علی کا طرز عمل اپنے عزیز گورنروں کے ساتھ حضرت عمر کا سا تھا، وہ ان کی کڑی نگرانی کرتے تھے، خلاف ورزی یا کوتاہی کی صورت میں کوئی طاقت معزولی سے ان کو روک نہیں سکتی تھی، حالانکہ حضرت عثمان اس درجہ بے بس تھے کہ بنی اُمیہ اور آل معیط میں سے بھی کسی گورنر کو اس وقت تک معزول نہ کر سکے جب تک رعایا نے مجبور نہ کر دیا۔

بہر حال حضرت عثمان کی رعایا وہی تھی جو حضرت عمر کی تھی، اور اس میں خفیف سی تبدیلی اس وقت ہوئی جب عثمانی دور کا ایک حصہ گذر چکا، اور حضرت عمر کا مسلک وہ واحد راہ تھی جس پر چل کر یہ رعیت کامیاب اور بامراد ہوتی۔

لیکن ہر مدعی کے لئے دار و رسن کہاں، سب لوگ فاروق کی سیرت نہیں پا سکتے، ہر ایک میں حضرت عمر کی وہ شدت جو حق کی راہ میں نرمی نہیں جانتی جو انصاف اور مساوات قائم کرنے میں کسی کی پرواہ نہیں کرتی کہاں سے آئے، خود حضرت عثمان بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے چنانچہ ایک مرتبہ اپنے مخاطبین سے جب کہ دستر خوان پر زم غذا حاضر تھی فرمایا "ہر آدمی عمر کی سی طبیعت کہاں سے لائے" اور ایک مرتبہ بیت المال سے داد و دہش پر ملامت کرنے والوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا "ہم میں عمر جیسا کون ہے؟" اور ایک مرتبہ نبی کے ممبر سے کھڑے ہو کر فرمایا:

"ابن الخطاب نے تمہیں زدوکوب کیا، منہ توڑ جواب دیا، تم ان سے ڈرتے رہے اور ان سے ان باتوں پر خوش رہے جن پر مجھ سے ناراض ہو اور یہ اس لئے کہ میں نے تم پر ہاتھ نہیں اٹھایا، تمہارے خلاف زبان نہیں کھولی۔

پس دونوں میں بڑا فرق ہے، طبیعت میں فرق ہے، مزاج میں فرق ہے اور عمر میں بھی فرق ہے لیکن یہ فرق فتنے کی جڑ نہیں ہیں، فتنے کے اسباب کچھ اور بھی ہیں جن کا دفع کرنا حضرت عثمانؓ کے بس سے بھی باہر تھا، آئندہ فصل میں ہم بعض ان اسباب پر روشنی ڈالیں گے۔

اپنے اختیار سے گورنروں کا تقرر

خلافت کا پہلا سال ختم ہوا، اور حضرت عمرؓ کی یہ وصیت کہ "گورنروں کو ایک سال تک ان کے عہدوں پر باقی رکھنا" پوری ہوئی، اب حضرت عثمانؓ کو آزادی ملی اور وہ حاکموں کے تقرر اور معزولی میں اپنی طبیعت اور اقتدار سے کام لینے لگے، اس براہ راست اقدام میں کچھ جلد بازی ضرور تھی، لیکن پھر بھی کافی غور و فکر کے بعد اقدام کیا گیا تھا، آپ نے ایسے صوبوں کی طرف

کوئی توجہ نہیں کی جن کی سیاست، انتظام اور جنگ کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہ تھی چنانچہ ان میں آپ نے حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ گورنروں کو ہی برقرار رکھا، ہاں ضرورت پڑنے پر کوئی معمولی سی تبدیلی بلا کسی خاص توجہ اور اہتمام کے کردی۔ اس زمانے میں صوبوں کی حیثیتیں مختلف تھیں، بعض صوبے سیاسی، انتظامی اور جنگی نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے، خصوصاً وہ تمام علاقے جو مسلمانوں نے فتح کئے تھے اور بعض وہ جو رومی مملکت سے کٹ چکے تھے اور جن پر فارسی عنصر غالب تھا، ایسے اہم صوبے چار تھے، شام، مصر، کوفہ، بصرہ، ان میں سے ہر صوبہ ایسا تھا جس کی سرحدیں حفاظت اور مدافعت کی محتاج تھیں، ہر ایک کے سامنے دار الحرب تھا جس پر مسلمانوں کو گہرے غور و فکر کی ضرورت تھی شام کے سامنے خود رومی آبادیاں اور سمندر کی سطح تھی۔ مصر کے بالمقابل دریا کی موجیں اور شمالی افریقہ تھا، عراق کے دونوں شہروں کوفہ اور بصرہ کے سامنے فارس کے مفتوحہ اور غیر مفتوحہ علاقے تھے، اسلامی قوت کے یہی چار مرکز تھے، انھیں میں اسلامی فوجیں مقیم تھیں، انھیں کے بالمقابل وہ سرحدیں تھیں جن میں لڑنے والی فوجیں کبھی کوچ اور کبھی قیام کرتی رہتیں۔ یہی چار صوبے مسلمانوں کی دولت اور ثروت کے بھی سرچشمہ تھے، انھیں میں تہذیب و تمدن کا شاندار اور پُربہار دور تھا، ان میں زرخیز زمینیں تھیں جن میں خدا کا دیا بہت کچھ پیدا ہوتا یہی صوبے خراج کی وصولی کے مرکز تھے، انھیں میں وہ ذمی آباد تھے جو جزیہ ادا کرتے تھے اور پھر یہی وہ صوبے تھے جنہیں فتوحات کے دست و بازو کہنا چاہیئے، یہیں ہر سال فاتحین مال غنیمت لاتے اور یہیں سے اس کا پانچواں حصہ مدینہ منورہ بھیجا جاتا۔ پس اگر عرب فوجی قوت کے اعتبار سے اسلام کی ایک طاقت تھے تو یہ چاروں صوبے مالیاتی نقطۂ نظر سے اسلام کا غیر معمولی سرمایہ تھے۔ اِن حالات کے پیشِ نظر کوئی تعجب کی بات نہیں اگر حضرت عثمان نے ان صوبوں کی طرف خاص توجہ فرمائی اور دوسرے ایسے صوبوں کو نظرانداز کردیا جن کی کچھ اہمیت نہ تھی، بلاشبہ مکہ مکرمہ، طائف اور یمن بھی صوبے تھے اور ان کا بھی درجہ ہے، لیکن اول تو یہ کہ یہ صوبے کسی میدانِ جنگ کی زد میں نہ تھے اور پھر وہ آمدنی کا ذریعہ بھی نہ تھے، ان سے

کسی ایسے ساز و سامان اور ایسی قوت کی توقع نہ تھی جو کسی نئی حکومت کے استحکام کا ضروری جز ہو سکے، ان صوبوں کی اہمیت اور قدر و قیمت فتوحات سے قبل غیر معمولی تھی، جب رسول اللہ صلعم اس کوشش میں مصروف تھے کہ پورے عرب ملک میں اسلام پھیلا دیں۔ لیکن فتوحات کے بعد جب کہ عربی سرزمین اللہ کی پرستش سے معمور ہو گئی اور اسلام محفوظ ہو گیا۔ تو اِن کی اہمیت دوسرے درجہ میں آ گئی۔ اور پہلا درجہ ان صوبوں کو ملا۔ جن کی فتح میں مسلمانوں نے اُن عربی صوبوں سے کہیں زیادہ جانی اور مالی قربانیاں پیش کی تھیں۔ اِن ہی باتوں کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ مدینہ چھوڑ کر جانے والے مسلمانوں نے مکہ طائف یا یمن کا رُخ نہیں کیا بلکہ عراق۔ شام۔ مصر کا ارادہ کیا۔ اِن جانے والوں میں جو نیک اور مخلص تھے اِن کے پیشِ نظر فتوحات میں وسعت کے ساتھ ساتھ سرحدوں کی حفاظت اور آخرت کا ثواب تھا۔ اور جو کاروباری تھے وہ دنیاوی مقاصد رکھتے تھے۔ تاجر تجارت کرتا تھا اور کاشتکار زراعت اس طرح مختلف طبقے مختلف طریقوں سے فوائد حاصل کرنے میں مصروف تھے۔

حضرت عمرؓ نے جب وفات پائی۔ تو کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ ثقفی تھے اور بصرہ کے گورنر ابو موسیٰ اشعری اِن دونوں کو حضرت عثمانؓ نے پہلے سال باقی رکھا۔ لیکن سال کے خاتمہ پر مغیرہ کو کوفہ کی حکومت سے معزول کر دیا اور اُن کی جگہ سعد بن ابی وقاص زہری کو والی بنایا۔ یہ تقرر حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرؓ کی اس خواہش کی بنا پر کیا تھا کہ "میں نے سعد بن ابی وقاص کو کسی خیانت کی بنا پر معزول نہیں کیا۔ میرے بعد اگر وہ خلیفہ نہ ہو سکے تو اُن کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔" لیکن سعد بن ابی وقاص کوفہ کی گورنری پر ایک سال اور کچھ دن سے زیادہ نہ رہ سکے۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ مجبور ہوئے کہ اُن کو معزول کر دیں۔

مورخوں کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ سعد بن ابی وقاص کو معزول کر دینے پر مجبور ہو گئے۔ ہوا یہ کہ عبداللہ ابن مسعود بیت المال کے خزانچی اور سعد بن ابی وقاص کے درمیان اختلاف ہوا۔ ایسا اختلاف جس نے حضرت عثمانؓ کو دونوں پر سخت برہم کر دیا اور آپ نے دونوں کے خلاف ارادہ فرمایا۔ لیکن پھر رُک گئے اور سعد بن ابی وقاص کی معزولی پر اکتفا کیا۔

اس اختلاف کی بنیاد بھی واقعتہً حیرت انگیز تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سعد ابن ابی وقاص نے بیت المال سے کچھ قرض لیا اور اس کا وثیقہ لکھ دیا۔ اب عبداللہ بن مسعود نے قرض ادا کر دینے کا مطالبہ کیا۔ حضرت سعدؓ نے مہلت کی درخواست کی عبداللہ بن مسعود اس پر راضی نہیں ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف کوفہ والوں کی ایک جماعت کی حمایت حاصل کی۔ ابن مسعود اپنی حامی جماعت کی امداد سے چاہتے تھے کہ سعد قرض ادا کر دیں اور سعد کی کوشش یہ تھی کہ اپنے حامیوں کے ذریعہ ابن مسعود سے مہلت حاصل کریں۔ بالآخر دونوں اکٹھا ہوتے ہیں اور بات گستاخی کی حد تک پہنچتی ہے۔ بقول راویوں کے حضرت سعد ارادہ کرتے ہیں کہ ابن مسعود کے حق میں بددعا کریں۔ یہ دیکھ کر ابن مسعود گھبراتے ہیں اور اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود جانتے تھے کہ رسول اللہ صلعم نے خدا سے دعا کی ہے کہ "جب کبھی سعد کوئی دعا کرے تو اُسے قبول کر" راوی کہتے ہیں کہ حضرت سعد نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور فرمایا کہ "اللّٰھُمَّ رَبَّ السمٰوٰت والارض" اتنا سن کر ابن مسعود نے کہا۔ سعد منہ سے اچھا کلمہ نکالنا۔ یہ کہہ کر فوراً وہاں سے لوٹ آئے۔ اب معاملہ حضرت عثمانؓ تک پہنچا، آپ دونوں پر سخت غصہ ہوئے اور دونوں کے خلاف کارروائی کا ارادہ کیا۔ لیکن بعد میں رُک گئے اور سعد کو معزول کر دیا اور اُن سے جو کچھ اُن پر تھا وصول کر لیا۔ اور کوفہ کے لئے ایک نئے گورنر کا تقرر کر دیا۔

تمام راوی اس واقعہ پر متفق ہیں۔ لیکن میں اِس مقام پر انتہائی احتیاط برتنا چاہتا ہوں۔ میری اس احتیاط کے کئی سبب ہیں۔ حضرت سعد کے متعلق حضرت عمرؓ کی آنے والے خلیفہ سے یہ سفارش تھی کہ اُنھیں موقع دیا جائے۔ اور یہ کہ انھوں نے کسی خیانت کی بنا پر معزول نہیں کیا تھا اور مذکورہ بالا قصے کا کم از کم اتنا تو مفہوم ہے کہ حضرت سعدؓ نے بیت المال سے کچھ قرض لیا تھا اور اُس کی ادائیگی میں تاخیر کر رہے تھے یا ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ شخص جسے فاروق اعظم نے مجلس شوریٰ کے لئے پسند کیا ہو۔ جسے منصب خلافت کا امیدوار بنایا ہو اور اگر خلیفہ نہ ہو سکے تو اس کے تعاون کو ضروری قرار دیا ہو۔ وہ ایسی کمزوری دکھائے اور

یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے یہ ممکن نہیں کہ عوام کی بھلائی اور خیر خواہی کے خلاف کسی ایک شخص کے لئے ذاتی فائدے کے خواہاں ہوں۔ انھوں نے تو ہمیشہ عام مسلمانوں کے مفاد کو مقدم رکھا۔ بلا شبہ جب وہ خلیفہ سے سفارش کر رہے تھے کہ سعد سے کام لینا۔ اُن کو گورنر بنانا تو اس کا مطلب سعد کو خوش کرنا یا اُن کی طرفداری کرنا یا اپنے ساتھیوں پر اُن کو مقدم کرنا نہ تھا۔ بلکہ آپ خلیفہ اور مسلمانوں کو مخلصانہ مشورہ دے رہے تھے اور ہدایت فرما رہے تھے کہ سعد کی قابلیت اور خاص کر جنگی معاملات میں ان کی مہارت سے فائدہ اُٹھانا۔ اس لئے کہ ایرانی علاقوں کے معاملات مسلمانوں کی منشا کے مطابق اطمینان بخش نہ تھے۔ ایرانی اقتدار کا بڑی حد تک خاتمہ ضرور ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی اُس کی شوکت ٹوٹی نہ تھی۔ کسریٰ یزدگرد شکست کھا چکا تھا۔ لیکن وہ مارا نہیں گیا تھا اور نہ قید کیا جا سکا تھا۔ وہ اپنے ملک میں تھا اور شہروں اور دیہاتوں میں بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ فارس میں بہت سے شہر تھے۔ بعض تو ایسے تھے جہاں اب تک مسلمان پہنچ بھی نہ سکے تھے۔ اور بعض ایسے تھے۔ جن سے مسلمانوں کی صلح ہو چکی تھی۔ لیکن مطلع ہنوز غبار آلود تھا۔ ایسے مقامات فرصت کے منتظر اور وقت کی تاک میں تھے کہ جیسے ہی موقع ملے۔ بغاوت کر بیٹھیں، سر زمینِ ایران پر فتوحات کی ابتدا ہوئی تو بڑی تیزی کے ساتھ سلسلہ آگے بڑھا لیکن فتح کی تکمیل بہر حال نہیں ہو سکی۔ اور معرکۂ قادسیہ کے مردِ میدان سعد بن ابی وقاص ہی کسریٰ کی حکومت کے فاتح تھے۔ ایسی حالت میں یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی کہ حضرت عمرؓ کے دماغ میں سعد ابن ابی وقاص کے متعلق یہ خیال آئے کہ فتوحات کا جو سلسلہ انھوں نے شروع کر دیا تھا وہی اس کی تکمیل کر دیں۔ اور غالب گمان ہے کہ اگر فاروق اعظمؓ زندہ رہتے تو سعد کو پھر کوفہ پر واپس کر دیتے۔ اور حکم دیتے کہ وہ آگے بڑھیں یہاں تک کہ اُن کے ہاتھوں فتح کی تکمیل ہو جاتی۔ اور یہ سعد اسلام کی طرف سبقت کرنے میں مشہور ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے متعلق کہا کرتے تھے کہ میں تو ثلث "الاسلام" ہوں اُن کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں صدیق اکبرؓ کے بعد مسلمان ہوا ہوں اور اس طرح نبی صلعم کے بعد ابو بکرؓ اور ان کے بعد میں اور اگر حضرت ابو بکرؓ اور زید ابن حارثہ کے بعد وہ مسلمان ہوئے ہوں تو وہ اُن تین میں سے ایک ہیں جو سب سے پہلے اسلام لائے۔ اور پھر حضرت سعدؓ باتفاق محدثین بطن رابغ جانے والے فوجی دستہ "سریہ" کے ۲

۲ سب سے پہلا سریہ [illegible] عبیدہ ابن حارثؓ ابن عبدالمطلب کی قیادت میں ہوا تھا۔

(باقی آئندہ)

اسلام کا جمہوری نظام

از

(جناب کپتان محمد قطب الدین احمد صاحب)

(۲)

رائے عامہ کا اختیار جس طرح اربابِ حل وعقد اور ملت کو خلیفہ کے انتخاب کا حق حاصل ہے، اسی طرح اگر وہ احکامِ اسلامی کی خلاف ورزی کرے یا اس کی وجہ سے نظم ونسق میں خرابی واقع ہو تو اس کو معزول بھی کیا جا سکتا ہے شرح مواقف جو اہل سنت کی موثق ترین کتاب ہے، اس کی تفصیل اس طرح پر کی گئی ہے:- "قوم کو حق حاصل ہے کہ کسی سبب سے خلیفہ کو معزول کر دے۔ مثلاً اس سبب سے کہ مسلمانوں کے حالات، امورِ دین، اور انتظامات وتدابیر اس کے باعث خلل پذیر ہو جائیں۔ جس طرح کہ اس کو خلیفہ کے تقرر وانتخاب کا حق امورِ اسلامیہ کے نفاذ واجراء کے لئے تھا اسی طرح معزولی کا بھی ہے۔ اگر اس کی معزولی سے فتنہ برپا ہو تو پھر معزولی اور خلل احوال مسلمین ان دونوں میں سے جس کا ضرر کم ہو، اس کو برداشت کر لیا جائے گا۔"

مرضی عامہ معلوم کرنے کے طریقے خلیفہ کے عزل ونصب سے متعلق اسلام کے یہ چند بنیادی اصول ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے حالات وضروریات کے لحاظ سے مختلف طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ ان سے معقول طور پر یہ معلوم کیا جا سکتا ہو کہ جمہور قوم کا اعتماد کس شخص کو حاصل ہے۔ اس وقت کے ماحول کے لحاظ سے جو بہتر سے بہتر طریقہ ہو سکتا تھا وہ اختیار کیا گیا۔ اسلام ہر معاملہ میں سارا زور اصل درجہ پر دیتا ہے، ذرائع ووسائل پر نہیں۔ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ط (۵: ۴۸) اصل چیز جس پر توجہ مبذول کرنی چاہیئے، نیکی کے کام ہیں تمام اعمال ورسوم انہی کے لئے ہیں، ہر ملک اور زمانے

کے مطابق یہ بدلتے رہتے ہیں۔ احوال وظروف حسب بدلیں گے توان میں بھی یقینی طور پر تغیر واقع ہوگا۔ اس زمانہ کے لحاظ سے ہمارا پارلیمنٹ ہاؤس مسجد نبوی تھی، مجلس شوریٰ، دیوانی مجلس تھی، مہاجرین وانصار اس کے ارکانِ خاص تھے، اور عامۂ مسلمین اس کے ارکانِ عام تھے، اور الصلوٰۃ جامعہ اس مجلس کے انعقاد کا اعلان تھا۔

اسلام اور موجودہ طریقوں کا باہمی فرق | اسلام محض سرشماری پر زور نہیں دیتا، اس کے نزدیک اربابِ حل وعقد اور اصحابِ فہم وتمیز کی آرار کو زیادہ وزن ووقعت حاصل ہے، جو وقت کے تقاضوں، صورتِ حال کی نزاکتوں، اور معاملات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی استعداد رکھتے ہوں۔ آج کل ہر زید وبکر سے جو رائے لی جاتی ہے اس میں ہوتا کیا ہے چند منفعت پیشہ افراد جو اپنے مستقل مفادات رکھتے ہیں اپنی جداگانہ ٹولیاں ترتیب دیتے ہیں اور بے زبان انسانوں کا ایک انبوہ اپنے گرد جمع کر لیتے ہیں، جنھیں کسی قسم کا سیاسی شعور نہیں ہوتا، جو اپنی کوئی آزادانہ رائے نہیں رکھتے، جو ان کا لیڈر کہتا ہے وہی ان کی آواز ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ آراء حاصل کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ کبھی ان کو پیسوں سے خریدا جاتا ہے، کہیں جھوٹے وعدوں اور سبز باغ دکھا کر انھیں حاصل کیا جاتا ہے، اور کہیں اعلیٰ نظریات اور معتقدات پیش کر کے عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ جہاں یہ صورتِ حال ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ کسی موزوں ومناسب آدمی کا انتخاب ہو سکے۔ جو شخص خود اپنے لئے کسی منصب کا آرزومند ہوگا، وہ یقیناً خائن ثابت ہوگا، اس سے بے لاگ اور بے لوث خدمات کی کبھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جن لوگوں کا اصل مقصد جاہ طلبی، مفاد پرستی، اور ہوسِ اقتدار ہو وہ سچے خدمت گذار کیسے ہو سکتے ہیں۔ اسلام میں سیادت خدمت گذاری کا دوسرا نام ہے۔ "سید القوم خادمهم"

سروری در دین ما خدمت گری است — عدلِ فاروقی، و فقرِ حیدری است

اگر سیادت وامارت کے لئے پوری سختی کے ساتھ یہ معیار قائم کر دیا جائے، اور ہر شخص کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس ہو، تو پھر دیکھئے کہ اس کے کتنے خواہشمند اور دعویدار پیدا ہوتے ہیں اپنا جگر خون کرنے، اپنے عیش وآرام کو خیرباد کہنے اور اپنے جان ومال کو ایک اعلیٰ نصب العین پر قربان

کرنے کے لئے کون آگے بڑھتا ہے۔ خلفائے راشدین کی طرح اگر احساسِ ذمہ داری ہو، جو راتوں کی نیند اپنے پر حرام کرکے، رعایا کی خبر گیری اور اُن کے درد اور دکھ میں شریک ہونے کے لئے راتوں کو گشت کیا کرتے تھے۔ بیت المال سے اگر ایک اونٹ گم ہو جاتا تو عین دوپہر کی سخت دھوپ میں خود تلاش کرتے پھرتے۔ اگر ملک میں قحط پڑ جاتا تو خود بھی وہی معمولی غذا کھاتے جو عام افرادِ ملک کو اس وقت میسر آرہی ہو، اگرچہ ان کا معدہ اس کو قبول نہ کرتا ہو۔ جو اپنے اخراجات و مصارف حضرت عمرؓ کی طرح اس بے نفسی کے ساتھ قوم کے سامنے پیش کریں کہ مجھے بیت المال سے کتنا لینا چاہیے، دو جوڑے کپڑے، ایک جاڑے اور ایک گرمی کے لئے، ایک سواری جس پر حج و عمرہ ادا کر سکوں، اور قریش کے ایک متوسط الحال آدمی کے اخراجاتِ طعام کے برابر اپنے اور اہل و عیال کے لئے اخراجات طعام، اس کے بعد میں ایک ادنیٰ مسلمان ہوں، جو ان کا حال ہے وہی میرا حال ہے[1]۔ جو اپنے مرضِ موت میں اپنا سارا وظیفہ بیت المال میں اس لئے واپس کر دے کہ جس خدمت کا اس کو یہ معاوضہ ملتا رہا اس کی ذمہ داریوں اور فرائض سے یہ کماحقہٗ عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ ایک روز دورانِ مرض میں حضرت صدیقؓ نے دریافت فرمایا کہ مجھ کو بیت المال سے کل وظیفہ اب تک کتنا ملا ہے، حساب کیا گیا تو چھ ہزار درہم ہوئے۔ ہدایت کی کہ میری فلاں زمین فروخت کرکے بیت المال کا روپیہ واپس دے دیا جائے۔ چنانچہ زمین بیچ کر روپیہ واپس کر دیا گیا۔ آپ نے یہ بھی تحقیقات کی کہ خلافت کے بعد میرے مال میں کیا اضافہ ہوا ہے، معلوم ہوا کہ ایک حبشی غلام ہے، جو بچوں کو کھلاتا اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کی تلواروں کو صیقل بھی کرتا ہے۔ ایک اونٹنی ہے جس پر پانی لایا جاتا ہے، اور ایک سوا روپیہ کی چادر، وصیت کی کہ یہ سب چیزیں خلیفۂ وقت کے پاس پہنچا دی جائیں۔ رحلت کے بعد جب یہ اشیاء حضرت عمرؓ کے پاس آئیں تو ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں، اور کہا کہ اے ابوبکر تم نے اپنے جانشینوں کے واسطے کام بہت دشوار کر دیا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اپنے خطبہ میں خلیفہ اور اہل ملک کے حقوق مالی کی تفصیل اس طرح فرمائی۔ "تمہارے مال کی اور میری مثال ایک یتیم کے مربی کی طرح ہے۔ اگر میں مستغنی ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر محتاج ہوں گا تو حسب دستور کچھ کھانے کو لے لوں گا۔ لوگو! مجھ پر تمہارے چند

[1] طبقات ابن سعد

حقوق ہیں، جن کا تم کو مجھ سے مطالبہ کرنا چاہیئے ۔ مجھ پر تمہارا حق ہے کہ ملک کا خراج اور مال غنیمت بے جا طور سے جمع نہ کروں ۔ مجھ پر تمہارا حق ہے کہ جب میرے ہاتھ تمہارا خراج و غنیمت آئے تو وہ ناجائز خرچ نہ ہو، مجھ پر تمہارا حق ہے کہ میں تمہارے وظائف میں اضافہ کردوں۔"[1]

جذبۂ خدمت گذاری و شیوۂ جاہ طلبی

ان ساری ذمہ داریوں کو اپنے کندھوں پر اٹھانے، اور رعایا کے حقوق کی نگرانیوں کا نام حکومت ہے۔ کسی ایک فرد یا مجموعۂ افراد، جن کے ہاتھوں میں عنانِ اقتدار ہو، ان کی عیش کوشیوں، کام جوئیوں اور نشاط آفرینیوں کا حکومت ذریعہ نہیں ۔ جیسا کہ انسان کی ہوس پرستیاں اور تن آسانیاں اس کو سمجھتی رہی ہیں اور اب تک اسی پر عمل پیرا ہیں، خواہ اس کا رنگ شخصی ہو یا جمہوری، یا اشتراکی۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، تو پھر طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

صرف ناموں کے بدل جانے سے اصل حقیقت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ اقبال نے بالکل سچ کہا ہے۔

ہے وہی سازِ کہن، مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے، یہ آزادی کی ہے نیلم پری

گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

کیوں ایک صدر حکومت یا اس کی مشینری کے ارکان ایک متوسط الحال اہلِ ملک سے زیادہ عیش و تنعم کی زندگی گذاریں ۔ یہ ظاہری طمطراق، بیش قرار مشاہرات، عالی شان محلات، لذیذ و مرغن اغذیات، اور دیگر سینکڑوں شان و تمکنت کے سروسامان کیا حکومت کے لئے ناگزیر ہیں؟ کیا ان کے بغیر حکمرانی نہیں کی جا سکتی؟ کیا رعب و داب حکومت بدون ان لوازمات کے برقرار نہیں رہ سکتا؟ یہاں حضرت عمر کے اس واقعہ کی یاد اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے جب کسریٰ کا سفیر آپ سے

[1] کتاب الخراج، (قاضی ابو یوسف)

ملنے آیا تھا اور آپ ایک درخت کے سایہ تلے فرشِ خاک پر محو استراحت تھے۔ جوں ہی اس کی نظر دنیا کے اس انسان پر پڑی جس کی ہیبت و جبروت سے تختِ قیصر و کسریٰ لرز رہے تھے، دم بخود ہو کر رہ گیا اور اپنے اوسان میں اس وقت تک نہ آیا، جب تک کہ اس کی ہر طرح پر تسلی نہ کردی گئی۔ مولانا روم نے اپنی مشہور مثنوی میں اس کو نظم کیا ہے، جس کا ایک شعر یہ ہے :-

ہیبتِ حق است، ایں از خلق نیست ہیبتِ ایں مردِ صاحبِ دلق نیست

حقیقی رعب و جلال شخصیت اور ذاتی قابلیت کا ہوتا ہے جس کے پیچھے صداقت کارفرما ہوتی ہے، یہ عظمت و کبریائی کی جھوٹی نمائشیں جسم کو تو ڈرا سکتی ہیں مگر دل پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

حکمراں کی حیثیت ایک امین کی سی ہوتی ہے۔ وہ ان امانتوں کو اس کے حق داروں تک پہنچاتا ہے، جو اس کے تفویض کی گئی ہیں۔ اس کی حیثیت ایک ریوڑ کے رکھوالی کی سی ہوتی ہے جس کی دیکھ بھال اس کے اصل مالک نے چند روز کے لئے اس کے ذمہ سونپی ہو۔ کیا ایسے اُجرت پر کام کرنے والے ملازم گلہ بان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان بھیڑوں کے گوشت و خون سے اپنی تن پروری کرتا رہے۔ جیسا کہ میں بارہا کہتا آیا ہوں کہ سیادت بجز خدمت گذاری کے اور کوئی دوسری چیز نہیں۔ جو شخص حکومت کی ان ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ پوری کرے گا، وہ حکمرانی اور سیادت کا اصلی حقدار ہوگا، نہ کہ وہ جو جاہ طلب اور اقتدار پرست ہو۔ اگر آج یہ ترغیبات، امتیازات، اور لوازمات حکومت سے علیحدہ کردیئے جائیں تو کتنے ملک و قوم کی خدمت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے خود کو ان منصبوں کے لئے پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام خلیفہ کے لئے بیت المال سے کسی مالی تفوق و برتری، یا ضروریاتِ زندگی میں عام افرادِ ملک سے کسی قسم کی فضیلت و امتیاز کا روادار نہیں۔ جب ترغیب و تحریص کی ان تمام چیزوں کا سرے سے خاتمہ کردیا جائے گا تو یقیناً ان خدمات کے لئے ایسے پاکیزہ نفس، بلند کردار، اور بے لوث خدمت گذار ہاتھ آئیں گے جن سے ملک و قوم کو خوش حالی و ترقی نصیب ہوگی۔

حکومت کے فرائض | حکومت کا یہ اولین فرض ہے کہ کسی شہری کو بنیادی ضروریات سے محروم نہ ہونے

دے اسی غرض سے اسلام میں زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔ جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں میں تقسیم کر دی جائے گی"۔ ایک دوسری حدیث میں حضورؐ کا فرمان ہے کہ حکومت ہر اس شخص کی ولی (دستگیر و مددگار) ہے، جس کا کوئی ولی نہ ہو۔ ایک اور مقام پر اس کی ان الفاظ میں وضاحت فرمائی گئی ہے، "جس مرنے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار، مثلاً قرض یا بے سہارا کنبہ، چھوڑا ہو وہ ہمارے ذمہ ہے۔

اس معاملہ میں اسلام مسلمانوں اور ذمیوں میں بھی کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ کسی ذمی کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا۔ اس کا وظیفہ بیت المال سے مقرر فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ خدا کی قسم ہم نے اس کے ساتھ انصاف نہ کیا کہ جوانی میں اس سے فائدہ اُٹھایا اور بڑھاپے میں اُس کے حال پر چھوڑ دیا یہ معاشی د معاشری عدل و انصاف کی چند مثالیں تھیں جن کی بنا اسلام کے اصولِ مساوات ہیں۔

آزادیِ ضمیر و رائے | آزادیِ ضمیر و رائے کا یہ عالم تھا کہ مملکت کا ایک معمولی فرد خلیفہ کو برسرِ محفل ٹوک دیتا تھا، اور اس کا حکم ماننے سے اس وقت تک انکار کرتا تھا جب تک کہ وہ اس کے عائد کردہ الزام سے اپنی بریت ثابت نہ کر دے۔ ایک مرتبہ مالِ غنیمت میں چند چادریں آئیں اور سب کو مساوی طور پر تقسیم کر دی گئیں۔ حضرت عمرؓ دراز قامت تھے کسی طرح اس مختصر پارچہ میں ان کا کرتہ تیار نہ ہو سکتا تھا۔ خطبہ کے وقت اسی کپڑے کا کرتہ آپ زیبِ تن کئے کچھ احکام صادر فرما رہے تھے۔ ایک شخص نے اُٹھ کر اعتراض کیا کہ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ آپ کو یہ پارچہ زائد کس طرح ملا ہے ہم حکم ماننے کے لئے تیار نہیں شبلی نے اس تاریخی واقعہ کو نہایت مؤثر انداز میں نظم کیا ہے، جس کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں:۔

ایک دن حضرت فاروقؓ نے منبر پہ کہا — میں تمہیں حکم جو کچھ دوں تو کروگے منظور

ایک نے اُٹھ کے کہا یہ کہ نہ مانیں گے کبھی — کہ ترے عدل میں ہم کو نظر آتا ہے فتور

چادریں مالِ غنیمت میں جو اب کے آئیں — صحنِ مسجد میں وہ تقسیم ہوئیں سب کے حضور

ان میں ہر ایک کے حصہ میں فقط اک آئی | تھا تمہارا بھی وہی حق کہ یہی ہے دستور
اب جو یہ جسم پہ تیرے نظر آتا ہے لباس | یہ اسی لوٹ کی چادر سے بنا ہوگا ضرور
مختصر تھی وہ ردا، اور ترا قد ہے دراز | ایک چادر میں ترا جسم نہ ہوگا مستور
اپنے حصہ سے زیادہ جو لیا تو نے تو اب | تو خلافت کے نہ قابل ہے نہ ہم ہیں مامور
گرچہ وہ حد مناسب سے بڑھا جاتا تھا | سب کے سب مہر بہ لب تھے پئے اثبات قصور
روک دے کوئی کسی کو یہ نہ رکھتا تھا مجال | نشۂ عدل و مساوات سے تھے سب مخمور
اپنے فرزند سے فاروق معظم نے کہا | تم کو ہے حالتِ اصلی کی حقیقت پہ عبور
تمہیں دے سکتے ہو اس کا مری جانب سے جواب | کہ نہ پکڑے مجھے محشر میں مرا رب غفور
بولے یہ ابن عمر سب سے مخاطب ہو کر | اس میں کچھ والد ماجد کا نہیں جرم و قصور
ایک چادر میں جو پورا نہ ہوا ان کا لباس | کر سکی اس کو گوارا نہ مری طبع غیور
اپنے حصہ کی بھی میں نے انھیں چادر دے دی | واقعہ کی یہ حقیقت ہے کہ جو تھی مستور

نکتہ چیں نے یہ کہا اُٹھ کے، کہ ہاں اے فاروق
حکم دے ہم کو، کہ اب ہم اسے مانیں گے ضرور

اپنی خلافت کے عین عروج و شباب میں جب کہ قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج آپ کے قدموں تلے روندے جا رہے تھے، منبر پر تشریف فرما ہوئے، اور عام مسلمانوں کی جرأت و صداقت کا اندازہ لگانے کے لئے یہ ارشاد فرمایا، اے گروہ حاضرین اگر میں دنیا کی طرف مائل ہو جاؤں تو تم مجھ سے کیا سلوک کروگے۔ ایک شخص نے تلوار سونت لی اور کہا ہم اس سے تمہاری اصلاح کریں گے، آپ نے فرمایا کیا تم میرا سر قلم کردوگے، اس نے کہا ہاں، اگر تم راہِ راست پر نہ آؤ تو تمہارے ساتھ یہی عمل کیا جائے گا۔ آپ تحکمانہ انداز میں اس کو خوب ڈانٹتے رہے اور وہ بھی بلاخوف ترکی بہ ترکی جواب دیتا رہا۔ جب آپ کو اس کا یقین ہو گیا کہ یہ اپنے اظہار میں جھوٹی نمائش سے کام نہیں لے رہا ہے تو آپ کی زبان پر حمد و ثنا جاری ہو گئی اور ان الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ میری رعیت میں

ایسے لوگ موجود ہیں کہ اگر میں کج رو ہو جاؤں تو وہ نہ صرف مجھے درست کر سکتے ہیں بلکہ ایسوں کے وجود ہی سے اسلام کو پاک کر سکتے ہیں۔

حضرت عمر نے جب چاہا کہ مہر کا تعین کر دیں تاکہ لوگ اس معاملہ میں مبالغہ سے کام نہ لیں تو ایک بوڑھی عورت اٹھ کھڑی ہوئی اور آپ کو مخاطب کر کے یہ کہا اے عمر! اللہ سے ڈر، تجھ کو کیا حق حاصل ہے کہ ہماری حق تلفی کرے جب کہ خود خدا نے اس کی مقدار متعین نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ عورتوں کو ان کے مہر میں حسب استطاعت جتنا چاہے دے سکتے ہو۔ یہ سن کر آپ اپنے اس ارادہ سے باز رہے کہ آج عمر پر ایک عجوزہ نے فتح پائی اور اس کی غلطی سے اسے آگاہ کیا۔

تقسیم اراضی شام و عراق کی بابت جب اختلاف آرا ہوا تو حضرت عمر فاروق نے ایک خطبہ دیا اور یہ فرمایا، میرا ہرگز یہ منشا نہیں کہ تم میری خواہش کا اتباع کرو، کیوں کہ میں تم ہی میں کا ایک شخص ہوں اور تمہارے برابر، تمہارے سامنے اللہ کی کتاب موجود ہے جو ناطق بالحق ہے۔ واللہ اس معاملہ میں میں نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس امر حق کی طرف مراجعت کی ہے جس کا ثبوت آیت، وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ سے ملتا ہے۔ تقسیم اراضی مفتوحہ کے تمام صحابہ موئد تھے۔ صرف حضرت عمر، عثمان، علی و طلحہ اس کے مخالف تھے۔ جب خلیفہ وقت نے اس آیت سے استدلال فرمایا تو سب نے تقسیم نہ کرنے کی رائے کو تسلیم کر لیا۔

خلفا کا طریق شوریٰ پر عمل | زہری روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر اپنی مجلس شوریٰ میں نوجوانوں اور بوڑھوں سب کو جمع کرتے تھے۔ بسا اوقات آپ ان سے مشورہ کیا کرتے اور یہ فرمایا کرتے کہ علم نہ بوڑھوں کا حصہ ہے اور نہ جوانوں کا مگر اللہ جس کے سینہ کو چاہتا ہے اس کے لئے کھول دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس جو نہایت کم سن تھے، حضرت عمر ان کی اصابت رائے کے سبب ان کو ہر مجلس میں شریک فرماتے۔ یہ اپنی کم سنی کے سبب کبھی پس و پیش کرتے تو آپ ان کی ہر طرح حوصلہ افزائی فرماتے۔ یہاں فطری عقل و ذہانت دیکھی جاتی تھی، ایسے نااہلوں کو یہاں بار نہ ملتا تھا، جو اپنی دولت و ثروت کے زور پر قوم کی نمائندگی کرتے ہیں، جو آج کل کی جمہوریتوں کی ایک عام خصوصیت ہے۔

متاعِ معنیِ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی | ز موراں شوخیِ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری، غلامِ پختہ کارے شو | کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

عہدِ خلافتِ راشدہ میں جن اہم معاملات کے تصفیہ کے لئے شوریٰ کے تاریخی اجلاس ہوئے، وہ مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) شورائے سقیفۂ بنی ساعدہ (سنہ ۱۱ ہجری) ریاستِ عامہ کے پہلے صدر کا انتخاب اسی شوریٰ میں ہوا۔

(۲) شورائے جیشِ اسامہ (سنہ ۱۱ ہجری) پیغمبرِ اسلام نے اپنے آخری لمحات میں جلیل القدر صحابہؓ کا ایک لشکر ایک انیس سالہ نوجوان کے زیرِ سرکردگی ترتیب دیا تھا۔ وصالِ مبارک کے بعد خلیفۂ اول حکمِ نبوی کی تعمیل میں اس کو روانہ کرنا چاہتے تھے۔ اس رائے پر غور کے لئے یہ شوریٰ منعقد ہوا تھا۔

(۳) شورائے مانعینِ زکوٰۃ (سنہ ۱۱ ہجری) صدیقِ اکبر نے بحیثیت صدرِ حکومت اس معاملہ کے قابلِ بحث پہلوؤں کو رائے عامہ کے سامنے رکھا۔

(۴) دوسرا انتخابی شوریٰ (سنہ ۱۳ ہجری) خلیفۂ اول نے مرضِ موت میں اپنے جانشین کے انتخاب کے لئے مجلسِ حکومت سے مشورہ کیا اور اس کے بعد عام مسلمانوں سے منظوری حاصل کی۔

(۵) شورائے محاذِ عراق (سنہ ۱۳ ہجری) عراق پر دوسری فوجی مہم روانہ کرنے کے لئے خلیفۂ وقت نے اس میں مشورت کی۔

(۶) شورائے میثاقِ بیت المقدس (سنہ ۱۵ ہجری) اہالیانِ بیت المقدس کی تمنا تھی کہ خود خلیفۂ وقت تشریف لاکر شرائطِ صلح طے کریں۔ فاروقِ اعظم نے اس روانگی کو رائے عامہ کے فیصلہ پر موقوف رکھا اور اس کے لئے شوریٰ طلب فرمایا۔

(۷) شورائے محاصل و تقسیمِ اراضیِ شام و عراق (سنہ ۱۶ ہجری) یہ شوریٰ عراق و شام کی مفتوحہ زمینوں کی بابت ہوا تھا کہ آیا یہ تقسیم کی جائیں یا ان کا محاصل بیت المال میں جمع کیا جاتے اور مفتوحہ اراضی کو حکومت کی ملک قرار دیا جائے۔

(۸) عراق پر عام لشکر کشی کی بابت شوریٰ (۲۱ھ ہجری) حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ ایران پر آئے دن کی لشکر کشیوں اور بغاوتوں کا ہمیشہ کے لئے سدِّباب ہو جائے۔ اس غرض کے لئے ایک زبردست لشکر تیار کیا گیا۔ جس کی عام قیادت خود کرنا چاہتے تھے۔ ان ہی امور پر غور کرنے کے لئے یہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔

(۹) تیسرا انتخابی شوریٰ (۲۳ھ ہجری) خلافت کے لئے مقررہ چھ اصحاب میں سے کسی ایک کا انتخاب اور اس کے لئے رائے عامہ سے استصواب۔

(۱۰) شورائے انتخاب چہارم (۳۵ھ ہجری) حضرت علیؓ کے انتخاب کے لئے مہاجرین وانصار کا اجماع اور اہل مدینہ سے استصواب۔

یوں تو حکومت کے ہر معاملہ میں اصحابِ درولبست سے مشورہ لیا جاتا تھا، یہ ان میں سے چند اہم تاریخی اجلاس تھے جو بطور مثال پیش کئے گئے۔ بعض لوگ واقعات کے تمام پہلوؤں پر نظر نہ رکھنے کے سبب خلافت کو ایک نوع سے آمریت کے رنگ میں پیش کرنا چاہتے ہیں اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے دورِ خلافت کے چند واقعات کو پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان کے اس دعوے کی کل کائنات جیشِ اسامہ کی روانگی، مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد، خلیفۂ ثانی کی نامزدگی، اور مفتوحہ علاقوں کو فوج میں تقسیم نہ کرنا ہے۔ ان تمام واقعات کی صورت یہ تھی کہ یہ مسائل مجلس شوریٰ میں پیش کئے گئے تھے اور ان پر بحث مباحثہ کے بعد، جس میں خلیفہ کی صرف ایک رائے ایسی تھی جو سب سے منفرد اور علیحدہ تھی، لیکن جب خلیفہ نے کتاب وسنت اور اپنی قوتِ استدلال سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ حق پر ہے، تو سب نے اس کو تسلیم کر لیا اور متفقہ طور پر اس کی منظوری دے دی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بادی النظر میں انسان کے پیش نظر کسی مسئلہ کے تمام پہلو نہیں ہوتے، تو وہ اصل حقیقت کے فہم وادراک سے قاصر رہتا ہے، لیکن جب اس کا ہر گوشہ اس کی نظروں میں اجاگر ہو جاتا ہے تو وہ حق کے ظاہر ہونے کے بعد اپنی سابقہ رائے سے رجوع کر لیتا ہے۔ حق پرستوں کا ہمیشہ سے یہی شیوہ رہا ہے یہاں کٹ حجتی اور اپنی بات کی پیچ تو تھی نہیں کہ حقیقت کے

انکشاف کے بعد بھی اپنے خیال پر جھوٹی شان دکھانے کے لئے اڑے رہیں۔ ان واقعات میں اگرچہ اولاً خلیفہ اپنی رائے میں یکہ و تنہا تھا، اور اس وقت اس کی رائے کی حیثیت محض ایک تجویز کی سی تھی لیکن جب اس نے دلائل سے اس کو ثابت کر دیا تو مخالف رائے رکھنے والوں نے اس سے اتفاق کر لیا اور سب کی تائید سے یہ فیصلہ صادر ہوا کیا مطلق العنانی اور آمریت کو ذرا بھی اس میں دخل ہے۔

"کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا"

اسلام میں اہل ذمہ کے حقوق | اپنے ہم قوموں اور ہم مذہبوں کے ساتھ مساوات و برابری کا سلوک اتنا دشوار نہیں جتنا غیروں کے ساتھ اس پر عمل کرنا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے اسلام جو مساوات و اخوت کی تعلیم دیتا ہے وہ غیر مذہب والوں کو کیا حقوق عطا کرتا ہے، جو کسی اسلامی مملکت کی رعیت ہوں۔ آنحضرتؐ نے جن غیر قوموں پر جزیہ عائد فرمایا تھا، ان کو تحریر کے ذریعہ مفصلۂ ذیل حقوق عطا کئے گئے تھے۔

(۱) کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا تو اس کی مدافعت کی جائے گی۔

(۲) ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا۔

(۳) ان کی جان، مال، زمین اور کاروانِ تجارت محفوظ رہیں گے۔

(۴) پادری، رہبان، گرجوں کے پجاری اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کئے جائیں گے۔

(۵) پہلے سے ان کا جو مذہب و عقیدہ ہے وہ بدلوایا نہیں جائے گا۔

(۶) ان کا کوئی حق جو پہلے سے انھیں حاصل تھا وہ زائل نہیں ہو گا۔

اسلام قصاص کے معاملہ میں بھی غیر مذہب والوں کو مسلمانوں کے برابر رکھتا ہے یہ ایسا حق ہے جو بہت کم قومیں اپنے محکوموں کو دیتی ہیں۔ کیا یہ تاریخ کے حقائق اور بایں دعوئ تہذیب و تمدن دورِ حاضر کے واقعات نہیں ہیں کہ ایک حاکم قوم کے فرد کے عوض میں سینکڑوں محکوموں کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دیا گیا۔ اسلام کی رواداری و نصفت شعاری کا اندازہ ان واقعات سے کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اسلام کس بلند مقام پر انسانیت کو پہنچانا چاہتا ہے۔ قبیلہ بکر بن وائل کے

ایک مسلمان نے ایک یہودی کو مار ڈالا۔ حضرت عمر کو اس کی اطلاع دی گئی۔ آپ نے لکھ بھیجا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کے حوالہ کر دیا جائے چنانچہ اس کو انھوں نے قتل کر دیا۔ حضرت علی کے دور خلافت میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا۔ آپ نے قصاص کا حکم دیا۔ جب مقتول کے وارثوں نے آکر عرض کیا کہ ہم نے معاف کر دیا ہے، تو آپ نے فرمایا تم پر کچھ دباؤ تو نہیں ڈالا گیا۔ حضرت علی کے یہ الفاظ مساوات کا کس قدر بلند معیار پیش کرتے ہیں۔ "جو لوگ ذمی ہو چکے ہیں ان کا خون ہمارا خون ہے، اور ان کا خوں بہا ہمارا خوں بہا ہے"۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر کی شہادت کا واقعہ قابل ذکر ہے۔ آپ کے قاتل کا نام فیروز تھا جو مجوسی النسل اور مذہباً عیسائی تھا۔ حضرت عمر کے صاحبزادہ عبید اللہ سے جب لوگوں نے بیان کیا کہ اس سازش میں فیروز کا بیٹا، جُفینہ، اور ہرمزان شریک تھے تو انھوں نے جذبۂ انتقام سے بے قابو ہو کر ان تینوں کو قتل کر ڈالا۔ عبید اللہ اسی وقت گرفتار کر لئے گئے۔ حضرت عثمان کی خلافت میں جو پہلا مقدمہ پیش ہوا وہ یہی واقعہ تھا۔ خلیفہ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ سب کی یہی رائے ہوئی کہ قصاص کا حکم صادر کیا جائے۔ اس معاملہ میں حضرت علی کی بھی یہی رائے تھی۔ لیکن خلیفہ نے بعض مصلحتوں کے مدِ نظر بیت المال سے تینوں کا خوں بہا ادا کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان کی یہ پہلی کمزوری تھی جو اس مقدمہ کے فیصلہ میں ظاہر ہوئی

مال و جائداد کی حفاظت کا یہ عالم تھا کہ جو زمینات ذِمیوں کے قبضہ میں تھیں، انھیں اسی طرح بحال رہنے دیا گیا۔ اسی بنا پر فقہ کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے، جس کو قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اس طرح بیان کیا ہے۔ یعنی امام وقت کو یہ اختیار نہیں کہ ذمیوں سے ان کی زمین چھین لے، وہ زمین ان کی ملک ہے، ان میں نسلؔ بعد نسلِ منتقل ہوتی رہے گی، وہ اس کی بیع و شرا بھی کر سکتے ہیں۔

تصحیح

برہان بابت ستمبر میں آلم صاحب کی جو غزل شایع ہوئی ہے اس کے چھٹے شعر کا دوسرا مصرعہ یوں پڑھا جائے گا

ع گرم رفتارِ وفائے غم کی یہ منزل نہیں۔

تزک بابری

مترجم

(جناب محمد رحیم صاحب دہلوی)

(۲)

عمر شیخ مرزا | فرغانہ کا محصول رعایا پر ظلم وستم کئے بغیر وصول کیا جائے تو اتنی آمدنی میں تین چار ہزار آدمیوں کی گذر بسر ہو سکتی ہے۔ مگر عمر شیخ مرزا بلند ہمت آدمی تھے۔ اور انھیں بڑی سلطنت حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ اس لئے وہ ہمیشہ ملک پر قبضہ جمانے کی فکر میں رہتے تھے۔ انھوں نے کئی مرتبہ سمرقند پر چڑھائی کی۔ مگر بعض دفعہ ہار ماننی پڑی اور بعض دفعہ یوں ہی ناکام لوٹے۔

یونس خاں | عمر شیخ مرزا کئی دفعہ اپنے خسر یونس خاں کو (جو چنگیز خاں کے دوسرے بیٹے چغتائی خاں کی نسل میں سے تھے اور اُس وقت سلطنت چغتائیہ میں مغلوں کے سردار تھے اور میرے نانا ہوتے تھے) التجا کر کے اپنی کمک کے لئے لائے۔ اور ہر دفعہ اپنے علاقہ میں سے تھوڑا سا علاقہ اُنھیں دیا۔ مگر عمر شیخ مرزا کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ یونس خاں کبھی تو عمر شیخ مرزا کے ناروا سلوک کی وجہ سے اور کبھی مغلوں کی سرکشی کے سبب[ل] اس ملک میں نہ ٹھیر سکے اور مغلستان واپس چلے گئے۔

آخری دفعہ جو انھیں بلایا تو اس زمانے میں تاشقند عمر شیخ مرزا کے قبضہ میں تھا۔ (ایرانی کتابوں میں اس کو کسی نے شاش اور کسی نے چاچ لکھا ہے۔ اور اسی لئے وہ کمان چاچی مشہور ہے) انھوں نے تاشقند بھی خاں کو دے ڈالا۔ اس زمانے سے ۹۰۸ھ ۳-۱۵۰۲ء تک تاشقند اور شاہرخیہ خوانین چغتائیہ کے قبضہ و تصرف میں رہے۔

[ل] یعنی یونس خاں کو اپنے ہی لشکر کی سرکشی کے سبب واپس ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔

والد کی وفات | وہ زمانہ ہے کہ یونس خاں کے بڑے بیٹے سلطان محمود خاں میرے ماموں مغلستان کے حاکم ہیں اور سلطان احمد مرزا (عمر شیخ مرزا کے بڑے بھائی) سمرقند کے بادشاہ ہیں۔ عمر شیخ مرزا نے اپنی داؤں بازیوں سے انھیں بگاڑ ڈالا تھا۔ اس لئے وہ دونوں آپس میں مل گئے۔ سلطان احمد مرزا نے دریائے خجند کے جنوب کی طرف سے اور سلطان محمود خاں نے شمال کی جانب سے ان پر حملہ کر دیا[1]۔ اسی دوران میں عمر شیخ مرزا کو عجیب حادثہ پیش آیا۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ آخشی کا قلعہ پہاڑ کی اونچائی پر بنا ہوا ہے۔ اس میں مکانات بھی کنارے پر تھے۔ اسی عرصہ میں پیر کے دن رمضان کی چوتھی تاریخ (۲/جون ۱۴۹۴ء[2]) ایکا ایکی اوپر سے کبوتر خانہ گرا۔ مرزا بھی کبوتروں سمیت گرے۔ اور انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر انتالیس برس تھی۔

حسب نسب | عمر شیخ مرزا ۸۶۰ھ ہجری میں سمرقند میں پیدا ہوئے۔ وہ سلطان ابو سعید مرزا کے چوتھے بیٹے تھے۔

وہ سلطان احمد مرزا، سلطان محمد مرزا اور سلطان محمود مرزا سے چھوٹے تھے۔
سلطان ابو سعید مرزا، سلطان محمد مرزا کے بیٹے تھے۔
سلطان محمد مرزا سلطان میراں شاہ مرزا کے فرزند تھے۔
اور میراں شاہ مرزا حضرت امیر تیمور گورگانی کے سنجھلے صاحبزادے تھے۔
عمر شیخ مرزا سے چھوٹے جہانگیر مرزا اور شاہرخ مرزا تھے۔

سلطان ابو سعید مرزا نے عمر شیخ مرزا کو پہلے پہل تو کابل دیا۔ اور بابا کابلی کو ان کا مدارالمہام بنا کر ساتھ بھیجا۔ پھر بیٹوں کے ختنوں کی شادی[3] میں شریک کرنے کے لئے انھیں درہ گز[4] کے مقام سے سمرقند واپس بلا لیا۔ اور اس تقریب کے بعد اس مناسبت سے کہ امیر تیمور نے

[1] یہ حملہ ۸۹۹ھ ہجری میں کیا گیا تھا [2] عمر شیخ مرزا نے [3] یہ تقریب ۸۷۰ھ ۱۴۶۵ء میں ہوئی تھی۔ ابو سعید مرزا نے اپنے بیٹوں کے ختنے کرائے تھے۔ پانچ چھ مہینے تک اس شادی کی تقریبات نہایت دھوم دھام سے منائی جاتی رہیں [4] یہ گھاٹی بلخ کے جنوب میں دریائے دہاس یا بلخاب کے قریب واقع ہے۔

اپنے بیٹے عمر شیخ مرزا کو فرغانہ عطا کیا تھا۔ ابوسعید مرزا نے ان کو اندجان دیا۔ اور تیمور تاش کو ان کا مدار المہام بنایا۔

وضع قطع | ٹھگنا قد تھا۔ چہرہ پر سرخی تھی۔ ڈاڑھی رکھتے تھے۔ بدن بھاری تھا اور مزاج کے ذرا چالاک تھے۔ بہت چست لباس پہنتے تھے۔ حد یہ ہے کہ پٹی باندھتے تو پیٹ سکیڑ لیتے تھے۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ پٹی باندھنے کے بعد پیٹ ابھرا، یا سانس لیا تو پٹی ٹوٹ جاتی تھی۔ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں تکلف کو پسند نہ کرتے تھے۔ دستار پیچ کی وضع کی پگڑی باندھتے تھے۔ اس زمانے میں چار پیچ کی پگڑی دستار پیچ ہوتی تھی۔ وہ چین کے بغیر باندھتے اور شملہ چھوڑ دیتے تھے۔ گرمیوں کے زمانے میں دربار کے سوا مغلی ٹوپی اوڑھا کرتے تھے۔

اخلاق وعادات | حنفی مذہب اور خوش اعتقاد آدمی تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ قضائے عمری سب کی سب ادا کر دی تھیں۔ قرآن شریف اکثر و بیشتر پڑھتے رہتے تھے حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے مرید تھے۔ اور اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ صاحب بھی ان کو فرزند فرمایا کرتے تھے۔

علم وادب | وہ خاصے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ خمستین، مثنوی اور تاریخ کی کتابیں ان کی نظر سے گذر چکی تھیں شاہنامہ بہت دیکھتے تھے۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ مگر شاعری پر توجہ نہ کی۔

انصاف پروری | منتظم اس کمال کے تھے کہ ایک دفعہ خطا کا کوئی قافلہ اندجان آرہا تھا جب مشرقی کوہستان کے قریب پہنچا۔ تو ایسی بلا کی برف پڑی کہ سوائے دو آدمیوں کے قافلے کے سارے آدمی مر گئے۔ اس خبر کے سنتے ہی اپنے ملازمین کو بھیج کر تمام مال واسباب جمع کرا لیا۔ حالاں کہ اس مال کے وارث موجود نہ تھے۔ اور نہ کوئی اس کا دعوی دار تھا۔ پھر بھی اس تمام مال و اسباب کو بڑی حفاظت سے رکھوایا۔ اور دو ایک سال بعد خراسان اور سمرقند سے مرنے والوں کے وارثوں کو بلوا کر تمام مال واسباب ان کے حوالے کر دیا[1]

---

[1] انگریز مورخ اس واقعہ کو بابر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور وہ پاکستانی اور ہندوستانی مورخین بھی جو انگریزی تاریخوں سے سند لیتے ہیں اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

سخاوت اور بہادری | وہ بہت سخی آدمی تھے اور ایسی ہی اچھی اور بھی خصلتیں تھیں۔ خوش مزاج، فصیح مقرر، شیریں زبان اور بہادر۔۔۔۔ تھے۔ دو دفعہ فوج سے آگے نکل کر تن تنہا شمشیر زنی کی تھی۔ ایک دفعہ آخشی کے دروازہ پر اور دوسری دفعہ شاہرخیہ کے دروازے میں۔

وہ اوسط درجہ کے تیر انداز تھے۔ لیکن گھونسہ ایسا زبردست مارتے تھے کہ چوٹ کھانے والا یقینی طور پر گر پڑتا تھا۔

شراب و کباب | ملک گیری کے شوق کے سبب بہت سے دوستوں سے ٹھن گئی تھی اور بہت سے لوگ ان سے کھٹک گئے تھے۔ شروع شروع میں بڑے بھاری شرابی تھے۔ پھر ہفتہ میں دو ایک دفعہ شراب کے جلسے اڑنے لگے۔ خوش صحبت آدمی تھے۔ ایسے جلسوں میں مناسب و موزوں اشعار پڑھا کرتے تھے۔ آخر میں معجون[1] بہت کھانے لگے اور معجون نے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا کر دیا۔ ہمیشہ چوسر کھیلتے رہتے تھے۔ مگر کبھی کبھار جوئے کا پھڑ بھی جم جاتا تھا۔

پہلی لڑائی | وہ تین لڑائیاں لڑے ہیں۔ پہلی لڑائی یونس خاں سے ہوئی۔ وہ اندجان کے شمال میں دریائے سیحون کے کنارے اس جگہ ہوئی جسے سکر تکہ[2] کہتے ہیں اس میں وہ ہارے اور پکڑے گئے۔[3]

اس مقام کا یہ نام اس لئے پڑ گیا کہ پہاڑ سے جو دریا بہتا ہوا آتا ہے۔ وہ یہاں آکر سکڑا ہوا ہے، کہتے ہیں کہ ایک دفعہ تکہ یعنی پہاڑی بکرا اس کنارے سے چھلانگ مار کے اس کنارے پر جا پہنچا تھا

یونس خاں نے انھیں شکست دی۔ اور یہ پکڑے گئے۔ مگر انھوں نے چھوڑ دیا۔

لڑائی چونکہ اس جگہ ہوئی تھی اس لئے اس لڑائی کا نام ہی جنگ تکہ سکر تکو مشہور ہوگیا۔

دوسری لڑائی | دوسری لڑائی ترکستان میں دریائے ارس کے کنارے پر ازبکوں سے ہوئی۔ وہ سمندر کے اریب قریب آکر لوٹ مار کر جاتے تھے۔ والد نے دریا کو جو جم کر برف ہوگیا تھا پار کیا۔ اور انھیں شکست دی۔ جو مال و اسباب اور اونٹ وغیرہ ازبک لوٹ مار کے لائے تھے۔ وہ انھوں

---

[1] غالباً یہ بھنگ کی معجون ہوتی تھی۔ برصغیر پاک و ہند کے نشہ باز بھی اپنی اصطلاح میں اس کو معجون کہتے ہیں۔
[2] پہاڑی بکرے کی چھلانگ [3] اس زمانے میں اس لڑائی کو عظیم حادثہ سمجھا جاتا تھا۔

نے چھین کر ان کے مالکوں کو واپس دے دیئے۔ اس میں سے ذرہ بھر کوئی چیز نہ لی۔

تیسری لڑائی | سلطان احمد مرزا سے ہوئی۔ یہ شاہرخیہ[1] اور اور اتیبہ کے بیچ میں خواص[1] نام کے موضع میں ہوئی تھی اس میں انہیں شکست ہوئی۔

زیر اقتدار ممالک | ان کے قبضہ میں یہ ملک تھے۔

تاشقند اور سیرام ان کے بڑے بھائی سلطان احمد مرزا نے دیئے۔

سلطان ابو سعید مرزا نے فرغانہ کا علاقہ دیا۔

شاہرخیہ کو مکر و فریب سے لے کے کچھ دن تک اس پر بھی قابض رہے۔

آخر میں تاشقند اور شاہرخیاں کے قبضہ سے نکل گئے تھے اور صرف ملک فرغانہ۔ خجند اور اور اتیبہ جن کا اصل نام اسروستہ اور استروس ہے۔ ان کے پاس رہ گئے تھے۔ بعض لوگ خجند کو فرغانہ کے ملک میں شامل نہیں کرتے۔

سلطان احمد مرزا نے جب مغلوں پر چڑھائی کی اور دریائے جرچیق[2] کے کنارے پر مقابلہ ہوا تو شکست ہوئی۔ اور اتیبہ حافظ بیگ دولدائی کے پاس تھا۔ اس نے وہ مرزا کو دے دیا۔ اس دن سے وہ عمر شیخ مرزا کے قبضہ میں رہا۔

ظہیر الدین بابر | ان کی اولاد میں تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں سب سے بڑا بیٹا میں ظہیر الدین بابر ہوں۔ میری ماں قتلق نگار خانم تھیں۔

جہانگیر مرزا | دوسرا بیٹا جہانگیر مرزا تھا۔ وہ مجھ سے دو برس چھوٹا تھا۔ اس کی ماں مغل قوم کے گروہوں کے سرداروں میں سے تھی۔ اس کا نام فاطمہ سلطان تھا۔

ناصر مرزا | تیسرا بیٹا ناصر مرزا تھا۔ اس کی ماں اندجان کی رہنے والی تھی۔ وہ لونڈی تھی اور اس کا نام امیدہ تھا۔ ناصر مرزا مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔

خان زادہ بیگم | سب بیٹیوں میں بڑی بیٹی خان زادہ بیگم میری سگی بہن تھیں۔ وہ مجھ سے پانچ برس بڑی

[1] خواص ضلع اور اتیبہ میں واقع ہے [2] اس کو دریائے خجند بھی کہتے ہیں۔ اور چارچ یا شاس کے نام سے بھی مشہور ہے۔

تھیں۔ جب میں نے سمرقند دوبارہ فتح کیا ہے۔ تو میری فوج کو حالاں کہ سرپل کے مقام پر شکست ہو چکی تھی۔ مگر میں پھر بھی پانچ مہینے تک سمرقند میں محصور رہا۔ مگر جب دور قریب کے بادشاہوں اور امیروں میں سے کسی نے بھی مدد نہ کی تو میں مجبوراً سمرقند چھوڑ کر نکلا۔ اس افراتفری اور نفسا نفسی میں خان زادہ بیگم، محمد شیبانی خاں کے ہاتھ پڑ گئیں شیبانی نے ان سے نکاح کر لیا۔ اس سے ایک بیٹا ہوا۔ اس کا نام خرم شاہ تھا۔ بہت خوبصورت جوان تھا۔ شیبانی خاں نے بلخ کا علاقہ اُسے دے دیا تھا۔ اپنے باپ کی وفات کے دو ایک برس بعد وہ بھی مر گیا۔

جب شاہ اسمٰعیل صفوی نے ازبک کو شکست دی۔ اس وقت خان زادہ بیگم وہیں تھیں میری وجہ سے بادشاہ موصوف ان سے بہت اچھی طرح پیش آئے اور اُنھیں عزت و آبرو کے ساتھ میرے پاس بھیج دیا۔ وہ قندز کے مقام پر آ کر مجھ سے ملیں۔ دس برس تک وہ اور میں جُدا رہے تھے۔ جب میں اور محمدی کوکلتاش ان سے ملنے گئے۔ تو انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے ہمارے یقین دلانے پر بھی فوری طور پر ہمیں نہ پہچانا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پہچان گئیں۔

مہربانو بیگم | دوسری بیٹی مہربانو بیگم تھی۔ وہ ناصر مرزا کی ہم بطن بہن تھی۔ اور مجھ سے دو برس چھوٹی تھی۔

شہربانو بیگم | تیسری بیٹی شہربانو بیگم تھی۔ وہ ناصر مرزا کی دوسری سگی بہن تھی اور مجھ سے آٹھ برس چھوٹی تھی۔

یادگار سلطان بیگم | چوتھی لڑکی یادگار سلطان بیگم جو آغا سلطان لونڈی کے پیٹ سے تھی۔

رقیہ سلطان بیگم | پانچویں اور سب سے چھوٹی لڑکی رقیہ سلطان بیگم تھی۔ وہ مخدومہ سلطان بیگم (عرف قراکوز[1]) کے بطن سے تھی۔

یہ دونوں والد کے مرنے کے بعد پیدا ہوئی تھیں۔ یادگار سلطان بیگم کو میری مانی الیس دولت بیگم نے پالا تھا۔

شیبانی خاں نے جب اخشی[2] اور اندجان فتح کیا۔ تو یادگار سلطان بیگم، حمزہ سلطان

---

[1] قراکوز یعنی سیاہ آنکھیں [2] ۱۵۰۳ء

کے بیٹے مہدی سلطان کے ہاتھ آگئی مگر جب میں نے حمزہ سلطان اور اس کے ساتھیوں کو ختلان کے علاقہ میں شکست دی اور حصار چھین لیا[1] تو اس وقت یادگار سلطان بیگم میرے پاس آگئی تھی

ان ہی لڑائی جھگڑوں میں رقیہ سلطان بیگم، جانی بیگ سلطان کے ہاتھ پڑ گئی۔ اس سے دو ایک لڑکے بھی ہوئے۔ اب سنا ہے اس کا انتقال ہو گیا۔

میری والدہ قتلق نگار خانم | پہلی بیوی قتلق نگار خانم تھیں۔ وہ یونس خاں کی دوسری بیٹی تھیں۔ اور سلطان محمود خاں اور احمد خاں کی بڑی بہن تھیں

میرے نانا یونس خاں | یونس خاں، چغتائی خاں کی نسل میں سے تھے جو چنگیز خاں کا دوسرا بیٹا تھا سلسلۂ نسب اس طرح ہے :۔

یونس خاں بن ویس خاں بن شیر علی اُغلان بن محمد خاں بن خضر خواجہ خاں بن تیمور خاں بن الیس بوغا خاں بن دوا خان[2] بن ملسون[3] توابن موا توکان بن چغتائی خاں بن چنگیز خاں۔

یہاں اس موقعہ پر ان خواتین کا تھوڑا سا حال لکھنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے :۔

یونس خاں اور الیس بوغا خاں دونوں ویس خاں کے بیٹے تھے۔

یونس خاں کی والدہ | یونس خاں کی والدہ ترکن تھیں۔ وہ شیخ نورالدین بیگ کی بیٹی یا پوتی تھیں جو قوم قب چاق کے امیر تھے اُنھیں امیر تیمور نے سردار بنایا تھا۔

خاندانی عداوت | ویس خاں کے انتقال کے بعد مغلوں کا خاندان دو فرقوں میں بٹ گیا۔ چھوٹا فرقہ یونس خاں کی طرف تھا اور بڑا گروہ الیس بوغا کا طرفدار تھا۔

اس سے پہلے الغ بیگ مرزا نے یونس خاں کی بڑی بہن کی شادی عبدالعزیز مرزا سے کر دی تھی۔ اس مناسبت سے امیر نرن (نارین گروہ کا امیر) اور میرک ترکمان (جو جراس[4] کے گروہ کے امراء میں شامل تھا) یونس خاں کو اور مغلوں کے تین چار گھروں[5] کو الغ بیگ مرزا کے پاس لے گئے۔ تاکہ ان سے مدد حاصل کر کے مغل قوم کے سردار بن جائیں۔

---

[1] ۱۵۱۱ء [2] دوا خاں بن براق خاں بن الیس بوغا خاں بن موا توکان [3] خراس [4] تاتاریوں میں قوم کا شمار گھروں اور خیموں کی تعداد سے کیا جاتا تھا۔

زبردست حادثہ | الغ بیگ مرزا نے بے مروتی کی۔ بہت سے لوگوں کو قید کر دیا۔ اور بہت سے لوگوں کو ملک میں اِدھر اُدھر منتشر کر کے پریشانی اور مصیبت میں ڈال دیا۔ اور یونس خاں کو عراق بھیج دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے۔ جو مغلوں کے خاندان میں امیر زادوں کی زبردست تباہی اور عظیم حادثہ کا دور سمجھا جاتا ہے۔

شیراز میں نوکری | یونس خاں ایک برس سے زیادہ تبریز میں رہے۔ اس زمانے میں جہاں شاہ بارانی قراقویلوق[1] وہاں کا بادشاہ تھا۔ یونس خاں وہاں سے شیراز پہنچے۔ شیراز میں شاہرخ مرزا کا دوسرا بیٹا سلطان ابراہیم مرزا حاکم تھا۔ پانچ چھ مہینے بعد ابراہیم مرگیا۔ اور اس کا بیٹا عبداللہ مرزا اس کا جانشین ہوا۔ یونس خاں نے عبداللہ کی نوکری کر لی اور سترہ اٹھارہ برس وہیں رہے۔

جس زمانے میں سلطان الغ بیگ مرزا اور ان کے بیٹوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی اس زمانے میں ایسن بوغا خاں نے موقعہ پاکر فرغانہ کو کند بادام تک برباد کر دیا۔ اور اندجان پر قبضہ کر کے وہاں کے باشندوں کو قید کر دیا۔

مغلستان کی بادشاہت | سلطان ابوسعید مرزا جب بادشاہ ہوئے۔ تو انھوں نے فوج جمع کی اور یانگی[2] سے اس طرف اسیرہ[3] کے مقام پر جو مغلستان میں ہے۔ ایسن بوغا خاں کو کامل شکست دی اور اس کے بعد سلطان ابوسعید مرزا نے ایسن بوغا خاں کے فتنہ و فساد سے محفوظ رہنے کی یہ تدبیر کی۔ کہ یونس خاں کو اس رشتہ کی بنا پر کہ ان کی بڑی بہن عبدالعزیز مرزا کی بیوی تھیں۔ عراق اور خراسان سے بلا کر دعوتیں کیں۔ اور انھیں محبت و مہربانی سے اپنایا۔ اور مغلوں کے خاندان کا سردار بنا کر مغلستان بھیج دیا۔

اس زمانے میں ساغرجی قبیلے کے تمام سردار ایسن بوغا خاں سے کھٹک کر مغلستان چلے گئے تھے۔ یونس خاں ان سے جا ملے۔ ساغرجی قبیلے میں شیر حاجی بیگ ممتاز شخصیت تھی۔ ان کی لڑکی ایسن دولت بیگم سے یونس خاں کی شادی ہوئی اور مغلوں کی رسم کے مطابق یونس خاں اور ایسن دولت بیگم کو سفید نمدے پر بٹھا کر انھیں خان تسلیم کیا گیا۔

یونس خاں کے ہاں ان سے تین بیٹیاں ہوئیں۔

(باقی آئندہ)

[1] قراقویلوق یا قراسلو ترکمان یعنی کالی بھیڑوں والے ترکمان۔ فارس اور بغداد کی تاریخوں میں انھیں اسی نام سے یاد کیا گیا ہے۔

[2] "یاغی" یا "مغلی" [illegible] دریائے سیر کے کنارے ترکستان میں ایک شہر ہے۔ [3] اسیرہ [illegible] تاریخ [illegible] موجود ہے۔ یہ یا [illegible] شمال مشرق کی جانب [illegible] ہے۔

عروج وزوال کے الٰہی قوانین

از

(جناب مولوی محمد تقی صاحب امینی)

(۲)

قرآنی اخلاق کی بنیاد عالمگیر افادیت اور عمومی رحمت پر ہے

اس موقع پر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ قرآن حکیم جس قسم کا اخلاق جماعت میں پیدا کرنا چاہتا ہے اُس کی حیثیت اُس اخلاق جیسی نہیں ہے جو قومی ترقی وسربلندی کے لئے قومی پیمانہ پر اپنایا جاتا ہے جس کا اثر ان کے دائرہ میں نہایت فرحت افزا اور امن بخش ہوتا ہے لیکن دوسری قوموں کے معاملہ میں ایسی وحشت وبربریت کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ روحِ انسانیت پناہ مانگتی ہے۔

بلکہ یہ اخلاق عالمگیر افادیت وعمومی رحمت پر مبنی اور اس نظریہ کے ماتحت ہوتا ہے۔

الخلق کلھم عیال اللہ (حدیث) تمام مخلوق اللہ کی عیال ہیں

الناس کلھم اخوۃ (حدیث) تمام لوگ بھائی بھائی ہیں۔

یہ روحانی تقاضہ کے طور پر اپنایا جاتا ہے اور وہ قومی عصبیت ومنافرت کے طور پر۔

اس کی بنیاد خدا پرستی وروحانی پاکیزگی پر ہے اور اُس کی بنیاد قوم پرستی اور وطن پرستی پر ہے۔

زمانہ کی ستم ظریفی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ "عمرانیات" "اجتماعیات" کے ہر گوشہ اور ہر شوشہ کی بنیاد عصبیت ومنافرت پر رکھی جاتی ہے جس کی بنا پر جو قومیں اپنے معاملات میں حد سے زیادہ شریف وہمدرد نظر آتی ہیں وہی دوسروں کے معاملہ میں خونخوار درندہ سے کم نہیں ثابت ہوتیں۔

لیکن قرآن حکیم ہر اجتماعی و عمرانی مسئلہ کی بُنیاد محبت و مروت۔ بھلائی و ہمدردی احسان وسلوک اور تمام ان "جواہر" پر رکھتا ہے جن سے "انسانیت" نشو و نما پاکر بالیدگی حاصل کرتی ہے جیسا کہ اس کی وضاحت درج ذیل تشریح سے ہوتی ہے

قرآن کی نظر میں پوری دنیا کی آبادی ایک خاندان جیسی ہے | قومی و بین الاقوامی زندگی کا جو بھی معاملہ ہو اجتماعی فلاح و بہبودی کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو جس بات کا حق دار ہو اس کے حق کا اعتراف کیا جائے اور جو چیز جسے ملنی چاہیئے وہ اس کے حوالہ کی جائے اور جس قسم کا بھی فیصلہ ہو عدل و انصاف کے ساتھ کیا جائے۔

اس بارے میں قرآن کا حکم یہ ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ

بے شک اللہ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ جو جس کی امانت ہو اس کے حوالہ کر دیا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔

"امانت" کا لفظ اس موقع پر ہر چھوٹے بڑے حق حتیٰ کہ منصب اور عہدہ تک کو شامل ہے[1]

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ

بے شک اللہ ہر معاملہ میں انصاف کرنے اور سب کے ساتھ احسان و بھلائی کرنے اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے

[1] "امانت" کا لفظ عربی میں نہایت وسیع اور جامع مفہوم رکھتا ہے جیسا کہ اس کی تائید درج ذیل عبارت سے ہوتی ہے ان الامانات جمع امانۃ تعم الحقوق المتعلقۃ بذممھم من حقوق اللہ تعالیٰ وحقوق العباد (روح المعانی) "امانت" کی جمع امانات ہے جو تمام حقوق واجبہ کو شامل ہے خواہ ان کا تعلق اللہ کے حق سے ہو یا بندوں کے حق سے ہو چونکہ خطاب اس موقع پر بالخصوص حکام اور سلطنت کے ذمہ داروں کو ہے اس لئے حکومت کے ہر قسم کے معاملات بدرجہ اولیٰ اس میں شامل ہوں گے حتیٰ کہ منصب اور عہدہ بھی۔

وعلی و امن ذلک تولیۃ المناصب مستحقیھا (روح المعانی ج ۵ ص ۶۲ از مضمون دستور قرآنی۔ "امانات" میں اس کو بھی شمار کیا ہے کہ عہدہ صرف ان کے مستحقین کو دیئے جائیں۔

اور بے حیائی کی باتوں سے ہر طرح کی برائیوں سے
اور ظلم و زیادتی کے کاموں سے روکتا ہے وہ تمہیں
نصیحت کرتا ہے تاکہ سمجھو اور نصیحت پکڑو۔

اس آیت میں تین باتوں کا حکم ہے اور تین ہی باتوں سے روکا گیا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو قرآنی زندگی کا پورا نقشہ سامنے جاتا ہے۔

عدل تمام محاسنِ اعمال کی اصل اور بنیاد ہے لیکن اس کے بعد احسان کا لفظ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ معاملہ صرف عدل ہی پر نہیں ختم ہو جاتا بلکہ اس کے ساتھ "احسان" بھی ہونا چاہیئے۔

پھر قرابت داروں کا ذکر جس طرح انھیں خصوصی توجہ کا مستحق ٹھہراتا ہے اسی طرح عدل و احسان سے ملی ہوئی "پالسی" کے نفاذ کے لئے پوری دنیا کو قرابت داری میں سمیٹ کر رکھ دیتا ہے۔

یعنی قرابت داروں کے معاملہ میں جس طرح محبت و مروت، حمیت و غیرت کے ملے جلے جذبات ہوتے ہیں کہ ان کی بعض ناعاقبت اندیشیوں کی بنا پر حسنِ سلوک کا ارادہ نہ ہونے کے باوجود انسان کرنے پر مجبور ہوتا ہے اسی طرح قرآن کی نظر میں دنیا کے تمام انسان ایک گھرانے کے مختلف افراد ہیں، انسانیت ان کی نسل اور کرۂ زمین ان کا وطن ہے لہٰذا ان کے ساتھ سلوک اور برتاؤ میں وہی جذبہ ہونا چاہیئے جو ایک خاندان کے افراد میں ہوتا ہے۔

آیت میں برائیوں کی جن تین قسموں کا تذکرہ ہے ان میں قوۃ بہیمیہ، قوۃ وہمیہ اور قوۃ غضبیہ کی پیدا کی ہوئی تمام برائیوں، نامعقول باتوں اور ہمہ قسم کی زیادتیوں کا ذکر آگیا ہے جو زندگی کے کسی گوشہ اور کسی شکل میں کی جاسکتی ہوں۔

غور کیجئے۔ قرآن نے "انسانیت" کی "ارتقا" کے لئے کس قسم کی شاہراہ کھولی ہے؟ نیز یہ کہ دنیا کے پیش کئے ہوئے نظریۂ ارتقاء کا جواب کس عمدگی کے ساتھ دیا ہے؟

انسانی زندگی کا قرآنی معیار — عالمگیر امن و رحمت پر مبنی ہے

مزید توضیح کے لئے چند آیتیں یہ ہیں۔

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۳/۹۲

تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی محبوب ترین چیزیں اللہ کی راہ میں نہ خرچ کرو

دوسروں کے بھلے اور فائدہ کے لئے عزیز ترین چیز قربان کر دینا "نیکی" ہے اور اسی ایثار و قربانی میں عالمگیر امن و سلامتی مضمر ہے۔

لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۲/۱۷۷

نیکی اور بھلائی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف (چند ظاہری رسموں کو محض ضابطہ کی خانہ پری کرنے کے لئے ادا کر لیے) بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور آخرت کے دن اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں ایثار (دل پسند) مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔

اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے پورا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت خوف و ہراس اور جنگ کے وقت صابر و ثابت قدم رہیں۔ دراصل اسی قسم کے لوگ راستباز اور یہی متقی ہیں۔

قوموں اور ملکوں کے معاملہ میں سب سے زیادہ نازک معاملہ عہد و پیمان کا ہوتا ہے اور اسی ایک اصول پر ٹھیک ٹھیک عمل درآمد ہونے سے کروڑوں کی زندگیاں یاس و حرمان کی چلتی پھرتی تصویریں بن جاتی ہیں لیکن قرآن نے معاہدہ کا کس درجہ تک لحاظ رکھا ہے اس کا اندازہ

درج ذیل آیت سے ہوتا ہے۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ

اگر دین کے بارے میں تم سے مدد چاہیں تو بلاشبہ تم پر ان کی مددگاری لازم ہے البتہ کسی ایسی قوم کے مقابلہ میں مدد چاہی جائے جن سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے تو پھر تم نہیں مدد کر سکتے۔

معاہدہ ہو جانے کے بعد اپنے اور پرائے موافق و مخالف کا کوئی سوال نہیں رہ جاتا خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی نکلے عہد شکنی کی بہر حال اجازت نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں تاریخِ اسلام کی سیکڑوں مثالیں آپ کو ایسی ملیں گی کہ جنہیں دیکھ کر "عقل و خرد" کی دنیا آج تک "انگشت بدنداں" ہے

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ

نیکیوں اور بھلائیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ۔

ہونا تو یہ چاہیئے کہ قوموں اور ملکوں کا آپس میں مقابلہ بقار کے سامان جمع کرنے میں ہو لیکن بد قسمتی سے فنار کے سامان جمع کرنے میں مقابلہ ہو رہا ہے ظاہر ہے کہ اس صورت حال سے شر و فساد کے علاوہ اور کس بات کی توقع ہو سکتی ہے۔

ہاں اگر نیکی و بھلائی کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو پھر دنیا کا رُخ ہی بدل جائے گا اور ناممکن ہے کہ امن و رحمت کی فضار نہ پیدا ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر وہ جم گئے تو انھیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔

ارادہ و اعتقاد و اعمال و اخلاق غرض ہر شے میں پختگی ہو۔ بے عملی اور بے راہ روی کو کسی طرف سے داخل ہونے کا موقع نہ ملے۔ زندگی کی بنیادیں "ایمان" پر مستحکم اور اس کی تعمیر "عمل صالح"

سے ہوئی ہو۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے۔ ۱۰۳/۳

دنیا میں تمام خرابیوں کا سرچشمہ یہ ہے کہ خرابی کو دیکھ کر اسے روکنے اور ختم کرنے کی بجائے اس سے چشم پوشی کی جاتی ہے جس کی بنا پر دن بدن خرابیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔

اس آیت میں اس بات کی تاکید ہے کہ ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت کرتے رہو اور اس راہ میں جب کسی کے قدم ڈگمگائیں تو اس کو صبر و ہمت دلا کر آگے لے چلو۔

یہ چند آیتیں بطور نمونہ کے اس موقع پر پیش کی گئی ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم کس قسم کا کردار بنانا چاہتا ہے اور پھر "بقاء انفع" کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ جو کتاب انسانی کردار کے ڈھالنے کے لئے ایسا سانچہ لے کر آئی ہو اس پر عمل کرنے سے رحمت و عدالت کی فضا نہ پیدا ہو گی تو پھر کس سے ہو گی ؟

(۲) انتخاب فطری اور بقاء اصلح

قوموں کی باہمی کشمکش میں فطرت اسی قوم کو منتخب کرتی ہے جو "اصلح" ہو

اوپر اجمالی طور پر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ قوموں اور جماعتوں کی باہمی کشمکش میں قیام و بقاء کے لئے فطرت اسی کو منتخب کرتی ہے جس میں مقابلۃً مجموعی حیثیت سے افادیت و صلاحیت پائی جاتی ہے اور جس میں یہ دونوں چیزیں نہیں پائی جاتیں وہ چھانٹ دی جاتی ہے۔

یہ اس لئے کہ فطرت کے تقاضے کے مطابق کائنات کے مادی اور معنوی ہر گوشہ میں بناؤ اور سنوار، اصلاح اور تربیت کا کام جاری رہنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر نہ نشو و ارتقاء کا سلسلہ قائم رہ سکتا ہے اور نہ ہی دنیا کا نظام چل سکتا ہے ظاہر ہے کہ یہ صورت اسی وقت ممکن ہے جب کہ غیر صالح (تخریبی سرگرمیوں میں مصروف قوم) کو ہٹا کر صالح (بناؤ اور سنوار

کرنے والی قوم) کو آگے بڑھایا جائے۔

اس سلسلہ کی چند آیتیں یہ ہیں:-

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ	اگر اللہ ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ نہ ہٹاتا
لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ	رہتا تو زمین (دنیا) خراب ہو جاتی لیکن اللہ سب
فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۲۵۱	عالموں کے لئے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔

یعنی یہ اس کا فضل و کرم ہے کہ یہاں کسی قوم اور جماعت کو ایک ہی حالت میں نہیں چھوڑا جاتا ہے بلکہ ہمیشہ قوموں کی آپس میں مزاحمت اور ایک کے ذریعہ دوسرے کی مدافعت کا سلسلہ برابر جاری ہے جس کی بناء پر حق و عدالت اور تعمیری نشو و ارتقا کا کام بند نہیں ہونے پاتا ہے۔

قرآن حکیم کی درج ذیل آیت میں اسی قانونِ فطرت کی طرف اشارہ ہے۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ	اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم
ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۴۷	کو بدل کرلے آئے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

اور اگر کسی قوم و جماعت کو ایک ہی حالت میں چھوڑ دیا جاتا تو ایسی صورت میں یہ بات ناممکن تھی کہ کوئی قوم بھی زیادہ دنوں اپنے ہوش و حواس کی درستگی کے ساتھ نظم و ضبط کا معیار قائم رکھ سکتی بلکہ چند ہی دنوں بعد اس کی تخریبی صلاحیتیں اُبھر کر سامنے آجاتیں اور دنیا ظلم و فساد اور تخریبی سرگرمیوں سے بھر جاتی جس کی بناء پر حق و عدالت اور تعمیری نشو و ارتقاء کا کام رُک جاتا۔

جیسا کہ اس کی تشریح ان آیتوں سے ہوتی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ	اگر اللہ بعض کے ہاتھوں بعض کی مدافعت نہ کراتا
بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ	رہتا تو کسی قوم کی عبادت گاہیں محفوظ نہ رہتیں
وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا	خانقاہیں، گرجے، دوسری قسم کی عبادت گاہیں
اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۲۲	اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا
	ہے وہ سب گرادی جائیں۔ (ادر بالآخر امن د

امان خاک میں مل جاتا)

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۲۳/۷۱

اگر "حق" لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرتا تو زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے یک قلم زیر و برہم ہو جاتا۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قوموں کی باہمی کشمکش اور پھر ایک کے ذریعہ دوسری کی مدافعت ہی کی بدولت دنیا میں نشو و ارتقار کا موجودہ نظام قائم ہے

نظریہ بقار اصلح قرآن حکیم میں | اب ہم قرآن حکیم کی روشنی میں نظریہ "بقار اصلح" کو بیان کرتے ہیں جس سے اس حقیقت کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔

یوں تو اکثر و بیشتر آیات میں اس کا تذکرہ ملتا ہے لیکن مندرجہ ذیل سورت اس بارے میں بہت واضح اور عام فہم ہے اس لئے یہاں ہم اسی کو مرکزی حیثیت دے کر مسئلہ کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۱۰۳/۲-۱

زمانہ (تاریخ انسانی) اس بات پر شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ خسارہ اور گھاٹے میں رہے سوائے ان کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے اور ایک دوسرے کو حق بات (نیک کام) کی صلاح دیتے رہے اور اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں ان کے جھیل جانے اور ان میں ثابت قدم رہنے کے لئے آپس میں سمجھوتہ کیا۔

اس سورت میں صاف طور پر قیام و بقار کے لئے چار چیزیں ضروری قرار دی گئی ہیں اور یہ چاروں ایسی مسلمہ صداقتیں ہیں کہ ان کے ثبوت کے لئے زمانہ کی پوری تاریخ کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حقیقی قیام و بقار اسی قوم کو حاصل ہوگا اور اصلح قوم وہی قرار دی جائے گی

جس میں یہ چاروں چیزیں پائی جائیں گی اور جس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں گی یا کمی کے ساتھ پائی جائیں گی تو اسی لحاظ سے اس قوم کے لئے خسارہ اور نقصان ہوگا۔

۱۔ ایمان۔

۲۔ عمل صالح۔

۳۔ تواصی بالحق

۴۔ اور تواصی بالصبر۔

ان میں سے ہر ایک پر تفصیلی بحث قرآنِ کریم کی روشنی میں اگلے باب میں آئے گی یہاں چند جملوں میں ان کی توضیح و تشریح نہایت دشوار امر ہے پھر بھی آسانی کے لئے اس موقع پر چند اشارات کئے جاتے ہیں جن سے اصل مسئلہ پر کچھ روشنی پڑ سکے گی۔

(۱) جن نظریات پر کسی تحریک کی بُنیاد رکھی گئی ہو یا کسی قوم کی تنظیم ہوئی ہو وہ افراد جماعت کی رگ رگ میں سمائے ہوئے اور ان کی پوری زندگی پر چھائے ہوئے ہوں۔

(۲) ان نظریات کو بروئے کار لانے کے لئے جن جن تدبیروں اور صلاحیتوں کی ضرورت پڑے اور جس جس قسم کی اطاعت و فرمانبرداری کا مطالبہ کیا جائے اس کے لئے قوم کے افراد ذاتی مفاد کو نظر انداز کر کے ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار رہیں۔

(۳) قوم کا ہر ہر فرد قولی اور عملی طور پر ان نظریات کا مبلغ ہو اور ایک دوسرے کی نگہ داشت اور تعلیم و تربیت کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہو۔

(۴) قوم کے افراد عزم و استقلال کے ساتھ مصائب و مشکلات میں ثابت قدم رہیں اور آپس میں ایک دوسرے کو اس کی تلقین کرتے رہیں۔

مذکورہ اُصولوں کا مفہوم ان اشارات سے کہیں زیادہ ارفع اور اعلیٰ ہے پھر بھی زمانہ کی پوری تاریخ کو سامنے رکھ کر ان اشارات میں غور کیجئے تو یا اصول قوم کے عروج و زوال کی پوری داستان نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ (باقی آئندہ)

ادبیات

غزل

از

(جناب الم مظفر نگری)

گرفتارِ نشیمن کو اگر طرزِ فغاں آئے
بہارِ گل سے پہلے انقلابِ جاوداں آئے

سہارے بے کسی کے جی رہا ہوں اس تمنا میں
کہ مرگِ ناگہاں بن کر پیامِ ناگہاں آئے

کبھی تو بارشِ انوار ہو میرے نشیمن پر
کبھی تو کوئی بجلی تا بشاخِ آشیاں آئے

وفادارانِ گلشن بے نیازِ رنج و راحت ہیں
اب عہدِ گل چمن میں آئے یا دورِ خزاں آئے

جو پیچھے رہ گیا ہے گرم رفتارانِ منزل سے
وہ تا منزل بہ تقلیدِ درائے کارواں آئے

زمانے کے حوادث بھی جگا سکتے نہیں ان کو
ازل کے دن سے جو آلودہ خوابِ گراں آئے

حدیں مل جائیں سوز و ساز کی پھر تو یہ ممکن ہے
برنگِ شمع پروانہ بھی تو آتش بجاں آئے

زمیں والے اگر دیکھیں فرا چشمِ بصیرت سے
تو ہر ذرے کے پہلو میں نظر اک آسماں آئے

جنہوں نے جادۂ منزل میں لوٹے قافلے لاکھوں
سرِ منزل وہی بن کر امیرِ کارواں آئے

یہ طوفانِ حوادث اور یہ برق و بار ایسے میں
مجھے کیوں کر خیالِ اہتمامِ آشیاں آئے

دو عالم کو بہاروں نے بنا رکھا ہے دیوانہ
جنوں بھی اب کہے پابندِ طوافِ گلستاں آئے

الم کہتے ہیں جس کو یہ اسی بے کس کا مدفن ہے
یہاں جو فاتحہ خوانی کو آئے نوحہ خواں آئے

غزل

از

(جناب شارق ام۔ اے)

ہونٹوں پہ ہنسی لاکر جو انھیں پھولوں کو ہنسانا آتا ہے
تو اشک بہا کر ہم کو بھی شبنم کا رُلانا آتا ہے

تسکینِ محبت کی خاطر، ہم کوئی بھی قصہ چھیڑیں
ہر بار ہمارے ہونٹوں پر، ان کا ہی فسانا آتا ہے

یہ کس کی سمجھ میں آئے گا، ہوتا ہے محبت میں یوں بھی
جب غم کی خلش بڑھ جاتی ہے، ہونٹوں پہ ترانا آتا ہے

طوفانِ حوادث سے ڈرنا، انساں کے لئے کچھ خوب نہیں
یوں ورنہ ہمیں بھی موجوں سے دامن کا بچانا آتا ہے

اے برقِ بلا شعلوں سے ترے، جو ڈرتا ہو تو اس کو ڈرا
ہم کو تو نشیمن میں اپنے خود آگ لگانا آتا ہے

جب ترکِ تعلق کرنے پر بھی رہتی ہے سینہ میں خلش
آتا ہے محبت میں شارق ایسا بھی زمانا آتا ہے

تبصرے

کاروانِ حجاز از جناب ماہر القادری۔ تقطیع متوسط ضخامت ۲۷۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد للعہ / چار روپیہ۔ پتہ :۔ مکتبۂ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

جناب ماہر القادری اردو زبان کے نامور شاعر۔ ادیب اور صحافی ہیں اور اب ادھر چند سال سے ان میں دینی شغف بھی پیدا ہو گیا ہے۔ یہ کتاب انھیں کا سفر نامۂ حجاز ہے اس بنا پر اس میں وہ سب کچھ ہے جس کی توقع ایک اہلِ دل ادیب اور شاعر کے اس مقدس وولولہ انگیز سفر کی روئداد سے ہو سکتی ہے، چنانچہ کراچی سے روانگی سے لے کر وہاں کی واپسی تک تمام حالات وواقعات کے ساتھ دل کے واردات۔ چشم ونظر کے مشاہدات اور دماغ کے محسوسات کا تذکرہ ایسے دلچسپ اور جذبات انگیز طرز بیان میں ہے کہ ایک مرتبہ کتاب کو شروع کر دینے کے بعد اسے ختم کئے بغیر رکھ دینے کو جی نہیں چاہتا۔ ماھر صاحب اسلامی جماعت کے داعی ہیں اس لئے بعض دینی مسائل اور بعض محسوسات ومشاہدات کی تشریح وتوضیح یا ان کی تعلیل وتوجیہ میں انھوں نے اسی جماعت کے نقطۂ خیال کی ترجمانی کی ہے جس سے ظاہر ہے دوسرے لوگوں کو اتفاق نہیں ہو سکتا، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر مصنف اپنے ہی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے اور اسے ایسا ہی کرنے کا حق بھی ہے ورنہ دنیا کا کوئی مصنف بھی اپنے تمام قارئین کے ساتھ ہم خیال نہیں ہو سکتا۔ بہر حال یہ سفر نامہ ادبی، دینی اور معلوماتی اعتبار سے دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی اس کا مطالعہ ہم خرما وہم ثواب کا مصداق ہوگا۔

تعارف القرآن از ڈاکٹر محمد احمد صدیقی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۱۲۸ صفحات طباعت وکتابت بہتر قیمت عہ پتہ :۔ کتابستان الہ آباد۔

یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے لیکن معلومات اور افادیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے اس میں لائق

مؤلف نے قرآن سے متعلق وہ تمام معلومات جمع کر دی ہیں جو ایک طالب علم قرآن کے لئے ضروری ہیں، وحی کی حقیقت۔ صحفِ سابقہ اور قرآن۔ قرآن کا نزول۔ اس کی جمع و ترتیب اعجاز۔ اقسام۔ ناسخ و منسوخ۔ تفسیر و تاویل کا فرق۔ مفسرین کے طبقات۔ قرأت سبعہ۔ حروف مقطعات آیات محکمات و متشابہات ان سب مباحث پر مختصراً کلام کیا گیا ہے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے اور اتقان وغیرہ کتابوں سے براہِ راست فائدہ حاصل نہیں کر سکتے وہ بھی اس رسالہ کے ذریعہ قرآن مجید سے متعلق یہ ضروری اور کارآمد معلومات حاصل کر سکتے ہیں، امید ہے کہ طلبا اور عام مسلمان اس سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

صاحبزادیاں از مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری تقطیع خورد ضخامت ۹۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ :۔ ادارہ اشاعت دینیات۔ حضرت نظام الدین اولیاء۔ دہلی ۱۳

لایق مصنف نے اسلامی تاریخ سے متعلق چھوٹی چھوٹی کتابیں رفاہِ عام کے خیال سے لکھنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے یہ کتاب بھی اسی کی ایک کڑی ہے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں یعنی حضرت زینب۔ حضرت رقیہ۔ حضرت ام کلثوم اور حضرت فاطمہ کے حالات و سوانح مستند معلومات کی روشنی میں دلچسپ اور اثر انگیز پیرایہ میں لکھے ہیں۔ آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے۔ پھر متفرقات کے عنوان سے پہلے دو نظمیں ہیں جو یقیناً لائق مؤلف کی نہیں ہیں لیکن چوں کہ انھوں نے حوالہ نہیں دیا اس لئے شبہ یہی ہوتا ہے کہ انھیں کی ہوں گی نظموں کے بعد عورتوں کے لئے چند کام کی باتیں اور دس حدیثوں کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب عورتوں اور لڑکیوں کے لئے تو لکھی ہی گئی ہے۔ ان بنات طاہرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مردوں کے لئے بھی تطہیر روح کی عبادت سے کم نہیں۔

انیسیات از محترمہ انیسہ ہارون شروانیہ تقطیع متوسط ضخامت ۱۹۲ صفحات طباعت وکتابت بہتر قیمت عہ پتہ :۔ مہتمم مطبوعات مسعود منزل۔ حمایت نگر۔ حیدرآباد دکن۔

علی گڈھ کے شروانی خاندان کی ایک شاعرہ محترمہ ز۔ خ۔ شروانیہ کا تذکرہ چند ماہ ہوئے

انھیں صفحات میں آچکا ہے۔ یہ کتاب اسی نامور خاندان کی ایک اور محترمہ انیسہ ہارون خاں کا مجموعۂ کلام ہے اس مجموعہ میں آں محترمہ کا سب کلام از اول تا آخر جمع کر دیا گیا ہے جو غزلوں۔ نظموں قطعات اور رباعیوں پر مشتمل ہے لیکن لائق شاعرہ کی خصوصیتِ کلام۔ یعنی بے انتہا خلوص۔ قلبی سوز و گداز۔ عشقِ خداوندی۔ اندازِ بیان کی معصومانہ نسوانیت اور سادگی کے ساتھ پرکاری۔ بھولے پن کے ساتھ طرفگی، یہ تمام اشعار میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ معنوی اعتبار سے ان اشعار کے پڑھنے میں وہی لطف آتا ہے جو ہندی کے اشعار میں آتا ہے۔ کسی شعر کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ شاعر کی شخصیت کا آئینہ دار ہو۔ اس اعتبار سے یہ مجموعہ ہمارے ذخیرۂ ادبیات میں ایک بڑا قیمتی اضافہ ہے اور محترمہ انیسہ خاتون اس کامیابی پر ہماری طرف سے مبارک باد کی مستحق ہیں امید ہے کہ اربابِ ذوق اس کے مطالعہ سے شادکام ہوں گے۔

سنگ میل | از جناب یعقوب عثمانی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۱۳۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت دو روپیہ پتہ:۔ یوسف عثمانی صاحب محلہ گھاٹی اورنگ آباد (دکن) جناب یعقوب عثمانی اگرچہ عوامی شہرت کے شاعر نہیں ہیں لیکن مہارتِ فن اور وہبی کمالِ سخن گوئی کی وجہ سے اردو شعر و ادب کے حلقہ خواص میں اپنا ایک امتیازی مرتبہ و مقام رکھتے ہیں۔ آپ کا پہلا مجموعۂ کلام شعر و نغمہ کے نام سے شائع ہوا تھا جو بڑا مقبول ہوا۔ اب یہ زیر تبصرہ کتاب اس کا دوسرا حصہ ہے اس میں نظمیں۔ غزلیں۔ قطعے سب ہی شامل ہیں۔ عثمانی صاحب کو ہر صنفِ سخن پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ حسن و رفعتِ تخیل۔ ندرت، اسلوبِ ادا۔ نغز گوئی اور ساتھ ہی برجستگی یہ موصوف کے خصوصیاتِ کلام ہیں جو ہر صنف میں قائم اور نمایاں ہیں۔ علاوہ بریں صحتِ زبان کے لحاظ سے اب اس رکھ رکھاؤ کے ساتھ شعر کہنے والے کم ہی نظر آئیں گے۔ امید ہے کہ اربابِ ذوق اس کی قدر کر کے موصوف کے کمالِ فن کی داد دیں گے۔

ترانۂ جمہور | تقطیع کلاں ضخامت ۳۲ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت ۸ر پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ اولڈ سکریٹریٹ دہلی۔

امسال ۲۵ رجنوری کو یوم جمہوریت کے موقع پر دہلی کے لال قلعہ میں جو عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا اور اس میں جگن ناتھ آزاد۔ جوش ملیح آبادی۔ روش صدیقی۔ ساغر نظامی۔ عرش ملسیانی اور سکندر علی وجد نے جو کلام پڑھا تھا یہ اسی کا مجموعہ ہے۔ یہ سب حضرات اردو شعر و شاعری کے آسمان کے چاند تارے ہیں اس بنا پر پورا کلام ہی نہایت مرصع اور بلند ہے جو ہندا ایسے عظیم الشان ملک کے جشنِ جمہوریت کے بالکل شایان شان ہے۔ البتہ مقصدی لحاظ سے جناب روش کی غزل میں ایک خاص جاذبیت ہے جو دوسروں میں نہیں ہے شروع میں محترم صدر جمہوریہ کے خود ان کے دستِ خاص سے اُردو میں لکھے ہوئے خط کا ایک عکس ہے جس میں اس مشاعرہ پر مسرت کا اظہار کیا گیا اور کارکنوں کو مبارک باد دی گئی ہے۔

انتخاب کلام امیر مینائی نعتیہ و عاشقانہ مرتبہ جناب خالد مینائی ایم۔اے تقطیع جیبی ضخامت ہر حصہ کی ۹۴ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت ہر حصہ کی ۸ ر پتہ:۔ مکتبۃ الحلبیب ۴۹ مین بازار۔ اچھرہ لاہور۔

حضرت امیر مینائی اردو کے قدیم ناخدائے سخن ہیں وہ صرف شاعر نہیں تھے بلکہ زبان، محاورات اور لغت کے بلند پایہ محقق اور نقاد بھی تھے چنانچہ امیر اللغات کے نام سے ان کی ایک کتاب یادگار بھی ہے۔ جناب خالد مینائی کے یہ دونوں حصے موصوف کے ہی کلام کا انتخاب ہیں جن میں سے ایک عاشقانہ اور دوسرا نعتیہ ہے یہ ظاہر ہے کہ ہر انتخاب کرنے والا اپنے ہی ذوق کے مطابق انتخاب کرتا ہے اور ضروری نہیں کہ اس کا انتخاب دوسرے کو بھی پسند آئے لیکن جناب خالد کا انتخاب چونکہ شعر و زبان کے ذوقِ سلیم پر مبنی ہے اس لئے امید ہے کہ اس کو عام طور پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

بُرہانؔ

جلد ۳۵ شمارہ ۵

نومبر ۱۹۵۵ء مطابق ربیع الاوّل ۱۳۷۵ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ مولانا شاہ محمد حلیم عطا شیخ الحدیث ندوۃ العلما لکھنؤ نے ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔ آپ ضلع رائے بریلی کے مشہور قصبہ سلون کے باشندے تھے۔ جہاں کی مشہور خانقاہ میں آپ کے برادر بزرگ سجادہ نشین ہیں۔ گھر کے اچھے کھاتے پیتے تھے۔ لیکن ندوہ میں بہت معمولی طریقہ پر رہتے سہتے تھے۔ مرحوم عوامی شہرت کے عالم نہیں تھے اور نہ اپنے مزاجِ لاابالی کی وجہ سے ہو سکتے تھے۔ لیکن درحقیقت بہت اونچے درجہ کے فاضل اور نہایت وسیع المطالعہ تھے۔ حدیث ان کا خاص فن تھا۔ صحیح بخاری کے ساتھ عشق رکھتے تھے اور پھر حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو کچھ پڑھتے تھے دماغ میں نقش ہو جاتا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی رح انھیں چلتا پھرتا کتب خانہ کہا کرتے تھے۔ ندوہ کے اساتذہ تک اپنے فن کے مشکل مسائل میں ان سے برابر استفادہ کرتے رہتے تھے۔

علمی کمالات کے علاوہ اخلاق و فضائل کے اعتبار سے سلفِ صالحین کا نمونہ تھے۔ ہر شخص سے بڑے تپاک سے ملتے تھے۔ چھوٹوں پر ان کی شفقت عام تھی، اپنے اساتذہ کا ذکر بڑی عقیدت اور محبت سے کرتے اور استاد زادوں سے ان کے خورد ہونے کے باوجود برادرانہ تعلق رکھتے تھے۔ کم و بیش ایک برس سے خون کے دباؤ کے عارضے میں مبتلا تھے۔ جولائی میں بہت شدید دورہ پڑا اور تقریباً ۴۸ گھنٹے بے ہوش رہے۔ ہر چند کہ بہتر سے بہتر علاج کیا گیا۔ لیکن چوں کہ وقت پورا ہو چکا تھا۔ اس لئے کوئی افاقہ نہیں ہوا اور آخر وہ قیدِ حیات سے ہی آزاد ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے اور بیش از بیش ان کے مدارج بڑھائے۔ آمین

پچھلے دنوں یہ خبر ہندو پاک کے ادبی حلقوں میں انتہائی حزن و ملال کے ساتھ سنی گئی کہ

اردو زبان کے نامور ادیب و محقق پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اپنے وطن غازی آباد میں ۹۱ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ آپ قبل از تقسیم انجمن ترقی اردو حیدر آباد ثم دہلی کے روح رواں اور مولوی عبدالحق کے دستِ راست تھے۔ جتنے بڑے شگفتہ نگار ادیب اور صاحبِ قلم تھے اتنے ہی بلند پایہ زبان و ادب کے محقق و مبصر تھے۔ جو کچھ لکھتے تھے کافی غور و فکر اور مطالعہ کے بعد بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ لکھتے تھے۔ انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو میں اور ہفتہ وار اخبار ہماری زبان میں پنڈت جی کے مقالات بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ ان کی تصانیف میں "منشورات" اور کیفیہ خاص طور پر بہت اہم کتابیں ہیں۔ جن میں زبان و ادب کے مختلف مباحث پر بڑی محققانہ اور بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے اور بعض بڑے اہم نکات بیان کئے گئے ہیں۔

اردو کے ساتھ ان کو محبت نہیں عشق تھا اس کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی کرنا اپنا فرض جانتے تھے۔ تقسیم کے بعد اس ملک میں اردو کی بے کسی دیکھ دیکھ کر انھیں بڑا ملال ہوتا تھا تاہم اس کے مستقبل کی طرف سے وہ مایوس نہیں تھے اور ان کو یقین تھا کہ جس طرح ہر درخت اپنی زمین میں ہی پھلتا پھولتا اور بڑھتا ہے۔ اسی طرح اردو زبان اس دیس کی زبان ہے وہ یہاں جتنی ترقی کر سکتی ہے۔ کسی دوسرے ملک میں نہیں کر سکتی۔ اتر پردیش میں اردو کو علاقائی زبان بنانے کی تحریک کے سلسلہ میں جو دستخطی مہم ہوئی تھی۔ کیفی صاحب نے اس میں عملاً بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ پیہم علالت۔ امتدادِ سن اور ضعف کے باوجود وہ اردو کا کام کرنے سے کبھی نہیں تھکتے اور اکتاتے تھے۔

یوں بھی بحیثیت انسان کے بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ حد درجہ شریف۔ بامروت وبا وضع۔ خود دار۔ غیور "اور مرنج و مرنجان" قسم کے بزرگ تھے۔ جس سے جتنا اور جس قسم کا تعلق ہوتا تھا اسے ہر حالت میں نباہتے اور بعض اوقات اس کے لئے تکلیفیں اٹھاتے تھے۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ لیکن ان کے ادبی کمالات کی فہرست میں شاعری درجہ دوم کی چیز تھی غزل کی بہ نسبت نظم اچھی لکھتے تھے جس میں رنگینیٔ تخیل اور ندرتِ فکر کم اور زبان کی صفائی، ستھرا پن اور روزمرہ

زیادہ ہوتا تھا۔ ان کی نظمیں عام طور پر صاف سپاٹ اور رواں ہوتی تھیں ان کے اُٹھ جانے سے زبان و ادب کی بزم میں جو جگہ خالی ہوئی ہے توقع نہیں کہ وہ آسانی سے پُر ہو سکے۔ آئندہ نسلیں ان کو یاد کریں گی اور ان کا نام بڑی عزت و احترام کے ساتھ لیں گی۔ ضرورت ہے کہ ان کی کوئی مستقل یادگار قائم کی جائے تاکہ ان کی مستقل اور بلند خدمات کا کچھ تو اعتراف و تشکر اہلِ زبان کی طرف سے ادا ہو سکے اور ان کی آتما کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ "در مرے بھتے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے"۔

گذشتہ ماہ کا برہان چھپ کر آیا اور اس کے نظرات کے پہلے صفحہ پر ہی غالب مرحوم کے شعر میں بھی گھٹ گھٹ کے کے دوسرے مصرعہ پر نظر پڑی تو بجائے لفظ "غم خوار" کے "خونخوار" دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ گویا کسی نے سینہ میں خنجر اتار دیا ہے۔ شعر کی ساری بلاغت اور خوبی لفظ "غم خوار" میں ہی ہے۔ ورنہ دوسرے مصرعہ کا پہلے مصرعہ سے کوئی تعلق ہی باقی نہیں رہتا۔ میرے حاشیۂ گمان و تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ بجائے "غم" کے "خون" کا لفظ لکھا جا سکتا ہے لیکن زبانِ قلم سے ادا ہونے سے لے کر زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے تک الفاظ کو بہت سے مراحل و منازل سے گذرنا پڑتا ہے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تبدیلی کہاں ہوئی؟ بات اگرچہ معمولی سی ہے اور صرف ایک دو حرفی لفظ کا ادل بدل ہے لیکن چونکہ اس ادل بدل نے پورا شعر ہی غارت کر دیا جس کی وجہ سے مجھ کو شدید روحانی اذیت پہنچی ہے اس بنا پر ایک نوٹ کے ذریعہ اس پر متنبہ کرنا ضروری تھا۔ مجھ کو شعر و سخن کے اعلیٰ ذوق کا دعویٰ نہیں۔ لیکن الحمد للہ اس قدر بد ذوق یا کور ذوق بھی نہیں ہوں کہ مرزا غالب ایسے شاعر کے شعر میں ایک لفظ کا تصرف کر کے اسے بالکل ہی ملیا میٹ کر دوں اور غالب کی روح کو حسرت و افسوس کے ساتھ یہ کہنے کا موقع دوں کہ "شعر مرا بمدرسہ کہ برد"

ایک مرتبہ دیوبند میں طالب علمی کے زمانہ میں کسی نے یہ شعر پڑھا

بچپنا ہے توضدیں بھی ہیں نرالی ان کی   اس پہ مچلے ہیں کہ ہم زخمِ جگر دیکھیں گے

مجھ کو یہ سن کر بڑی گرانی سی محسوس ہوئی اور میں نے کہا کہ بجائے "زخم" کے "درد" ہونا چاہئے وہ صاحب بولے کہ بھلا درد بھی کہیں نظر آتا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں! شاعر یہی تو کہنا چاہتا ہے کہ درد اگر کسی عضوِ ظاہر میں ہو تب بھی کہیں نظر نہیں آسکتا، پھر جگر جو خود ایک عضو مستور ہے اس کا درد میں کہاں سے دکھا دوں! یہی تو ضد کا نرالا پن اور بچپنے کا الھڑ پن ہے۔ زخم فی نفسہ مرئی چیز ہے اور درد غیر مرئی۔ اور پھر وہ بھی جگر کا جو خود غیر مرئی ہے اس کے دیکھنے کا تو کوئی امکان ہی نہیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ ایک ہی لفظ شعر کو کس قدر بلند کر دیتا ہے اور کتنا گرا دیتا ہے۔

---

[1] اصل مسودہ میں غم خوار ہی ہے کاتب کی غلطی سے غم خوار خونخوار ہو گیا۔ (ظفر احمد)

نقشہ عراق و عجم

نقشہ ماخوذ از اٹلیس آف دی اسلامک ہسٹری

[زرود، شراف، عُذیب، قادِس، قادسیہ، نیز اُبلّہ اور بصرہ کا تعین معجم البلدان یاقوت اور طبری کے بیان کی روشنی میں کیا گیا ہے، اس کو محض تخمینی سمجھنا چاہیے۔]

فرات
دجلہ
خراسان
شام
بحر متوسط
مدائن
جبال
قادس
حیرہ
قادسیہ
کوفہ
عُذیب
مصر
شراف
زرود
بصرہ
اُبلہ
خلیج
فارس
مدینہ
مکہ
طائف
جزیرہ نمائے عرب
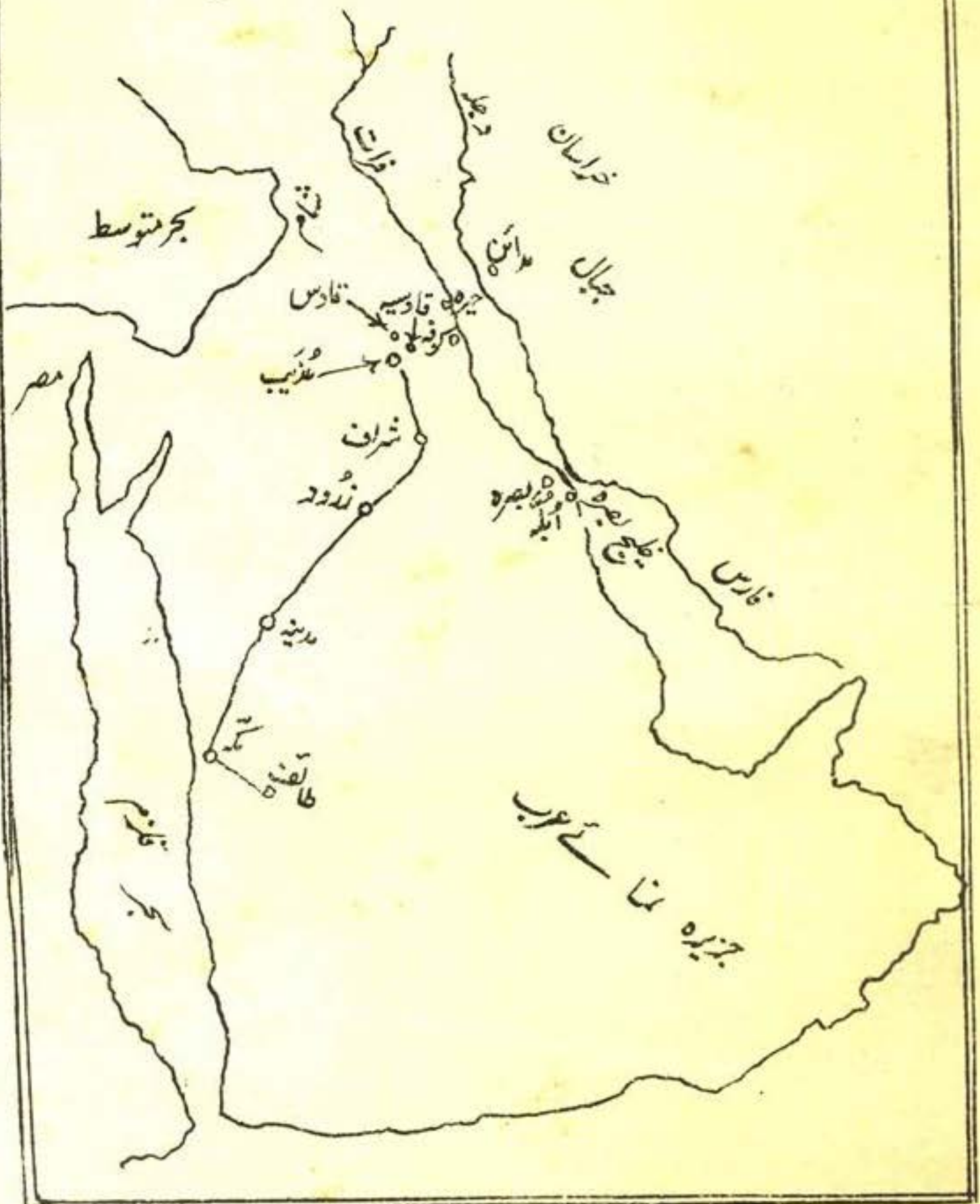
حضرت عمر کے سرکاری خطوط

۲- محاذ عراق و عجم

۵۴- مثنیٰ بن حارثہ اور دوسرے فوجی افسروں کے نام

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق

(استاذ ادبیات عربی - دہلی یونیورسٹی)

(۵)

[حضرت ابوبکر کے عہد میں (۱۲ھ سے ۱۳ھ) خالد بن ولید اور مثنیٰ بن حارثہ شیبانی نے خلیج بصرہ کے ساحلی شہر کاظمہ سے لے کر حیرۃ تک وہ علاقہ جو دریائے فرات کے جنوب و مغرب میں ایرانی چھاؤنیوں اور دیہاتوں پر مشتمل تھا، فتح کر لیا تھا، ربیع الاول ۱۳ھ میں مرکز کی طرف سے خالد کو شام کے محاذ پر جانے کا حکم ملا اور وہ دمشق چلے گئے۔ ایران میں اس وقت سخت سیاسی انتشار تھا، تخت پر کوئی مضبوط بادشاہ نہ تھا، حکومت کی باگ ڈور فوجی افسروں کے ہاتھ میں تھی جو آپس میں لڑ رہے تھے، مثنیٰ نے ان حالات سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی، وہ ابوبکر کے پاس خود مدینہ حاضر ہوئے اور ایرانی حکومت کی کمزوری اور وہاں کی خانہ جنگی کا ذکر کر کے عراق پر باقاعدہ فوج کشی کی اجازت مانگی اور فوج طلب کی۔ ان کے آنے کے چند دن بعد ابوبکرؓ رحلت کر گئے اور حضرت عمر نے خلیفہ ہو کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عراق کے لئے ایک فوج تیار کی اور ابو عبید ثقفی کی قیادت میں روانہ کیا، مثنیٰ ان سے پہلے پہنچ گئے اور فرات و دجلہ کے دیہاتی علاقہ پر غارتگری شروع کر دی، ابو عبید اور مثنیٰ کے فارسی فوجوں سے کئی کامیاب معرکے ہوئے لیکن ایک لڑائی میں جو تاریخ میں "یوم الجسر" کے نام سے مشہور ہے (آخر رمضان ۱۳ھ) ابو عبید نے اپنے ساتھیوں کے مشورہ کے برعکس تہور اور بے احتیاطی سے کام لیا اور لڑتے ہوئے مارے گئے، مسلمانوں کو شکست فاش ہوئی، چار ہزار مسلمان قتل یا غرق ہوئے۔ اس وقت ایران میں پھر پھوٹ پڑ گئی

اور ایرانی حکومت کی توجہ عربوں کی طرف سے ہٹ گئی۔ معرکہ جسر کے بعد مرکز سے پھر کئی چھوٹی چھوٹی فوجیں آئیں جن کی مدد سے مثنی نے فارسیوں کو کئی لڑائیوں میں ہرا کر پسپا کردیا۔ حالات سازگار دیکھ کر انھوں نے اب بڑے پیمانہ پر سواد (فرات، دجلہ اور ان سے نکلنے والی بہت سی نہروں سے سیراب ہونے والا علاقہ) بالائی اور زیریں عراق میں دہشت انگیزی اور غارت گری شروع کردی بغداد، ساباط اور تکریت کے شہر ان کی زد میں آگئے اور فارس کے پایۂ تخت مدائن پر خطرہ منڈلانے لگا، دیہاتی علاقہ (سواد) کے رئیسوں نے مرکز سے داد فریاد کی، اس وقت بوران ایران کی ملکہ تھی اور رستم کمانڈر ان چیف۔ ممتاز فوجی افسروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی، حکومت کی کمزوری، نظم و نسق کی ابتری، اور عربوں کی دستبرد کا جائزہ لیا گیا، سب نے اتفاق رائے سے طے کیا کہ کسریٰ نسل کے شہزادہ یزدجرد کو شاہ منتخب کیا جائے اور کسریٰ خاندان کے عمائدین اور فوجی کمانڈر اس کی وفاداری کا عہد کرکے نظم و نسق قائم کرنے میں لگ جائیں۔ وقت کا نازک ترین مسئلہ تھا کہ عربوں کا سیلاب روکا جائے، رستم نے از سرِ نو عسکری تنظیم کی، عراق کی جو چھاؤنیاں معطل پڑی تھیں یا جن پر عربوں نے قبضہ کرلیا تھا، ان کو پھر مستحکم کیا گیا، اور نئی چھاؤنیاں بنائی گئیں، نئے بادشاہ کی طرف سے عراق کے دیہاتوں میں عربوں کے خلاف سخت پروپگنڈا شروع کردیا گیا، اور اس علاقہ میں جو مسلمانوں کے زیرنگیں اور جزیہ گذار تھا، بغاوت کی لہر دوڑ گئی، عرب محصل جو تھوڑی بہت فوج کے ساتھ جزیہ کی وصولی کے لئے دیہاتوں میں مقیم تھے بھاگ آئے، ایرانی فوجیں ہر سمت سے اُمنڈنے لگیں۔ مثنی کو جب نئے بادشاہ کے تقرر، سواد کی بغاوت، اور ایرانی فوج کی پیش قدمی کی خبر ہوئی تو انھوں نے غارت گری بند کردی اور اپنے بکھرے ہوئے دستوں کو سمیٹ کر ذی قار آگئے اور مرکز کو سب حال لکھ بھیجا، ان کے مراسلہ کے جواب میں حضرت عمر نے ذیل کا خط لکھا۔[1]

"ایرانی فوجوں کی زد سے ہٹ جاؤ، اور ان دریاؤں، نہروں اور چشموں کے ساحل پر جو

---

[1] طبری ۴/۷۹-۸۴

تمہارے علاقے سے متصل ہوں، مورچے بنالو۔ قبیلہ ربیعہ، مضر اور ان کے حلیفوں سے چن چن کر بہادروں اور شہسواروں کو فوج میں بھرتی کرلو، اور اگر کوئی ایسا کرنے سے انکار کرے تو اس کو قبیلہ سے باہر نکال دو۔ عربوں سے کہہ دو کہ خوب سنبھل جائیں اور جس سنجید گی اور لگن سے فارسی اٹھے ہیں اسی سنجید گی اور لگن سے مقابلہ کے لئے تیار رہیں[1]۔"

۴۶۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

حضرت سعد کا تعارف :۔ جنگ قادسیہ میں عرب فوجوں کے سپہ سالار تھے، بالائی عراق فتح کیا اور کوفہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۷ھ سے ۲۲ھ تک کوفہ اور اس کے ماتحت علاقوں کے گورنر رہے، پھر بعض کوفی عربوں کی بے جا شکایت پر معزول ہوئے۔ حضرت علی کی کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے اور نہ حضرت عثمان کی مخالفت میں حصہ لیا۔ مخلص مسلمان تھے، سیاست وایالت سے دست بردار ہو کر مدینہ سے باہر اپنی بنوائی ہوئی کوٹھی میں فروکش ہو گئے تھے، دولت مند بہت تھے، بچوں کی تعداد چھتیس تھی، حدیث کی روایت سے بچتے تھے اور مذہبی امور میں رائے زنی سے گریز کرتے تھے۔ کسی نے ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے یہ معنی خیز جواب دیا: مجھے ڈر ہے کہ اگر میں ایک بات کہوں گا تو تم اس میں سو باتوں کا اضافہ کردو گے۔ ۵۵ھ میں وفات پائی[2]۔

[مذکورہ بالا خط لکھنے کے بعد حضرت عمر نے ایرانی غنیم کے مقابلہ کے لئے بڑے پیمانہ پر تیاری شروع کی۔ حجاز کے سب صوبے داروں اور قبائلی سرداروں کے نام مراسلے بھیجے اور فوجیں طلب کیں۔ پھر سعد بن ابی وقاص کی کمان میں چار ہزار کا لشکر عراق بھیجا اور سعد کو تاکید کی کہ راستہ میں جن قبائل سے گذر ہو ان کے جوانوں کو فوج میں شامل کرتے جائیں۔ مدینہ اور دوسرے حجازی مقامات سے برابر چھوٹی چھوٹی فوجیں آتی رہیں، حتیٰ کہ جب سعد قادسیہ کے قریب "شراف" میں خیمہ زن

---

[1] طبری ۴/ ۸۲، اس خط کا دوسرا نسخہ جو بلحاظ معنی مذکورہ خط سے زیادہ مختلف نہیں ہے طبری ۴/ ۸۴ پر بھی وارد ہوا ہے۔

[2] طبقات ابن سعد، قسم اول ۳/ ۱۰۲، و استیعاب، ابن عبدالبر

ہوئے تو ان کے پاس تیس ہزار سے اوپر فوج تھی،[1] زرود نامی منزل سے جب سعد شراف کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت عمرؓ نے یہ خط لکھا]

"ایک افسر کو جس کا تقرر تمہاری صوابدید پر چھوڑتا ہوں کچھ فوج کے ساتھ فرج الہند (خلیج بصرہ) کو بھیجو جہاں وہ خیمہ زن رہے۔ اور اگر خلیج بصرہ یا دجلہ و فرات کے دہانہ کی طرف سے نکل کر فارسی تمہارے عقب میں حملہ کرنا چاہیں تو ان کو روک لے۔"[2]

۴۷۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[جب سعد نے عراق کی سرحد سے قریب شراف نامی مقام پر پڑاؤ ڈالنے کی خبر دی تو حضرت عمرؓ نے لکھا۔]

میرا یہ خط موصول ہو تو مسلمانوں کو اس نہج پر ترتیب دو:۔ سارے مسلمانوں کو دس بڑے بڑے حصوں میں بانٹو اور ہر دس سپاہیوں پر ایک عریف (سب سے چھوٹا فوجی افسر) مقرر کرو، اور دس حصوں میں سے ہر حصّہ پر ایک افسر متعین کرو۔ اس کے بعد فوج کے میمنہ، میسرہ، قلب، پیدل، سوار اور گشتی دستوں کی تشکیل کرو۔ ایسا کرتے وقت ممتاز صحابہ، اور قبائلی سردار موجود ہوں اور ان کی رائے سے یہ کام ہو۔ اس کے بعد ان سب کی موجودگی اور مشورہ سے فوج کے حصوں پر کمانڈر مقرر کرو اور ان کو اپنے اپنے نامزد حصوں میں بھیج دو اور حکم دو کہ اس عسکری تنظیم کے ساتھ جا کر قادسیہ میں خیمہ زن ہوں۔ مغیرہ بن شعبہ کو (فرج الہند سے) واپس بلالو اور مجھ کو صورت حال سے مطلع کرتے رہو۔

۴۸۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

"اپنی فوجوں کے ساتھ شراف سے فارس کی طرف بڑھو۔

---

[1] طبری ۴/ ۸۷ [2] ایضاً

۲- خدا پر بھروسہ رکھو اور اپنے تمام کاموں میں اسی سے مدد مانگو۔

(۳) تم کو دھیان رہے کہ تم ایک ایسی قوم سے لڑنے جا رہے ہو جو تعداد میں تم سے زیادہ ہے، جس کے ہتھیار تم سے بہتر ہیں، جو بڑی بہادر ہے اور جس کے ملک میں قدرتی و مصنوعی استحکامات بہت ہیں، گو یہ ملک میدانی ہے پھر بھی دریاؤں، نہروں اور قدرتی چشموں سے یہاں نقل و حرکت دشوار ہے۔

(۴) جب دشمن تم سے مقابل ہو تو اس کے حملہ کا انتظار کیے بغیر حملہ کر دو۔

(۵) دشمن کے ساتھ کسی قسم کا مباحثہ نہ کرو۔

(۶) اس بات کی پوری احتیاط رکھو کہ دشمن جو جنگی چالوں میں بڑا ماہر ہے کوئی چال چل کر تم کو زک نہ پہنچا دے۔

(۷) اس کی مادی طاقت اور ہتھیار تم سے بہت زیادہ ہیں اور تم اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہو جب پوری لگن اور ہمت سے اس کا مقابلہ کرو۔

(۸) جب قادسیہ پہنچو (قادسیہ عہد جاہلیت میں فارس کا دروازہ تھا، یہاں فارسیوں نے اپنے ملک میں داخل ہونے والے ہر راستہ سے زیادہ فوجی استحکامات کیے تھے) جو ایک زرخیز، فراخ، اور مسلح گھاٹی ہے جس کے آگے مسلح پل اور نہریں ہیں تو تم کو چاہیئے کہ قادسیہ کی گھاٹی کی طرف جانے والے سارے راستوں پر مورچے جما لو۔ اور تمہاری فوج صحراء (یعنی عربی علاقہ) اور آبادی (یعنی فارسی علاقہ) سے قریب رہ کر کھلے میدان میں خیمہ زن ہو۔

(۹) فوج کو اس طرح مرتب کر کے تم اپنی جگہ پامردی سے ڈٹے رہو، دشمن جب دیکھے گا کہ تم نے سارے راستوں کی ناکہ بندی کر دی ہے تو وہ رسالوں، پیادوں اور اپنی ساری مسلح طاقت سے تمہارے اوپر ایک شدید حملہ کرے گا، اگر اس حملہ میں تم صبر کا دامن تھامے رہے، اس سے مقابلہ میں جانسپاری کو خوشنودی مولیٰ اور انعام ایزدی کا موجب سمجھا اور انتہائی صدق دل سے کوشش کی تو مجھے امید ہے کہ تم کو فتح حاصل ہو گی۔

(۱۰) دشمن شکست کھا کر پھر کبھی اتنی بڑی تعداد میں مقابلہ نہ کر سکے گا اور اگر کیا بھی تو اُس کے حوصلے پست ہوں گے۔

(۱۱) اگر شکست تم کو ہوئی تو صحرار (عربی علاقہ) تمہارے عقب میں ہوگا اور تم دشمن کے آباد علاقہ سے ہٹ کر اپنے صحرائی علاقہ کی طرف پلٹ سکو گے اور چوں کہ تم دشمن کی نسبت اس علاقہ سے زیادہ واقف ہو گے خدا جنگ کا پالنسہ پلٹ دے گا اور تم کو فتح عطا کرے گا، حضرت عمر نے یہ بھی لکھا: فلاں فلاں دن شراف سے کوچ کردو، اور عُذیب الہجانات اور عُذیب القوادس کے درمیان پڑاوڈالو اور

۴۹۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[جنگ قادسیہ سے پہلے]

بُرے خیالات دل میں نہ آنے دو۔

(۲) لشکر کو عزم و ثبات کی تلقین کرتے رہو، آنے والی آزمائش کے لئے خلوص نیت سے تیار رہیں، اور اپنی جاں سپاری کو خوشنودی مولی اور انعام ایزدی کا ذریعہ سمجھیں، جن لوگوں کے دلوں میں "خلوص نیت" اور "جانسپاری" کو خوشنودی مولی کا ذریعہ سمجھنے کا جذبہ نہ ہو ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے، کیوں کہ جس پایہ کا "خلوص نیت" ہوتا ہے اسی پایہ کی خدائی مدد ہوتی ہے اور جس پایہ کا "جذبۂ جانسپاری" ہوتا ہے اسی پایہ کا انعام خدا کی طرف سے ملتا ہے۔

(۳) اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھو کہ جن لوگوں پر تم بالادست ہو ان کو تمہارے ہاتھوں کوئی تکلیف نہ پہنچے، نہ اُن کے ساتھ کوئی بے انصافی ہو اور اس بات کی بھی پوری احتیاط رکھو کہ جو مہم تمہارے سپرد ہے اس کی ادائیگی میں غلطی یا بھول چوک نہ ہونے پائے

(۴) تم اور سب مسلمان خدا سے سلامتی اور عافیت کی دعا مانگتے رہیں اور لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا وِرد رکھیں۔

عُذَیب: قادسیہ کی گھاٹی سے چار میل کے فاصلہ پر عربی صحرار سے متصل ایک بڑا نخلستان تھا (معجم البلدان مصر ۶/۱۳۱)

(۵) مجھے لکھو کہ فارسی لشکر کس جگہ صف آرا رہوا ہے اور اس کی کمان کس کے ہاتھ میں ہے۔

(۶) میں کچھ ہدایتیں لکھنا چاہتا تھا مگر تمہاری اور دشمن کی خیمہ گاہ کا علم نہ ہونے کے سبب نہیں لکھ سکتا، لکھو کہ مسلمان کہاں پڑاؤ ڈالے ہیں اور اس علاقہ کا جغرافیہ بتاؤ جو تمہارے اور فارس کے پایۂ تخت مدائن کے درمیان واقع ہے، یہ جغرافیا اتنا مفصل اور واضح ہو گویا میں خود اس علاقہ کو دیکھ رہا ہوں۔

(۷) اپنے عسکری حالات اور مسائل سے مجھ کو اچھی طرح باخبر رکھو۔

(۸) خدا سے ڈرتے رہو اور خدا ہی سے مدد اور فتح کی امید رکھو اور اپنی تیاری یا طاقت پر نہ بھولو، تم کو یاد رہے کہ خدا نے کامیابی اور فتح کا تم سے وعدہ کیا ہے اور وہ اپنے وعدہ سے کبھی نہیں پھرے گا، کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے جس سے یہ موعودہ کامیابی اور فتح خطرہ میں پڑ جائے اور تمہاری بجائے کوئی دوسری قوم خدا کی عنایتوں کی مستحق ہو جائے۔"[1]

۵۰۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[مذکورہ بالا خط کے جواب میں حضرت سعد نے قادسیہ کے گرد و پیش کا جغرافیا لکھ کر بھیجا اور لکھا: سواد یعنی عراق کے دیہاتی علاقہ کے سارے رئیس جنہوں نے پہلے مسلمانوں سے مصالحت کی تھی باغی ہو کر ایرانیوں سے مل گئے ہیں اور ان کے ساتھ لڑتے آرہے ہیں نیز یہ کہ ایرانی فوج کی کمان رستم اور دوسرے ممتاز افسروں کے ہاتھ میں ہے۔]

"تمہارا خط موصول ہوا، حالات معلوم ہوئے۔

(۲) جہاں ہو وہیں ٹھہرے رہو۔ یہاں تک کہ دشمن تمہارے اوپر حملہ آور ہو۔

(۳) تم کو دھیان رہے کہ اس لڑائی کے بعد اور لڑائیاں ہوں گی۔

(۴) اگر خدا کے کرم سے دشمن پسپا ہو تو اس کا تعاقب کرنا اور اس کے پایۂ تخت مدائن میں گھس پڑنا، خدا نے چاہا تو مدائن تباہ ہو جائے گا۔[2]

---

[1] طبری ۴/۹۰

۵۱- سعد بن ابی وقاص کے نام

[ابھی جنگ نہیں چھڑی تھی اور سعد قادسیہ میں خیمہ زن تھے کہ حضرت عمرؓ نے ذیل کا خط لکھا۔]

مجھے القا ہوا ہے کہ دشمن کو تمھارے مقابلہ میں شکست ہوگی، پس شک و شبہ کو دل سے نکال دو اور "خوف خدا" کو اس کی جگہ دو۔

(۲) تمہارا کوئی فوجی اگر مذاق میں بھی کسی فارسی کو امان دے یا کوئی ایسا اشارہ کرے یا زبان سے ایسا لفظ نکالے جس کو فارسی چاہے سمجھتا نہ ہو مگر اس کے ملک میں امان کی علامت سمجھا جاتا ہو تو تم اس لفظ یا اشارے کو نافذ کردو۔

(۳) میدان جنگ میں ہنسنے ہنسانے سے پرہیز کرو۔

(۴) دشمن سے جو وعدہ کرو اس کو ہر حال میں پورا کرو، وفا تو بے وفائی کے موقع پر بھی اچھا اثر دکھاتی ہے، مگر غداری اگر غلطی سے بھی کی جائے تو اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ غداری سے تمہاری طاقت کم ہوگی، دشمن کی طاقت بڑھے گی، تمہاری فتح شکست سے اور دشمن کی شکست فتح سے بدل جائے گی۔

(۵) میں تم کو اس طرزِ عمل سے باز رہنے کی سخت تاکید کرتا ہوں جس سے مسلمانوں کے نام کو بٹہ لگے یا ان کی قوت کو صدمہ پہنچے۔"[1]

۵۲- سعد بن ابی وقاص کے نام

[طبری میں سعد کے مدینہ سے روانگی سے لے کر قادسیہ (قادس) میں مقیم ہونے تک حضرت عمرؓ کے سات خطوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے پہلا (یعنی نمبر چھیالیس) زرود نامی منزل سے روانگی کے وقت موصول ہوا، اور دوسرا اور تیسرا (یعنی نمبر سینتالیس اور اڑتالیس) جب وہ "شراف"

---

[1] طبری ۴/۹۰

میں خیمہ زن تھے، پھر جب وہ شراف سے روانہ ہو کر "عُذَیب" کے نخلستان میں عورتوں اور بچوں کو چھوڑ قادسیہ کے نزدیک قادس نامی مقام میں فروکش ہوئے تو حضرت عمرؓ کے چار مزید خط آئے، (یعنی نمبر انچاس، پچاس، اکیاون، اور باون جس کا ذیل میں ابھی ذکر ہوگا) بقول مورخ ابن اسحاق (طبری ۴/۱۳۸) حضرت سعد کا خیمہ عُذیب کے قریب قادس نامی میدان میں نصب تھا۔ اور رستم کا قادسیہ میں، قادسیہ سے عُذَیب چار میل کے فاصلہ پر ایک نخلستان تھا ابن اسحاق کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ جیسا کہ ہم نے اوپر پڑھا حضرت عمرؓ نے اپنے خط میں سعد کو ہدایت کی تھی کہ عُذَیب الهجانات اور عُذَیب القوادس کے درمیان خیمہ زن ہوں اور غالباً یہ قادس ان دونوں کے مابین ایک جگہ تھی جس کے آس پاس قدرتی چشمے اور استحکامات تھے

قادسیہ ایک شہر تھا جو حجاز کی سرحد سے چار میل شمال اور کوفہ سے جنوب مغرب میں کوئی پچاس میل کے فاصلہ پر ایک کھلے میدان میں واقع تھا، یہ میدان بہت بڑا تھا، اس کی ایک حد سواد کے مزروعہ علاقہ سے ملتی تھی اور دوسری حجاز کے ریگستان سے۔ مٹی پتھریلی ہونے کی وجہ سے اس میں نہ زراعت تھی نہ درخت۔ جہاں قادسیہ واقع تھا، اس کے آس پاس متعدد قدرتی چشمے تھے اور عُذیب بھی قدرتی چشموں کے قریب ایک نخلستان تھا، ساسانی عہد میں ایرانی حکومت نے سواد کے علاقہ کو عربوں کی غارتگری سے محفوظ رکھنے کے لئے اسی میدان میں متعدد فوجی چوکیاں قایم کی تھیں اور ایک لمبی دیوار اور خندق بنوائی تھی۔[1]

ذیل کے خط کا سیاق دسیاق طبری کے راویوں نے یہ بتایا ہے کہ سعد کے جاسوسوں نے حیرہ اور دوسری سرحدی بستیوں سے یہ خبر لاکر دی کہ ایک بہت بڑی فوج رستم کی سرکردگی میں لڑنے آرہی ہے۔ سعد نے اس کی اطلاع مرکز کو دی تو حضرت عمرؓ نے ذیل کا خط لکھا۔]

"جاسوسوں کی لائی ہوئی خبروں یا امنڈتی ہوئی ایرانی فوجوں کی کثرت اور سازوسامان سے ہرگز ہرگز غمگین نہ ہو۔

---

[1] معجم البلدان یاقوت مصر، ۱۳۱/۲ دائرۃ المعارف انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۶۱۲/۲

(۲) خدا سے مدد اور نصرت کی دعا مانگو اور اس کی چشم کرم پر نظر رکھو۔

(۳) رستم کے پاس ایک وفد بھیجو جس میں وجیہ، صائب رائے اور قوی دل لوگ ہوں جو اسلام کی دعوت دیں۔

(۴) مجھے یقین ہے کہ خدا نے چاہا تو اس دعوت کے اثر سے ان کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور ان کو شکست ہوگی۔

(۵) ہر روز مجھ کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہو۔

عثمان رض
صرف تاریخ کی روشنی میں

از

ڈاکٹر طہٰ حسین

مترجم

(جناب مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی)

(۲)

علاوہ بریں حضرت سعدؓ ہی وہ صحابی ہیں۔ جن کے لئے رسول اللہ صلعم نے اُحد کے موقع پر اُن کی پامردی اور استقلال کے پیش نظر فرمایا۔ فداہ امّی و ابی۔ کسی اور صحابی کے لئے آپ نے ماں اور باپ دونوں کو جمع نہیں کیا۔ سعدؓ بہترین تیر انداز تھے۔

نبی کریم صلعم فرماتے۔ ارم سعد فداک ابی و امی۔ پس جو شخص ایسی قسمت والا ہو کہ اُسے تہائی اسلام کہا جائے۔ اسلام کا پہلا تیر انداز کہا جائے۔ رسول اللہ صلعم اُس پر اپنے ماں باپ فدا کریں اُس سے خوش ہوں اور اُسے اُن دس افراد میں شمار فرمائیں جن کے لئے جنت کی ضمانت دیں۔ جو ایرانی سلطنت کا خاتمہ کر دینے والا اور قادسیہ کا فاتح ہو۔ جس کو حضرت عمرؓ نے مجلس شوریٰ میں حاضری کا حکم دیا ہو۔ جس کو خلافت کا اُمیدوار بنایا ہو۔ جسے خلافت نہ ملنے پر گورنر بنانے کی خواہش ظاہر کی ہو۔ جس کے مقدر میں یہ ساری فضیلتیں اور خوبیاں ہوں ممکن نہیں کہ وہ بیت المال کے قرض کے بارے میں خواہ کم ہو یا زیادہ ٹال مٹول سے کام لے ممکن نہیں کہ اس کے بارے میں عبداللہ بن مسعود شک و شبہ کریں، یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت عثمانؓ اس پر غصہ ہوں، اس کے خلاف اقدام

کریں اور پھر تقاضا وصول کرکے معاف کردیں، غالب گمان تو یہی ہے کہ حضرت عمرؓ نے خلیفہ کو سعد کے لئے کسی بھی گورنری کی طرف متوجہ نہیں کیا، بلکہ خاص طور پر کوفہ کی گورنری کا اشارہ کیا ہے اس لئے کہ وہی ایک ایسا شہر تھا . . . .

. . . . جس میں سعد کا قیام ضروری تھا تاکہ فتوحات کی تکمیل کرکے جنگ کا خاتمہ کیا جاسکے۔ ابن مسعود کی سعد کے ساتھ بدگمانی بھی حقیقت میں حیرت انگیز ہے، وہ جانتے تھے کہ سعد سابقون الاولون میں ہیں نبی کی نگاہ میں اور شیخین کی نظر میں ان کا خاص مرتبہ ہے خود نبی صلعم کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے، اس لئے کہ ابن مسعود آنحضرت کی صحبت میں بہت زیادہ رہے صحابہ میں سب سے زیادہ حدیثوں کے راوی، سب سے زیادہ قرآن مجید کے حافظ، صحابہ میں سب سے زیادہ اس بات کے واقف کہ کس کے بارے میں آنحضرتؐ کی کیا رائے ہے، اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ سعد کے متعلق شک کریں اور قرض ادا کرنے کا بار بار تقاضا کریں، یہاں تک کہ جب وہ بددعا کرنے کا ارادہ کریں تو ڈریں اور گھبرا کر ان کو رضامند کرلیں اور بہت جلد وہاں سے چل دیں — بات یہ ہے کہ سعد بن ابی وقاص فتنے کے موقع پر غیر جانبدار رہے، اور فریقین میں سے کسی کا ساتھ دینے سے انکار کردیا، اور کہا میں اس اختلاف میں اسی وقت حصہ لوں گا جب مجھے کوئی فریق ایسی تلوار لادے جو خود بولے کہ فلاں فریق حق پر ہے اور فلاں حق پر نہیں، ان کی یہی غیر جانب داری اس عجیب وغریب قصے کی بنیاد ہے، اگر سعد حضرت علی کے حامیوں کی طرفداری کرتے تو یقیناً شیعہ اُن کی طرف سے جواب دہی کرتے اور اگر وہ حضرت عثمان کے حامیوں کی طرفداری کرتے تو وہ ان کی طرف سے مدافعت کرتے، لیکن سعد نے دونوں برسر پیکار جماعتوں سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جماعت کے لوگ سعد سے کنارہ کش رہے اور کسی نے اُن کی طرف سے مدافعت نہیں کی۔

میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حضرت سعد کی معزولی کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ بنی اُمیہ اور ابو معیط کے خاندان والے حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے میں عجلت سے کام لے رہے تھے، اور اس کے لئے ہر قسم کی تدبیریں اور حیلے کرتے تھے، اور حضرت عثمانؓ پر دباؤ ڈالتے تھے

کہ وہ ان کے مقاصد کے لئے راستے ہموار کریں اور مواقع فراہم کریں، اس کا پتہ اس طرح بھی چلتا ہے کہ سعد کی معزولی کے بعد حضرت عثمان نے انصار و مہاجر صحابہ کبار میں سے کسی کو کوفہ کا گورنر مقرر نہیں کیا نہ طلحہؓ کو نہ زبیرؓ کو نہ عبدالرحمنؓ کو نہ محمد بن مسلمہؓ کو نہ ابو طلحہؓ کو بلکہ ولید بن عقبہ ابن ابی معیط کو موقع دیا، حالانکہ خود عام مسلمان ولید بن عقبہ سے مطمئن نہ تھے، اس لئے کہ اس نے نبی صلعم ہی کو دھوکا دیا اور آپ پر بہتان باندھا، اسلام کے بعد کفر کی آلائش سے آلودہ ہوا، اللہ نے قرآن میں آیت نازل کی۔ یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا إِن جَاءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَیَّنُوا أَن تُصِیبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِینَ۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ولید بن عقبہ کو قبیلہ بنی المصطلق میں اس تصدیق کے لئے بھیجا کہ کیا واقعی اس قبیلہ کے لوگوں نے صدقات کی ادائیگی سے انکار کر دیا ہے؟ تو ولید نے آکر اطلاع دی کہ ہاں یہ خبر صحیح ہے لیکن جب آنحضرت مقابلے کی خاطر نکلے تو راہ میں ولید کی مکاری کھل گئی اور خدا نے حقیقت حال سے باخبر کر دیا، پھر اس کے بعد ولید اسی وقت اسلام لایا جب مسلمان ہوئے بغیر چارہ نہ تھا اور حتی الامکان اپنی اصلاح کر لی، کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بھی تو ولید کو بنی تغلب سے صدقات وصول کرنے کے لئے مقرر کیا تھا، لیکن حضرت عمر یا ان کے کسی حاکم کا ولید کو جزیرہ کے کسی دیہاتی حصے میں ایک نصرانی قبیلے سے صدقات وصول کرنے پر مقرر کرنا اور حضرت عثمان کا سب سے بڑے اسلامی شہر جس کی کئی سرحدیں ہوں اس کو گورنر بنا دینا اور وہ بھی سعد بن ابی وقاص کی جگہ پر دونوں میں بڑا فرق ہے۔

جن لوگوں نے کوفہ کی گورنری پر ولید کے تقرر کو نامناسب خیال کیا انھوں نے کوئی دور کی بات نہیں کی اس لئے کہ کوفہ کی گورنری بہر حال بڑی اہم خدمت تھی،

ایک دوسری بات جو اس سارے قصے کو جس پر حضرت سعد کی معزولی اور ولید کے تقرر کی بنیاد ہو مشکوک بنا دیتی ہے یہ ہے کہ بیت المال کے معاملات میں خود حضرت عثمان کی روش مدینہ منورہ میں اس واقعہ سے زیادہ خطرناک ہے جس کو سعد کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، حضرت عثمان نے اپنے ایک عزیز کو ایک بڑی رقم عطیہ دینا منظور کر لیا لیکن خزانچی نے رقم کی بڑی مقدار کے

پیشِ نظر، دینے سے انکار کر دیا، حضرت عثمان نے اصرار کیا لیکن خازن بدستور اپنی بات پر اڑا رہا۔
حضرت عثمان نے دورانِ بیان میں جس کا تذکرہ ہم موقع پر کریں گے کہا "تم کو پس وپیش کا کیا حق ہے،
تم تو ہمارے خازن ہو۔" جواب میں خزانچی نے کہا میں اپنے کو آپ کا خازن خیال نہیں کرتا، آپ کا
خازن تو آپ کا کوئی غلام ہوگا میں تو مسلمانوں کا خازن ہوں۔ اس کے بعد وہ بیت المال کی کنجیاں منبر
نبوی پر رکھ کر اپنے گھر بیٹھ رہا۔ پس جب حضرت عثمانؓ کا عمل بیت المال سے متعلق یہ ہے تو کس قدر
حیرت کی بات ہوگی کہ وہ سعد سے محض اس لئے ناراض ہوں کہ انھوں نے بیت المال سے کچھ قرض
لے لیا تھا اور اس کی ادائیگی کے لئے مہلت طلب کر رہے تھے جس طرح حضرت عمرؓ نے سعد کو کسی
خیانت کی بنا پر برطرف نہیں کیا تھا ہمارا خیال ہے اسی طرح حضرت عثمان نے بھی ان کو کسی خیانت
یا ایسے سبب کی بنا پر برطرف نہیں کیا جس کا نزدیک یا دور سے کوئی تعلق خیانت سے رہا ہو انھوں
نے حضرت عمرؓ کی وصیت پر عمل کیا اور اس کے بعد سعد کو اس لئے معزول کر دیا کہ ان کی جگہ ابو معیط
کے خاندان کے ایک آدمی کو مقرر کر دیں اور یہ بات ہمیں تسلیم کرنا ہوگی کہ ولید نے اپنی حکومت کے
زمانے میں اخلاص اور آزمائش کی غیر معمولی مثالیں پیش کیں، سرحدوں کی حفاظت اور فتوحات کا
دائرہ وسیع کرنے میں اس سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی بلکہ اس سلسلے میں اس کے کارنامے خود اس
کی زندگی میں اور مرنے کے بعد عوام کا موضوعِ سخن بنے رہے، اس نے کوفہ کے عوام پر تدبر، پامردی
اور حوصلے کے ساتھ حکومت کی امنِ عام برقرار رکھا نئے خون والے مفسد نوجوانوں کا صفایا
کر دیا جو نہ کسی نظام کا احترام کرتے تھے اور نہ دین کا وقار کرنا جانتے تھے۔

ایک مرتبہ چند نوجوانوں نے ایک کوفی جوان پر زیادتی کی اور اسے مار ڈالا۔ ولید نے
ان سے مواخذہ کیا اور ان پر حد جاری کی، چنانچہ اپنی کوٹھی کے سامنے ان کی گردنیں اڑا دیں،
بعض راوی خیال کرتے ہیں کہ ولید کے اس اقدام نے مقتول قاتلوں کے سرپرستوں کو ولید
کا دشمن بنا دیا۔ اور ان کے دلوں میں دشمنی اور عناد کے جذبات پیدا کر دئے، چنانچہ وہ ولید
کی لغزشوں اور غلطیوں کی تلاش میں رہنے لگے۔ اس کے خلاف الزامات اور تہمتیں تراشنی

شروع کر دیں اور لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرنے لگے، بالآخر ان میں سے ایک ولید کی مجلس تک جا پہنچا اور داستان سرائی شروع کر دی، قصہ گوئی میں رات کافی گذر گئی اور ولید کو نیند آگئی، تب اس داستان سرا نے ولید کی انگلی سے اس کی انگوٹھی نکال لی اور اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں انگوٹھی سمیت حاضر ہوا پھر دونوں نے اس بات کی شہادت دی کہ ولید نے شراب نوشی کی ہے۔

اس واقعہ کا بناوٹی ہونا کسی بیان اور تشریح کا محتاج نہیں، کوئی امیر قصہ گویوں کی موجودگی میں سو نہیں جاتا اور وہ بھی ایسی گہری نیند کہ کوئی انگلی سے انگوٹھی نکال لے اور اسے خبر تک نہ ہو اور نہ اس کے خادم اور پہرہ داروں کو پتہ چل سکے، اور پھر ولید اگر اتنا ہی بے پروا اور غافل حاکم تھا جو اس انگوٹھی کے نکل جانے کی خبر نہ رکھتا ہو جس سے اپنے فرمانوں پر مہر لگاتا تھا، خلیفہ اور سرحد کے محافظوں کو خطوط لکھتا تھا تو اس کے دور اندیش، بیدار مغز اور عالی حوصلہ ہونے کے کیا معنی؟

یہ بات تو ایسی ہے جیسے ولید کے مخالف کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے دوست اور اپنے شاعر ابوزبید کے ساتھ بیٹھ کر شراب نوشی کیا کرتا تھا، یہ ابوزبید وہی ہے جس کی ملاقات ولید سے اس وقت ہوئی جب وہ بنی تغلب میں صدقات کی وصولی پر مقرر تھا، اور اس کے ماموؤں کے ساتھ اس کا جو جھگڑا تھا اس میں انصاف کر کے اس کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ ابوزبید ماں کی طرف سے تغلبی اور باپ کی طرف سے طائی تھا اور مذہبًا عیسائی، ولید جب کوفہ کا گورنر مقرر ہوا تو وہ اس کے پاس آیا جایا کرتا تھا، اس کے ہاں قیام کرتا تھا اور اس سے انعامات بھی پاتا رہتا تا آنکہ مسلمان ہو گیا، اور دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے، اور میرا خیال ہے کہ ابوزبید کا اسلام بھی ولید کی طرح کوئی گہرا اسلام نہ تھا اور اس خیال کی تصدیق اسی سلسلے میں اس طرح ہوتی ہے کہ حضرت عثمان نے ولید پر حد جاری کی، حالانکہ حدود جاری کرنے میں شبہات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اگر حضرت عثمان مذکورہ بالا دونوں گواہوں کی شہادت میں قوی یا کمزور کسی طرح کا بھی شبہ پاتے تو وہ ولید پر حد جاری کرنے میں ضرور پس و پیش فرماتے، پھر شبہ کی

بنا پر حد جاری نہ کرنے پر حضرت عثمان کے لئے کوئی مضائقہ بھی نہ تھا مضائقہ تو اس میں ہے کہ شبہ خواہ کتنا ہی کمزور ہو اور حد جاری کر دی جائے۔

لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ حضرت عثمان کے حکم سے ولید پر کس نے حد جاری کی، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بہت سے لوگ خلیفہ کا حکم ماننے سے گریز کر رہے تھے لیکن حضرت علیؓ نے ولید کو مارا، اگر یہ روایت صحیح ہے اور ہمارے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ حضرت علیؓ دین کی باتوں کے سب سے بڑے عالم تھے اور سنتوں کے محافظ تھے، اللہ کی مرضی اور اس کے حکم کے نفاذ میں سب سے زیادہ شدید تھے وہ شبہ کی موجودگی میں حد جاری نہیں کر سکتے تھے، اکثر راویوں کا خیال ہے کہ ولید کو سعید ابن العاص اموی نے مارا ہے اور یہ سعید حضرت عثمان کے اور ولید کے قریبی رشتہ دار تھے، ان کو اپنے نزدیک اور دور کے رشتہ داروں اور خلیفہ کی نگاہ میں اپنی وقعت پر بڑا ناز تھا، اگر وہ ذرا بھی مشکوک ہوتے تو یقیناً حضرت عثمان سے ان کے فیصلے کے متعلق گفتگو کرتے اور اگر کامیابی نہ ہوتی تو کم از کم ولید کو مارنے سے معذرت کر دیتے لیکن انہوں نے ولید کو مار کر دونوں کی نسلوں میں ایک نہ ختم ہونے والی عداوت پیدا کر دی۔

ولید کے مخالفوں کی ایک دماغی پیداوار جسے ہم غلو کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے یہ ہے کہ ایک دن ولید نے شراب کے نشے میں مست صبح کی نماز میں امامت کی اور تین یا چار رکعتیں پڑھا دیں اور پھر مصلیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اگر تم چاہو تو میں کچھ اور رکعتیں زیادہ کر دوں، تب بعض لوگوں نے اس کو ملامت کیا اور بعضوں نے اس پر کنکریاں پھینکیں، اور عوام نے حضرت عثمانؓ سے درخواست کی کہ انھیں ولید سے معاف رکھیں، چنانچہ آپ نے ان کی درخواست منظور کر لی، اس کے بعد یہ واقعہ عوام کے زبان زد ہو گیا اور بذلہ سنجوں کے لئے لطائف و ظرائف اور شعراء کے لئے طبع آزمائی کا موضوع بن گیا چنانچہ حطیئہ نے کہا

شہد الحطیئة یوم یلقی ربہ   ان الولید احق بالعذر

نادی وقد نفدت صلاتہم   أأزیدکم ثملا ولا یدری

یزید ھم خیرا ولو قبلوا　　منه لزادھم علی عشر

فأبوا ابا وھب ولو فعلوا　　لقرنت بین الشفع والوتر

حبسوا عنانك اذ جریت ولو　　خلوا عنانك لم تزل تجری

میرا خیال ہے کہ یہ قصہ سر سے پاؤں تک بے اصل اور من گھڑت ہے اگر ولید نے نماز میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کیا ہوتا تو کوفہ کے مسلمان جن میں بعض صحابہ اور متعدد قاری اور صالحین موجود تھے ہرگز اس کو برداشت نہ کرتے اور نہ اس بات پر راضی ہوتے کہ حضرت عثمانؓ صرف شراب کی حد جاری فرما دیں اس لئے نماز کا مذاق یا اس میں اپنی طرف سے اضافہ خدا اور مسلمانوں کے نزدیک شراب نوشی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

پھر یہ کہ یہ اشعار حطیئۃ کے نہیں ہیں، حطیئۃ نے تو دوسرے اشعار کہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولید کا محب مخلص اور اس کی رضامندی کا حریصانہ طلب گار ہے چنانچہ وہ کہتا ہے

شھد الحطیئۃ یوم یلقی ربه　　ان الولید احق بالعذر

خلعوا عنانك اذ جریت ولو　　ترکوا عنانك لم تزل تجری

ورأوا شمائل ماجد متبرع　　یعطی علی المیسور والعسر

فنزعت مکذبا علیك ولم　　تردد الی عوز ولا فقر

بعض شیعوں نے حطیئۃ کے ان اشعار کا جواب بھی دیا ہے جو اس نے ولید کی مدح میں لکھے ہیں۔

ذیل کے تین شعر بھی ہرگز ہرگز حطیئۃ کے نہیں ہیں بلکہ یہ ولید کے مخالفوں کی تہمت تراشی اور رنگ آمیزی ہے۔

تکلم فی الصلاۃ وزاد فیھا　　علانیۃ وجاھر بالنفاق

ومج الخمر عن سنن المصلی　　ونادی والجمیع الی افتراق

ازید کم علی ان تحمدونی فما لکم ومالی من خلاق

ولید کے عہدِ گورنری میں حطیئہ نے اس کی مدح میں بہترین اشعار کہے ہیں جب کہ اس کے خلاف سازش یا اعتراض کا کسی کے دل میں خیال بھی نہیں تھا۔

غالباً اس روایت میں بھی کھینچ تان کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ ولید کے پاس ایک جادوگر لایا گیا، ابن مسعود نے اس کے بارے میں سوال کیا اور جب ان کو یقین ہوگیا کہ جادوگر سحر پر ایمان رکھتا ہے تو انھوں نے اس کے قتل کا حکم کردیا، اور کوفہ کے ایک باشندہ نے عجلت سے کام لے کر بلا ولید کی منظوری کے اس کو قتل کردیا، اس کے بعد کوفہ والوں نے اس سلسلے میں حضرت عثمانؓ سے ولید کی شکایت کی، جس پر آپ نے جواب دیا کہ کیا صرف گمان کی بنا پر لوگوں کو تم قتل کردیتے ہو۔

میرے خیال میں یہ کوئی بعید بات نہیں کہ ولید کے پاس کوئی جادوگر لایا گیا ہو، جس کے شعبدے اور کھیل اس نے دیکھے، اس پر کوفہ کے بعض بزرگوں کو غصہ آگیا ہو اور انھوں نے اس غریب شعبدہ باز کو قتل کردیا، پھر اس حرکت پر ولید نے اور خلیفہ نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا، اس لئے کہ لوگوں کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ خلیفہ کی منظوری کے بغیر، یا محض گمان کی بنا پر کسی کا خون بہائیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ولید ایک قریشی تھا بظاہر مسلمان لیکن بباطن جاہلیت پر قائم تھا، وہ اپنے ایسے ساتھیوں میں جن کی زبان پر اسلام، لیکن دل کفر و ایمان کے بین بین ہو کوئی پہلا شرابی نہیں تھا، اور نہ مخفی طور پر ہنسی مذاق کرنے میں وہ کوئی انوکھا اور نیا تھا، میرے خیال میں یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ولید نے کسی شعبدہ باز سے اپنا دل بہلایا اور اس کے تماشوں میں دلچسپی لی، اور یہ بھی بعید نہیں کہ ابن مسعود کی درمیان میں مداخلت کا ضمیمہ ولید کی مدافعت میں چسپاں کردیا گیا ہو۔ بہر حال میرا یقین ہے کہ ولید کی معزولی کا براہِ راست سبب اگر اس کی شراب نوشی تسلیم کرلی جائے تب بھی یہ ماننا ہوگا کہ اس کی برطرفی میں بعض دوسرے اسباب بھی دخیل ہیں

جو شاید شراب نوشی اور کسی شعبدہ باز سے دلچسپی رکھنے سے کہیں زیادہ اثرات رکھتے ہیں اور جن کا تعلق ولید کے اس سیاسی مسلک سے ہے جو کوفہ والوں کے لئے اس نے طے کیا تھا اور جس کے ماتحت وہ ان کے ساتھ پیش آتا تھا کوفہ کی آبادی میں اکثریت یمنیوں کی تھی، مصری بہت کم تھے، ولید قریشی تھا، حضرت عثمانؓ کا رضاعی بھائی تھا اس کو اپنی قریشیت اور حضرت عثمانؓ کی نگاہ میں اپنے درجے پر بڑا ناز تھا، اغلب ہے کہ یمنی اکثریت اس قریشی حاکم سے جو اپنی برتری اور فوقیت کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا تنگ آچکی ہو اور بتدریج مخالف ہو گئی ہو، خود ولید نے اس بدلی ہوئی حالت اور یمنیوں کی مخالفت کا احساس کیا لیکن برداشت کرتا رہا اندازہ ہے کہ ولید نے یمنیوں کے اقتدار اور امتیاز کا مقابلہ کرنے کی بھی کوشش کی، کہا جاتا ہے کہ یمنیوں کا ممتاز طبقہ کوفہ میں اعلان عام کیا کرتا تھا کہ ـــــــ کوفہ میں آنے والوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگر ان کو قیام کی کوئی جگہ نہ ملی ہو تو وہ فلاں شخص کے ہاں بے تکلف چلے آئیں ـــــــ اس طرح وہ مہمانوں کے استقبال والی عربی سنت کو زندہ رکھنے کا بازار گرم رکھتے تھے اور باہم مقابلہ کرتے تھے، ولید نے بھی ایک دار الضیافہ اپنی مرضی سے یا حضرت عثمانؓ کی اجازت سے قائم کیا اور اس طرح یمنی اشراف کے لئے فخر و امتیاز کے مقابلے کا دروازہ بند کر دیا ابو زبید جب کوفہ آتا تو اسی دار الضیافہ میں قیام کرتا اور ولید کے ہاں آتا جاتا۔ اور کون جانے کہ یہی شاعر اپنی کسی ملاقات سے واپسی پر دار الضیافہ میں آکر مستی کے عالم پر قابو نہ پاکر زبان سے کچھ ایسی باتیں نکال دی ہوں جو خود ولید کی جاسوسی کا باعث بن گئی ہوں۔

اس کے بعد ولید نے لوگوں کی عام ناراضی اور مخالفت کے پیش نظر ایک نئی سیاست کا آغاز کیا جس کا ظاہر خیر خواہی کرنا اور نیکی پھیلانا تھا لیکن اس کا باطن عوام اور جماعتوں تک پہنچنا اور ان میں ہر دل عزیزی حاصل کرنا تھا، چنانچہ اس نے غلاموں کے لئے وظیفے مقرر کئے جن سے وہ بہت آسودہ اور خوش حال ہو گئے، ہر غلام کو ماہانہ تین درہم مقرر کیا اس طرح کہ جو کچھ ان کو ان کے مالکوں سے ملتا ہے اس میں کوئی کمی نہ کی جائے، ولید یہ وظیفہ غلاموں کو بچے ہوئے مال

میں سے دیا کرتا تھا، یہ بچا ہوا مال ان مجاہدین کو دیا جا سکتا تھا جن کے جہاد کی بدولت یہ ملا ہے لیکن ولید اس کو لونڈیوں اور غلاموں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا گویا اس طرح وہ غنیمت کے بعض حصوں کو غنیمت ہی میں ملا دیا کرتا تھا، . . . .

. . . .

. . . . اس لئے کہ یہ لونڈیاں اور غلام بھی تو مال غنیمت کا ایک حصہ تھے جو چاندی سونے کی طرح فاتحین میں تقسیم کر دئے جاتے تھے ایک ایسی عربی طبیعت کے جاننے والے کو جس میں جاہلیت کے کافی اثرات موجود ہیں اور جس میں اسلام کی محض ظاہری آمیزش ہے، ہرگز حیرت نہ ہوگی کہ کوفہ کے یمنی اس قریشی سے تنگ آچکے تھے جو ان کے مالِ غنیمت کا حصہ ان کے غلاموں اور لونڈیوں میں تقسیم کر دیا کرتا ہے، اور جو ان کے غلاموں اور لونڈیوں کو خوش حال بنا کر اپنانے اور اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کرتا ہے، اور اس طرح چاہتا ہے کہ غلاموں کی طاقت کو ان کے مالکوں کے مقابلے میں اگر ضرورت پڑے تو استعمال کرے راویوں کا بیان ہے کہ ولید کی معزولی پر غلاموں اور لونڈیوں نے غیر معمولی سوگ منایا، طبری کی روایت کے مطابق لونڈیوں کے مرثیے کے دو شعر یہ ہیں،

یا ویلتا قد عزل الولید + وجاءنا مجوعا سعید [افسوس ولید معزول ہو گیا اور ہم پر سعید مسلط
ینقص فی الصاع ولا یزید + فجوع الاماء والعبید ہو گیا جو بھوکا رکھنے والا ہے، تول میں اضافہ
نہیں کمی کرے گا اور غلام و لونڈی بھوکے ہوں گے]

مجھے تو یہ رجزیہ اشعار بناوٹی معلوم ہوتے ہیں اور یہ ولید کے طرفداروں کا نتیجۂ فکر ہیں، کوفہ میں رہنے والے ایرانی لونڈی اور غلام عربی ادب میں ایسی مہارت کے مالک نہیں بن گئے تھے کہ عربوں کی طرح ولید اور سعید سے متعلق اشعار کہنے لگیں، لیکن ان اشعار سے بہر حال اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی خواہ آزاد ہوں یا غلام ولید کے حامی تھے اور اس کو دوست رکھتے تھے، اس لئے کہ وہ ان کی دل جوئی اور ان سے محبت کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ راوی کوفہ والوں کے متعلق

لکھتے ہیں کہ وہ دو گروہوں میں تقسیم تھے، عوام تو اس کے ساتھ تھے لیکن خواص اس کے مخالف تھے -
اور اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ولید عوام کے لئے نرم اور خواص کے لئے نہایت سخت تھا، اگر ولید اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کی اتباع کرتا تو کوئی بھی اس کی مخالفت نہ کرتا، حضرت عمرؓ عوام کے ساتھ نرمی سے پیش آتے تھے اور خواص کے ساتھ سختی فرماتے تھے اس حقیقت کے پیش نظر کہ خواص میں ایک قسم کی خود غرضی ہوتی ہے، اور وہ جاہلی عصبیت کے زیر اثر بلندی اور برتری چاہتے ہیں، ولید نے اس حقیقت کو سامنے نہیں رکھا وہ تو صرف اقتدار کے تقاضے پورا کرتا رہا اور حکومت کے جذبات سے کھیلتا رہا، اور اس راہ میں لونڈیوں اور غلاموں کا سہارا لیتا رہا۔
پھر خواہ کچھ ہی ہو ولید معزول ہوا اور کوفہ کے اہل الرائے اس سے تنگ آ چکے تھے اور بے زار ہو چکے تھے، شہر کے ممتاز افراد اس کے دشمن ہو چکے تھے اس لئے کہ وہ جیسا کہ ہم نے واضح کیا ان کے غلاموں کے ذریعے ان کی حیثیت پست کرنا چاہتا تھا اور کوفہ کے فقہاء قرّاء اور صالحین بھی اس کے خلاف تھے اس لئے اس میں جاہلیت کے اثرات تھے جن سے اس کی زندگی بے ہودگی اور تمسخر کی زندگی تھی جو کبھی کبھی اللہ کے حدود سے بھی آگے بڑھ جاتی تھی۔

اسلام کا جمہوری نظام

از

(جناب کیپٹن محمد قطب الدین احمد صاحب)

(۳)

مذہبی آزادی کے لئے یہ واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ جب حضرت ابو بکر کے زمانے میں حضرت خالد نے حیرہ فتح کیا تو یہ معاہدہ لکھ دیا۔ نہ ان کے گرجے برباد کئے جائیں گے، نہ ان کو ناقوس بجانے سے منع کیا جائے گا اور نہ عید کے دن صلیب نکالنے سے روکا جائے گا۔ حضرت عمر نے بیت المقدس کی فتح پر خود بنفس نفیس عیسائیوں کو جو معاہدہ عطا فرمایا تھا اس سے مسلمانوں کی بے مثال رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔ "یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المؤمنین عمر نے ایلیا کے لوگوں کو دی، یہ امان ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار، اور ان کے تمام مذہب والوں کے لئے ہے۔ اس طرح پر کہ نہ ان کے گرجاؤں میں سکونت کی جائے گی نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ ان کو یا ان کے احاطے کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ مذہب کے بارے میں جبر نہ کیا جائے گا۔ اور نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ جو کچھ اس تحریر میں ہے۔ اس پر خدا، رسول، خلفاء اور مسلمانوں کا ذمہ ہے۔" جامع دمشق ایک گرجے کے متصل تھی۔ امیر معاویہ نے ضرورت کے تحت چاہا کہ اس میں توسیع کریں، مگر عیسائی گرجے کی زمین دینے پر رضامند نہیں ہوئے عبد الملک کے زمانے میں اس کی توسیع کی گئی اور گرجے کو منہدم کر کے مسجد میں شامل کر لیا گیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور میں عیسائیوں نے اس ظلم و زیادتی کی داد خواہی چاہی تو آپ نے اس حصہ کو واپس کر دینے کا حکم دیا۔ آخر مسلمانوں نے منت و سماجت کے بعد عیسائیوں کو رضامند کر لیا۔ خلیفہ چہارم کو ایک یہودی کے مقابلہ میں عدالت میں حاضر

ہونا پڑا اور قاضی نے فیصلہ یہودی کے حق میں صادر کیا۔

ذمیوں کے ساتھ محبت و ہمدردی کا ثبوت اس حدیث سے ملتا ہے جس کو قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں پیش کیا ہے۔ "جان لو کہ جو کسی معاہد (یعنی ذمی) پر ظلم کرے گا، یا اس کی طاقت سے زیادہ کام لے گا، یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر لے گا تو میں قیامت کے دن اس کا دشمن ہوں گا۔" ذمیوں کے ساتھ حضرت عمرؓ کی نقید المثال ہمدردی اس امر سے ظاہر ہوتی ہے کہ آپ نے باوجود ایک ذمی کے ہاتھ سے شہید ہونے کے وفات کے وقت جو تین ضروری وصیتیں کیں ان میں ایک یہ تھی کہ ذمیوں کے جو معاہدے ہیں، وہ پورے کئے جائیں، ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے، اور ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدافعت کی جائے۔

جان و مال کے متعلق جو حقوق دیئے گئے وہ محض نظری نہیں تھے بلکہ ان پر عمل بھی کر کے دکھلا دیا گیا۔ شام کے ایک کاشتکار نے شکایت کی کہ اہل فوج نے اس کی زراعت کو پامال کر ڈالا ہے۔ حضرت عمر نے بیت المال سے دس ہزار درہم بطور معاوضہ اس کو دلائے۔ بیت المال سے مفلس، اپاہج، سن رسیدہ، اور بے روزگار ذمیوں کو وظیفہ دیا جاتا تھا۔ . . . .

. . . . . . حضرت عمر نے قرآن کی اس آیت سے اس کا استنباط فرمایا "إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ"، اس میں فقراء سے مسلمان مراد ہیں اور مساکین سے دیگر اہل کتاب۔ بیت المال کے میر خزانہ کو لکھ بھیجا کہ اس قسم کے معذوروں اور بے روزگاروں کے لئے وظائف مقرر کئے جائیں۔

ایک بڑا حق جو رعایا کو دیا جا سکتا ہے وہ ملکی انتظامات میں ان کو شریک کرنا ہے۔ حضرت عمر اس قسم کے تمام معاملات میں جن کا تعلق ذمیوں سے ہوتا تھا، ان کے مشورے اور استصواب کے بغیر کام نہیں کرتے تھے۔ بندوبست اور اس کے متعلق تمام امور میں ذمی رعایا سے ہمیشہ رائے طلب فرماتے، اور ان کے معروضات پر ہمدردانہ غور فرماتے۔ عراق کا جب بندوبست کرنا چاہا تو پہلے عمال کو لکھا کہ وہاں کے چند معتبر لوگوں کو میرے پاس روانہ کیا جائے۔ اسی طرح مصر کے انتظام کے وقت وہاں کے گورنر کو لکھا کہ مقوقس سے خراج کے معاملہ میں رائے لی جائے۔ عراق،

مصر و شام کے دفاتر مال گذاری سریانی و قبطی وغیرہ میں تھے، دفتر کے بہت سارے عمال مجوسی یا عیسائی تھے۔ ملازمت اور خدمت ایک طرف حضرت عمرؓ نے فن فرائض کی ترتیب اور درستی کے لئے ایک رومی عیسائی کو مدینہ منورہ طلب کیا تھا۔ چنانچہ علامہ بلاذری نے اس واقعہ کو کتاب الاشراف میں بالتفصیل لکھا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں "ہمارے پاس ایک رومی بھیج دو، جو فرائض کے حساب کو درست کرے۔" غیر مسلموں کے معاشی، معاشری، مذہبی اور شہری حقوق کے لئے موسیو لیبان کا یہ قول کفایت کرتا ہے کہ "اسلامی حکومت کے ماتحت غیر مسلم ذمیوں کو وہ سب کچھ حاصل تھا، جو کسی قوم کو حاصل ہوسکتا ہے۔ البتہ صرف ایک بات کا حق نہ تھا، یعنی وہ خلیفہ نہ ہوسکتے تھے۔"

اسلام نے غیر مذہب کے ماننے والوں پر جو جزیہ عاید کیا ہے اس کو بہت اُچھالا جاتا ہے حالانکہ اگر دیکھا جائے تو ان گراں بار متعدد ٹیکسوں کے مقابلہ میں، جو مسلمانوں سے لئے جاتے تھے، یہ ایک نہایت حقیر مقدار ہے، جو سالانہ ڈھائی سے چار دینار تک تھی۔ اس سے بوڑھے بچے، عورتیں، بے روزگار اور مفلس اور معذور مستثنیٰ تھے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں سے ملکی خدمات لی جاتی تھیں، یا جو فوج میں شریک ہونا چاہتے تھے وہ بھی اس سے مستثنیٰ تھے۔ یہ محض اس خدمت کا معاوضہ تھا جو مسلمان ان کی مدافعت میں اپنے ذمہ لیتے تھے۔ جزیہ کا اصل مصرف فوجی ضروریات پر محدود تھا اور اگر اس میں مزید گنجایش ہوتی تو رفاہِ عام کے کاموں پر اسے خرچ کیا جاتا۔ جزیہ صرف حفاظت کا معاوضہ تھا۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہوتا کہ وہ ذمیوں کی خاطر خواہ حفاظت نہ کرسکیں گے، تو یہ رقم واپس کردی جاتی تھی۔ جب ہرقل نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے ایک عظیم لشکر تیار کیا تو حضرت ابو عبیدہ بن الجراح، سپہ سالار افواج شام نے اپنے عمالوں کو، جو شام کے مفتوحہ علاقوں پر مامور تھے، یہ لکھا کہ جس قدر جزیہ و خراج جہاں جہاں سے وصول کیا گیا ہے سب ان لوگوں کو واپس کردیا جائے جن سے کہ وصول کیا گیا ہے۔ اور ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم سے لیا تھا، اس شرط پر تھا کہ تمہارے دشمنوں سے تمہاری مدافعت کریں گے۔ لیکن اب اس واقعہ کے پیش آجانے کی وجہ سے ہم تمہاری حفاظت کا ذمہ

نہیں لے سکتے۔ اس پر عیسائیوں نے مسلمانوں کو دل سے دعا دی، اور کہا کہ خدا پھر تم کو ہمارے شہروں کی حکومت عطا کرے۔ رومی ہوتے تو اس موقع پر واپس کرنا تو درکنار الٹا ہمارے پاس جو کچھ ہوتا اسے بھی لوٹ کھسوٹ لیتے۔

بندگان تو کہ در عشق خدا وندانند دو جہاں را بہ تمنائے تو بفروختہ اند

خلفائے راشدین کے ذاتی حالات جن سے ان کے طرز حکمرانی پر روشنی پڑتی ہے

حضرت ابوبکر خلیفہ ہونے کے بعد بھی اپنے ہمسایوں کا کام کیا کرتے تھے جس طرح خلافت سے قبل آپ کا عمل تھا۔ آپ کا ذریعہ معاش کپڑوں کی تجارت تھا۔ معاملاتِ خلافت کی ہمہ وقت مصروفیت کے سبب جب تجارت کے ذریعہ وجہ معاش حاصل کرنے میں دشواری ہوئی تو صحابہ نے ایک متوسط الحال مہاجر کی زندگی کو بطور معیار قرار دے کر ڈھائی ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کیا، جس کو آپ نے اپنی وفات کے بعد جائیداد بیچ کر ادا کرنے کی وصیت فرمائی۔ مدینہ کے اطراف میں ایک بڑھیا اندھی محتاج رہتی تھی حضرت عمر ہمیشہ اس کے یہاں اس ارادہ سے جاتے کہ کچھ خدمت کریں، مگر جب پہنچتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی نامعلوم شخص آکر اس کے سارے کام کاج کر دیا کرتا ہے۔ ایک روز چھپ کر اس کا سراغ لگانا چاہا اور منتظر کھڑے رہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ صدیق اکبر اس ضعیفہ کی خدمت گذاری سے فارغ ہو کر جھونپڑے سے نکل رہے ہیں، حضرت عمر نے کہا کیا آپ ہی وہ شخص ہیں جو روزانہ اس کام میں مجھ پر سبقت لے جاتے ہیں۔ وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ انھیں کپڑوں میں کفنایا جائے جو کہ اس وقت جسم پر موجود ہیں۔ حضرت عائشہ نے کہا ہم ایسے تنگدست نہیں کہ آپ کو نیا کپڑا بھی نہ دے سکیں، جواب دا فرمایا گیا کہ نئے کپڑوں کے زندے زیادہ مستحق ہیں، مردوں کو نئے پرانوں کی کچھ پرواہ نہیں۔

خلیفہ ثانی کے حالات میں ہم یہاں صرف چند مثالی واقعات پر اکتفا کریں گے، یہ اتنے بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں نہایت دشوار ہے۔ ایک مرتبہ احنف بن قیس رؤسائے عرب کے ساتھ ان سے ملنے گئے تو دیکھا کہ عین دوپہر کی سخت دھوپ میں دامن چڑھائے اِدھر اُدھر دوڑتے

پھر رہے ہیں۔ احنف کو دیکھ کر کہا آؤ تم بھی میرا ساتھ دو۔ بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے تم جانتے ہو کہ ایک اونٹ میں کتنے غریبوں کا حق شامل ہے۔ ایک شخص نے کہا امیرالمومنین آپ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں، کسی غلام کو حکم دیجیے، وہ تلاش کر لائے گا۔ فرمایا مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہے، اور اگر اونٹ نہ ملے تو قیامت میں باز پرس مجھ سے ہو گی نہ کہ کسی دوسرے سے۔ ایک دفعہ خطبہ میں بلا کسی تعلق کے یہ بات ارشاد فرمائی کہ میں ایک زمانے میں اتنا نادار تھا کہ لوگوں کو پانی بھر کر لا دیا کرتا تھا وہ مجھے اس کی اجرت میں چھوہارے دیا کرتے تھے، اسی پر میری گذر بسر تھی، یہ کہہ کر منبر سے اتر آئے۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ منبر پر کہنے کی یہ کیا بات تھی۔ فرمایا میری طبیعت میں ذرا سا غرور آ گیا تھا، یہ اس کی دوا تھی۔

زید بن ثابت روایت کرتے ہیں کہ میں نے عمر کو دیکھا کہ مشک اٹھاتے ہوئے لوگوں کے درمیان سے گذر رہے ہیں نے آپ سے پوچھنا چاہا تو آپ نے فرمایا ابھی مجھ سے گفتگو نہ کرو میں کچھ دیر بعد تمہیں بتلا دوں گا۔ میں آپ کے پیچھے پیچھے ہو لیا، یہاں تک کہ ایک بڑھیا کے گھر میں یہ مشک ڈال آئے۔ میں نے گھر واپس آنے پر اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا میرے پاس فارس و روم کے قاصد ابھی آئے تھے اور میری تعریف میں اس طرح قصیدہ خوانی کر رہے تھے" تمہاری عظمت و شان کا اس وقت کوئی مد مقابل نہیں نہ تم سے بڑھ کر اس وقت علم، عدل، اور فضل میں کوئی دوسرا ہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد میرے نفس میں کچھ غرور سا پیدا ہوا، جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے، اس لئے میں نے اپنے نفس کے ساتھ وہ کچھ کیا جیسا کہ وہ مستحق تھا۔

ایک دفعہ حضرت عمر رات کو گشت کر رہے تھے کہ ایک بدو کے خیمہ سے رونے کی آواز آئی، دریافت سے معلوم ہوا کہ بدو کی عورت دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ حضرت عمر گھر آئے اور اپنی بی بی ام کلثوم کو ساتھ لے کر بدو کے خیمہ میں آئے، تھوڑی دیر کے بعد بچہ پیدا ہوا ام کلثوم نے پکار کر کہا کہ امیرالمومنین اپنے دوست کو مبارک باد دیجیے، بدو امیرالمومنین کا لفظ سن کر چونک پڑا۔ حضرت عمر نے کہا کچھ خیال نہ کرو وہ کل میرے پاس آنا، بچے کی تنخواہ مقرر کر دوں گا۔

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک روز ابن عباس کے پاس بیٹھے حضرت صدیق و فاروق کے فضائل کا ذکر کر رہے تھے حضرت فاروق کا ذکر سن کر ابن عباس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ آپ نے فرمایا میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ آپ نے اپنے لڑکے ابو شحمہ پر حد قائم کی، جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ میں ایک روز مسجد نبوی میں بہت سے لوگوں کے ساتھ عمرؓ کی محفل میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت آئی اور اپنے بچہ کو پیش کر کے رونے لگی، آپ نے اس کا سبب پوچھا تو عرض پرداز ہوئی کہ ایک روز میں بنی النجار کے باغ سے گذر رہی تھی، آپ کا لڑکا نشہ میں چور مجھے ورغلا کر باغ کی طرف لے گیا اور مجھ سے مطلب برآری کی۔ میں نے شرم و ندامت سے اس واقعہ کو اپنے عزیزوں سے پوشیدہ رکھا، جب وضع حمل ہوا تو میں نے ارادہ کیا کہ اس نومولود کا گلا گھونٹ دوں مگر مامتا غالب آئی۔ اب میں آپ سے داد خواہ ہوں کہ حکم الٰہی کے بموجب ہمارے درمیان فیصلہ فرمائیں۔ حضرت فاروق نے ہم لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا آپ منتشر نہ ہوں، میں ابھی گھر ہو کر واپس آتا ہوں گھر آ کر ابو شحمہ کو دریافت کیا، وہ کھانا کھا رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر کہا شاید یہ تمہارا آخری رزق ہے، جلد فراغت حاصل کر لو۔ یہ سن کر ان کے اوسان خطا ہو گئے اور کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ حضرت فاروق نے قسم دے کر ان سے پوچھا کیا تم نے کبھی شراب پی ہے، انھوں نے کہا ہاں مجھ سے ایک مرتبہ ایسا قصور ہوا ہے اور میں اب اس سے تائب ہو چکا ہوں۔ پھر آپ نے قسم دے کر یہ دریافت فرمایا کہ کیا تم نے حالت نشہ میں کسی عورت سے بدکاری کی تھی۔ اس پر انھوں نے شرم و ندامت سے اپنا سر جھکا لیا دوبارہ پوچھنے پر اپنے جرم کا اعتراف اور توبہ و انابت کا اقرار کیا۔ آپ نے فوراً ان کا گریبان تھام لیا اور کشاں کشاں مسجد کی طرف لے آئے۔ یہاں اصحاب رسول کا مجمع پہلے سے موجود تھا۔ آپ نے سب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا عورت سچ کہتی ہے اور ابو شحمہ مجرم ہے۔ اپنے غلام افلح کو حکم دیا کہ کپڑے اتروا کر اس پر حد جاری کی جائے۔ ابو شحمہ نے رحم کی درخواست کی، حضرت فاروق نے رد کر جواب دیا کہ اللہ تم پر رحم کرے، میں نے حد تم پر اسی لئے جاری کی ہے کہ پروردگار تم پر رحم کرے جب ابو شحمہ درد کی تاب نہ لا کر ضعیف و ناتواں ہو گئے تو اصحاب رسول نے سفارش کی کہ کسی اور وقت

بقیہ حد کو اٹھا رکھا جائے، فرمایا جب معصیت میں دیر نہیں کی تو حد میں کیوں کر تاخیر کی جا سکتی ہے
اسی اثنا میں ان کی والدہ کو خبر ہوئی وہ روتی ہوئی آئیں کہ میں ایک ایک درے کے عوض بدل
حج کروں گی اور اتنا صدقہ دوں گی، فرمایا حج و صدقہ حد کا قایم مقام نہیں ہو سکتا۔ جب دُرہ زنی
اپنی آخری حد کے قریب پہنچی تو ابو شحمہ نے اپنی نحیف آواز میں 'یا ابت السلام علیک' کہا
حضرت فاروق نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا اگر تم محمد صلعم سے ملو تو آپ کو میرا سلام پہنچاؤ
اور یہ عرض کرو کہ میں نے عمر کو قرآن پڑھتے اور حدود قایم کرتے ہوئے چھوڑا ہے۔ آخری دُرہ پر
ابو شحمہ نے ایک چیخ ماری اور جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ حضرت فاروق نے دوڑ کر گود میں اٹھایا
آنکھیں اشکبار تھیں، دل و جگر کے ٹکڑے ہوئے جا رہے تھے۔ آپ پیشانی اور لبوں کو چومتے
ہوئے اپنی بھرّائی ہوئی آواز میں یہ فرماتے جا رہے تھے کہ تیرا باپ تجھ پر قربان ہو، تو حق پر قتل ہوا،
تو کس قدر ثابت قدم رہا کہ آخری حد پر اپنی جان دی تاکہ شریعت کا کوئی قرض تجھ پر باقی نہ رہے۔
تیرے عزیز و اقارب اور تیرا باپ جس کے ہاتھوں میں عنانِ اقتدار ہے اللہ کے حکم کے آگے تجھ پر
رحم نہ کھا سکے۔ خدا تجھے اپنی رحمتوں کی آغوش میں لے لے۔

محب طبری نے ریاض النضرۃ میں سالم بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ عمر جب لوگوں کو کسی
بات سے منع کرتے تو گھر والوں کو اس بات سے آگاہ کر دیتے کہ میں نے فلاں فلاں امور سے منع
کیا ہے۔ قسم خدا کی اگر تم میں سے کوئی ان باتوں کا مرتکب ہوگا تو میں اس کو اپنی قرابت کی وجہ سے
دونی سزا دوں گا۔

امام غزالی بیان کرتے ہیں کہ عمرؓ کے پاس ایک گواہ نے اپنی شہادت پیش کی آپ نے فرمایا
کسی ایسے آدمی کو لے آؤ، جو تم سے واقف ہو، وہ ایک آدمی کو لے آیا، اس نے اس کی صداقت
کی تعریف کی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا تم ان کے پاس رہتے ہو، جو ان کے حال سے واقف ہو، انہا
نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا کیا کبھی سفر میں ان کا ساتھ ہوا ہے، اس کا جواب بھی نفی میں ملا آپ
نے پھر استفسار فرمایا کیا کبھی کسی قسم کا رقمی معاملہ ان سے ہوا ہے، اس کا بھی جواب اثبات میں نہ ملا

اس پر آپ نے ارشاد فرمایا شاید تم نے ان کو مسجد میں ہمیشہ نماز اور قرآن پڑھتے دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ آپ نے کہا جاؤ تم ان کو مطلق نہیں پہچانتے اور گواہ سے کہا تم کسی دوسرے آدمی کو لے آؤ جو تمہارے حال سے بخوبی واقف ہو۔

ایک مرتبہ آپ کی زوجہ محترمہ ام کلثوم نے قیصر روم کی بیوی کے پاس چند عطر کی شیشیاں بطور تحفہ کے روانہ کیں۔ اس نے اس کے جواب میں جواہرات سے بھری ہوئی کشتیاں بھیجیں حضرت عمر کو علم ہوا تو فرمایا گو عطر تمہارا ذاتی تھا لیکن قاصد جو لے گیا وہ سرکاری تھا، اس کے علاوہ کیا اس سے قبل بھی تمہارے پاس ایسا کوئی تحفہ آیا تھا، چونکہ یہ محض امیر المؤمنین کی بیوی ہونے کے سبب بھیجا گیا ہے، اس لئے یہ عام مسلمانوں کا حق ہے، یہ کہہ کر تمام جواہرات بیت المال میں داخل کر دئے۔ ایک دفعہ سفر شام میں نفیس ولذیذ غذائیں پیش کی گئیں، دریافت فرمایا عام مسلمانوں کو بھی یہ الوان نعمت میسر ہیں، لوگوں نے عرض کیا ہر شخص کے لئے یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے، فرمایا تو پھر مجھے بھی اس کی ضرورت نہیں۔

اپنے ذاتی نفع پر دوسروں کو ترجیح دینا اخلاق انسانی کا انتہائی کمال ہے۔ حضرت عثمان کی زندگی میں یہ وصف ہر موقع پر نمایاں نظر آتا ہے۔ چونکہ آپ نہایت دولت مند تھے اس لئے ایام خلافت میں ذاتی مصارف کے لئے بیت المال سے ایک حبہ نہیں لیا، اور اپنا مقررہ وظیفہ عام مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا۔

حضرت علی نہایت زاہدانہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، موٹا جھوٹا لباس، روکھا پھیکا کھانا ان کے لئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت تھی۔ آپ ان ہی سادہ اور معمولی کپڑوں میں باہر نکلتے جب کوئی تعظیماً آپ کے ہمراہ چلتا تو منع فرماتے، اور کہتے کہ اس میں والی کے لئے فتنہ اور مومن کے لئے ذلت ہے۔

یہ زندگی تھی ان حکمرانوں کی جن کے قدموں کے نیچے اس وقت کی ساری متمول دنیا روندی جا رہی تھی، اس وقت کوئی قوت ایسی نہیں تھی جو ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ جس طرف کا وہ رخ

کرتے فتح واقبال ان کے قدم چومتے - دنیا اپنے سارے خزانے اگل رہی تھی - دولت وثروت چاروں طرف سے امنڈی چلی آرہی تھی اور زر وجواہرات کے قدموں پر نچھاور ہو رہے - مگران کی سیر چشمی، فراخ دلی، ایثار وبے نفسی کا یہ عالم تھا کہ اپنے ذاتی عیش وآرام کے لئے اس میں سے ذرا بھی خرچ کرنا سخت ناگوار تھا - اپنے حصہ سے زائد لینا تو درکنار، جو کچھ بطور حق کے ان کو ملتا تھا وہ بھی راہِ خدا میں صرف کر دیا کرتے تھے - اپنے لئے نہ انھوں نے محل بنوائے اور نہ گھر پر حاجب و دربان رکھا ایک عام متوسط الحال شہری کی طرح زندگی بسر کرتے تھے - کیا دنیا ایسے حکمرانوں کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے -

اے نونہالانِ ملت اسلامی! کبھی تم نے اپنی تاریخ کے اس عظیم ورثہ پر بھی غور کیا ہے، یا تمہارے پیشِ نظر عہدِ حاضر ہی کے چند باطل نقوش ہیں، جن پر تم فریفتہ ہو، یا جن کو تم اپنے لئے ایک نمونہ و مثال بنائے ہوئے ہو -

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے — وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں — کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری — وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا
سماں الفقرُ فخری کا رہا شانِ امارت میں — بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے — کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے — جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

چو علمت ہست، خدمت کن چو بے علماں کہ زشت آید
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

ہماری موجودہ بیماریوں کا علاج نہ اشتمالی روس کی پیروی میں ہے، اور نہ امریکہ کی طرف دامن پھیلانے میں، جن امراض سے یورپ کو تندرستی حاصل ہوئی، نہ اس کا ہم شکار ہیں، نہ وہ علاج ہمارے لئے مفید ہو سکتے ہیں جن سے کہ وہ صحت یاب ہوا - ہماری خستہ حالیوں کے اسباب دوسرے ہیں -

کچھ اور بات ہے جس کو کہ تو سمجھتا ہے — زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

ہم کو اپنے ان دکھوں کا مداوا اپنے ہی شفاخانے سے کرنا چاہیے۔ مغربی اقوام کی سابقہ اور موجودہ حالت کو پیشِ نظر رکھ کر اس کا انطباق اپنے حالات پر کرنا ایک طرح کا قیاس مع الفارق ہے اقبال نے اسی غلط اندیشی کی طرف ہمیں آگاہ کیا ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر　　خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار　　قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں　　اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

ہم کو چاہیئے کہ پوری اخلاقی جرأت اور علمی دیانت و صداقت کے ساتھ ان جمہوری اصول و اساسات کو دنیا کے سامنے پیش کریں، جن کی تعلیم ہمیں کتاب و سنت سے حاصل ہوتی ہے۔ خواہ یہ اصول موجودہ مغربی نظامِ سیاست کے معارض ہوں یا موافق۔ مغرب نے بہت سے ایسے نسخے اب تک آزمائے ہیں، جن سے اگر کچھ بیماریوں کا علاج ہوا ہے تو اس کی جگہ بیسیوں نئے امراض بھی پیدا ہوئے ہیں۔ کیوں نہ نظامِ سیاست کے اس اسلامی نسخے کو بھی آزمایا جائے اور دیکھا جائے کہ کہاں تک یہ ازالۂ مرض اور شفایابی میں کارگر ہو سکتا ہے۔

اسلامی حکومتوں کی یہ عجیب بدبختی رہی ہے کہ خلافتِ راشدہ کے دور کے بعد، بجز ایک واحد استثنائی صورت کے، کبھی انھوں نے اپنی خود غرضیوں اور مفاد پرستیوں کے تحت دنیا کے سامنے کوئی حقیقی اسلامی حکومت کا نمونہ پیش نہیں کیا۔ کہا جاتا ہے کہ زمانہ اس وقت اتنا پیچھے تھا کہ حکومت کے ان اعلیٰ اصولوں کے قبول کرنے کی اس میں مطلقاً صلاحیت نہیں تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے ایک مختصر سے تیس سالہ دور کے بعد اس کا پھر دوبارہ احیا نہ ہو سکا۔ مگر اب جب کہ زمانہ ان اصولوں کے قبول کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو مغرب زدگی نے ان میں ایسا احساس کمتری پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنی کوئی چیز دنیا کے سامنے پیش کرنے سے ہچکچاتے ہیں، اور مرعوب ذہنیت نے ان کی نظروں میں اپنے ہاں کی ہر چیز کی قدر و منزلت گھٹا دی ہے۔ اسلامی حکومت اور اسلامی نظامِ سیاست کے زبانی دعوے تو بہت کئے جاتے ہیں، مگر دورِ حاضر میں کوئی مملکت ایسی نہیں جو اسلام

کا سچا نمونہ ہو۔ جس شکل و صورت میں وہ اس وقت موجود ہیں وہ یا تو مغرب کے اصولِ حکمرانی کی اندھی تقلید ہے، یا ملوکیت، اعیانیت اور عددیت کے فاسد نظامات۔ وقت کے تقاضے اور زمانے کی لب تشنگیاں خود دورِ حاضر کو اس سرچشمہ پر پہنچادیں گی، اور شاید اس طرح پر پھر دوبارہ کعبہ کو صنم خانہ سے پاسباں مل جائیں چنانچہ اقبال نے ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی ایک خیالی مجلس ترتیب دی ہے، اس میں ابلیس کی زبانی اس کے مشیروں کے سامنے اسی اندیشہ کا اظہار کیا گیا ہے

عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن مجھ کو خوف ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

احادیث و آثار میں مختلف پیرایۂ بیان کے ساتھ اسلام کے اس آخری دور کی بشارت دی گئی ہے، جو اپنی برکتوں اور سعادتوں کے اعتبار سے خیر القرون کے خصائص تازہ کردے گا جس کے متعلق حضورؐ کا ارشاد ہے کہ نہیں کہا جاسکتا کہ میری امت کی ابتدا زیادہ کامیاب تھی یا اس کی انتہا۔ "لیظھرہٗ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون" کا الٰہی فرمان اپنے کامل معنوں میں اسی وقت پورا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مایوسیوں اور نامرادیوں کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں، جس کے بادل اس وقت کرۂ ارض کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ایک مومن کی نظرِ فراست ان میں آفتابِ اقبال کی جھلکیاں دیکھ رہی ہے۔ بلکہ ظلمت و تاریکی کا ہر اضافہ اسی نسبت سے لمحہ بہ لمحہ طلوعِ صبح کو قریب سے قریب تر کرتا چلا جا رہا ہے۔ اِنَّ مَوْعِدَھُمُ الصُّبْحُ، اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ط

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو

تو بستن در و من فتحِ باب می شنوم

عروج وزوال کے الٰہی قوانین

از

(جناب مولوی محمد تقی صاحب امینی)

(۳)

اصلح قوم کے معاشرہ کا نشوو ارتقا ہوتا رہنا ضروری ہے

یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن حکیم نے "اصلحؔ" کے لئے جو معیار قائم کیا ہے اور جو حدود و نقوش متعین کئے ہیں وہ سب حقیقی و دائمی قیام وبقاء کے لئے ہیں یعنی دنیا کی جو قوم ٹھیک ٹھیک اپنے آپ کو اس معیار کے مطابق بنالے گی اُسے کبھی زوال نہ ہوگا۔ اور جس قدر اس سے دور ہوتی جائے گی اسی مناسبت سے اس کا زوال ہوتا جائیگا۔

ؔ جدید دنیا نے بھی "بقاء اصلح" کا نظریہ پیش کیا ہے۔ یوں تو اس کا ثبوت قدیم مذاہب اور قدیم نظریات میں بھی ملتا ہے لیکن چونکہ "ڈاروِن" نے نہایت واضح دلائل پیش کر کے اس کو تمام علمی شعبوں پر حاوی بنا دیا ہے اس لئے اس زمانہ میں انہیں کے نام کے ساتھ اس کی شہرت ہوگئی ہے۔

یہ مسئلہ آج علمی دنیا کا ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے اور علوم وفنون کا کوئی شعبہ ایسا باقی نہیں بچا ہے جو اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔ ڈاروِن نے اس کو جس حیثیت اور جس نوعیت سے پیش کیا ہے وہ میرے موضوع بحث سے خارج ہے البتہ اس سلسلہ کی یہاں چند چیزیں ذکر کردینی ضروری ہیں تاکہ قومی اور جماعتی زندگی پر اس کا جو اثر پڑتا ہے اس کی وضاحت ہوسکے۔

"اخلاقیات" کے مصنف پروفیسر جان ڈیوی اور پروفیسر جیمس ایچ ٹفٹس کہتے ہیں۔

"ڈاروِن" کے نزدیک "بقاء اصلح" کے معنی یہ ہیں کہ کل جاندار، نباتات، حیوانات اور انسان سب کے سب دراصل زندگی کی کم ترقی یافتہ شکلوں سے عالم وجود میں آتے ہیں اور انواع میں باہمی امتیاز دراصل اُن انواع کی بقاء سے ہوتا ہے جن کے اعضاء وقویٰ اس ماحول کے مناسب ہوتے ہیں جس ماحول میں یہ واقع ہوگئے ہیں۔ اس طریق سے "بقاء اصلح" ایک ایسی تدبیر ہے جس کے ذریعہ سے ارتقا ہوتا ہے۔ ڈاروِن اس امر کو "کشمکش حیات" کہتا ہے۔

ہر فرد کشمکش حیات یا تنازع للبقاء میں مصروف ہے .... اس کشمکش میں جن کو مدافعت کے مناسب آلات میسر آتے ہیں وہ باقی رہتے ہیں اور جو غیر موزوں اور ناقابل ہوتے ہیں وہ صفحۂ ہستی سے محو ہوجاتے ہیں۔

کیوں کہ قرآنی صلاحیت دراصل "افادیت" کے پیمانہ سے ناپی جاتی ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ صلاحیت کے مفہوم کو اخلاقیت یا مادیت کے کسی ایک گوشہ تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ایک طرف اخلاقیت کی اعلیٰ پیمانہ پر تنظیم ہو اور دوسری طرف مادیت کا ارتقار ہوتا رہے۔ اگر دونوں میں کسی ایک سے غفلت برتی گئی تو اس کا خمیازہ زوال اور خسران کی شکل میں قومی زندگی کو بھگتنا لازمی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس کو ڈارون "انتخاب فطرت" کہتا ہے (اخلاقیات باب ش صنہ ۲۲)

اس موقع پر تین اصطلاحیں ذکر کی گئی ہیں۔ (۱) تنازع للبقار یعنی زندہ اور باقی رہنے کے لئے باہمی کشمکش۔ (۲) انتخاب طبعی یا فطری یعنی جو چیزیں باقی رہنے کے لائق ہیں نطری اور طبعی طور پر قیام و بقار کے لئے انھیں کا انتخاب۔ (۳) بقار اصلح یعنی وہی چیزیں باقی رہتی ہیں جن میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے

اسی سلسلہ کی ایک اور اصطلاح "قانون وراثت" ہے یعنی نسلی اوصاف وراثت کے طور پر منتقل ہوتے رہتے ہیں غرض انھیں چاروں پر اس مسئلہ کی بنیاد ہے۔

"بقار اصلح" کی مذکورہ توجیہ کی بنار پر انسان اور حیوان ایک ہی نسل سے قرار پاتے ہیں یعنی حیوان کی تدریجی ارتقار کی شکل انسان ہے اور گوریلا بندر انسان بننے کا ابتدائی نقشہ ہے۔

جب انسان کی اصلیت حیوان تسلیم کرلی گئی تو لازمی طور سے اس کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک ایسی زاویۂ نگاہ درکار ہوگی جس میں حیوانیت کے خدوخال اُبھرے ہوئے ہوں۔ چنانچہ اس نظریہ کی بنیاد پر جن قوموں کے تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے ان کے یہاں گھریلو زندگی سے لے کر قومی اور بین الاقوامی معاملات کے حل کرنے تک یہی زاویۂ نگاہ کارفرما ہے۔ اسی بنار پر وہاں اخلاقیات سے بہت حد تک بے اعتنائی برتتے ہوئے مادیات کی فراہمی پر اتنا زیادہ زور صرف کیا جاتا ہے کہ جیسے دیکھنے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ دراصل "بقار نوع" کا راز اسی میں پوشیدہ ہے اور وہی قوم "اصلح" ہوسکتی ہے جس کے پاس مادی طاقت کے زیادہ سے زیادہ انبار ہوں۔

اس غلط اندیشی کی بنیاد قوانین عروج و زوال کا تحقیقی و تنقیدی نظر سے مطالعہ نہیں ہے بلکہ ماہیت انسانی کی غلط ترجمانی ہے جیسا کہ اس کی وضاحت اگلے صفحات میں ہوگی پھر یہی مصنفین آگے چل کر کہتے ہیں

"ڈارون" کو زیادہ تر انواع کے طبعی ارتقار سے دلچسپی تھی اس نے اخلاقی حیثیتوں کو بھی اسی طرح سے توجیہ کرنے کے امکان کی طرف توجہ دلائی ہے مگر اس موضوع پر تفصیلی بحث "ہربرٹ اسپنسر" نے کی ہے اور اس نے تصور ارتقار کو ڈارون سے بالکل علیحدہ معنوں میں لیا ہے اور اس کو اخلاقیات ہی پر نہیں بلکہ کل انسانی معاہدو واجبات پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے .... اسپنسر ارتقار سے اجسام کے طبعی نشوونما (حیاتیات) ہی میں کام نہیں لیتا بلکہ بنی نوع انسان کے اخلاقی نشوونما (اخلاقیات) اور معاشروں کے ارتقار (اجتماعیات) میں استعمال کرتا ہے "ڈارون کے تعقل ارتقار یعنی انواع میں باہمی امتیازات کے ساتھ ساتھ نشوو

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

یعنی اگر صرف مادیت کی طرف توجہ کی گئی اور اس کے ساتھ بلند تصورات اور اخلاقی اقدار کی تنظیم نہ ہوئی تو آگے چل کر وہ مادیت غیر مفید بلکہ تباہ کن بن جائے گی چنانچہ جو قومیں اپنے اندر چند اخلاقی تبدیلیاں پیدا کر کے ترقی کی راہوں سے شناسا ہوئیں اور پھر بعد میں اپنا سارا زور مادیت کی طرف لگا دیا بالآخر یہی مادیت ان کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی۔ تاریخ میں ایسی قوموں کے قیام و بقار کی مدت ان قوموں کے مقابلہ میں بہت کم ملتی ہے جنہوں نے دونوں کے ساتھ ساتھ ترقی کی منزلیں طے کیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مادیت کے ہر موڑ اور ہر موقف یعنی اس کو فراہم کرنے اس کو برقرار رکھنے اور اس کا مصرف متعین کرنے غرض ہر مقام پر اخلاقیت کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اسی بنا پر "شوقی" نے کہا ہے

وانما الاخلاق ما بقیت   فان هم ذهبت اخلاقهم ذهبوا

قومیں اس وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک ان میں اخلاق باقی رہیں اور جب اخلاق ختم ہو جاتے ہیں تو وہ قومیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح بلند تصورات اور اخلاقی اقدار کے ساتھ مادیت کا ارتقار نہ ہوتا رہا تو یہ مسلمہ بات ہے کہ اس سے نہ تو کوئی مضبوط اور پائدار کلچر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ باقی رہ سکتا ہے۔ بلکہ جب قومی زندگی کی ایسی شکل ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس میں اخلاقیات کی تنظیم نہ ہونے کو بہت دخل ہے ورنہ ٹھیک تنظیم کے بعد ناممکن ہے کہ صلاحیتیں مادیات کے نشوو ارتقار کی طرف نہ لگ جائیں۔

تاریخ میں ایسی قوموں کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ جب ان سے قوت و طاقت سلطنت اور دولت چھن جانے کی وجہ سے مادی ارتقار کا سلسلہ ختم ہو گیا تو ان کا علم و تہذیب اور تمدن و شائستگی سب رخصت ہو گئے بلکہ رفتہ رفتہ وہ قومیں بھی ختم ہو گئیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ارتقار کو بھی تسلیم کرتا ہے بلکہ اس میں اور زیادہ وسعت اور عمومیت پیدا کرتا ہے اس طرح سے گو ارتقار کو وہ ایک ایسا عمل سمجھتا ہے جس کی وجہ سے ہم جنس مختلف جنس ہو جاتے ہیں اور سادہ پیچیدہ ہو جاتے ہیں (اخلاقیات ۳۰)

اس بارے میں قرآن حکیم نے جو انتظامات کئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن حکیم کے انتظامات کی تفصیل

(۱) قومی و جماعتی زندگی میں اس نے چند اجتماعی و اخلاقی کمزوریوں کے دور کرنے پر اکتفا نہیں کیا جیسا کہ موجودہ دنیا کی قوموں اور تنظیموں کا حال ہے بلکہ اس نے ایمان کے ذریعہ ایک گہری اور ہمہ گیر تبدیلی پر زور دیا اور ساتھ ہی ساتھ تربیت کا باقاعدہ پروگرام پیش کیا۔

(۲) "عملِ صالح" کے مفہوم میں ایسے زندگی بخش اصولوں کی طرف اشارہ کیا کہ جن پر عمل کرنے سے نہ صرف یہ کہ تمدن کا نشوو ارتقاء ہوتا رہتا ہے بلکہ ان "جراثم" کی پیدائش پر بھی پابندی لگ جاتی ہے جو آگے چل کر تمدن کے دشمن ثابت ہوتے ہیں قرآن کی نظر میں ایمان اور عمل صالح کی اصطلاح بڑی زوردار اور جان دار ہے بدقسمتی سے ان کا اصل مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے انھیں بے جان بنا دیا ہے۔ اگر ٹھیک ٹھیک ان کا قرآنی مفہوم واضح ہو جائے تو عروج زوال کی بحث میں نہ قوموں کی تاریخ کھنگالنے کی ضرورت پڑے اور نہ "عمرانیات و اجتماعیات" کی کتابیں پڑھنے کی بلکہ قوموں کی موت و حیات کے بارے میں ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہمارے سامنے آجاتا ہے

(۳) "ایمان بالیوم الآخر" کے ذریعہ زاویۂ نگاہ میں بنیادی تبدیلی کا حکم دیا۔ اور جزار و سزا کا نظام پیش کرکے انسان کو اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار قرار دیا۔ جواب دہی کا یہ قرآنی تصور انسان کو گوشۂ تنہائی میں بھی دشمن تمدن "جراثیم" کی پیدائش پر پابندی لگا دیتا ہے۔

(۴) "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کو قومی زندگی کا نصب العین ٹھہرایا جس سے ایک طرف تو "معروف" کی پرورش اور نشوونما ہو کر پورے ماحول پر معروف کا غلبہ ہو جاتا ہے اور دوسری طرف "منکر" پر قابو پانے کی جدوجہد برابر جاری رہتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ تمام وہ چیزیں اکٹھا ہوتی رہتی ہیں جو تمدن کو پروان چڑھاتی ہیں اور وہ باتیں کم ہو جاتی ہیں جن سے تمدن کو نقصان پہنچتا ہے۔

اس سلسلہ کی چند آیتیں یہ ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ	بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین میں سے جو لوگ اللہ پر

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ	اور آخرت[2] کے دن پر ایمان لائے اور عمل صالح کئے
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ	تو ان کے رب کے پاس انھیں ضرور اجر ملے گا اور
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۲/۶۲	نہ انھیں کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔
كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی اصلاح اور درستی
تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ	کے لئے ظہور میں آئی ہے تم نیکی[4] کا حکم دینے والے
الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۳/۱۰۹	برائی[5] سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو

قوموں کی تنظیم کی دو شکلیں ہیں (۱) پہلی یہ کہ چند اجتماعی کمزوریاں دور کر کے کسی انقلاب کو "خوش آمدید" کہنے کے لئے انھیں تیار کر لیا جائے۔ (۲) اور دوسری یہ کہ ہر ہر فرد کی زندگی میں ایک گہری تبدیلی پیدا کی جائے ان کا زاویۂ نگاہ بدلا جائے اور زندگی کے ہر موڑ اور ہر موقف پر ان کی تربیت کی جاتی رہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں تنظیموں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، پہلی صورت میں خرابیاں اور دشمنِ تمدن جراثیم جلد غلبہ پا جائیں گے جس کی بناء پر جلد ہی وہ قوم ترقی سے تنزل کی طرف آجائے گی اور دوسری صورت میں اگر ٹھیک ٹھیک عمل درآمد ہوتا رہا تو خرابیوں کے غلبہ پانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اگر قومی زندگی کو سستی و کاہلی اور عیش پرستی نے گھیر لیا تو چونکہ اٹھان اس کی مضبوط تھی اس لئے ہلاکت و بربادی کے لئے ایک مدت درکار ہوگی[1]۔

---

[1] اس موقع پر ایک اور بات ذکر کر دینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کسی قوم کے بارے میں یہ معلوم کرنا، اس کی ترقی کی داغ بیل کب سے پڑی ہے یا اس کے زوال کی ابتدا کب سے ہوتی ہے نہایت دشوار امر ہے۔

دراصل ابتدا میں کچھ ایسے محرکات پیدا ہوتے ہیں جو لاشعور میں اپنا اثر کرتے رہتے ہیں اور ظاہر بیں نظریں ان کے سمجھنے سے قاصر ہوتی ہیں یہ حالت زوال پذیر قوموں کے بارے میں چند در چند غلط فہمیوں کا موجب بنتی ہے ایک طرف ان کا ترقی یافتہ تمدن بھی موجود رہتا ہے اور دوسری طرف وہ جراثیم پیدا ہوتے رہتے ہیں جو تمدن کے دشمن ہیں۔

پسماندہ اور احساس کمتری میں مبتلا قومیں اس حالت سے بالعموم دھوکہ کھا کر ان کے تمدن کی ہر ہر چیز کی نقالی کرنے میں فخر سمجھتی ہیں چونکہ ان پسماندہ قوموں میں اچھائیوں کے قبول کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے اور

(بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

قرآنِ حکیم نے دوسری قسم کی تنظیم کا حکم دیا ہے اور اس کے قیام و بقاء کے لئے ایمان وعمل صالح کا جامع نظام پیش کر کے معاشرہ کے ارتقاء کو ضروری قرار دیا ہے

ذیل میں چند آیتیں ذکر کی جاتی ہیں جن سے اخلاقیات کی اعلیٰ پیمانہ پر تنظیم اور مادیات کے ارتقاء کا ثبوت ملتا ہے نیز ان دونوں کے مجموعہ سے معاشرتی ارتقاء کی وضاحت ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں چند آیات قرآنی سے استشہاد		
	وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ	جہاں تک ہوسکے قوت وطاقت کے سامان پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے تیار رہو اس تیاری سے تم اپنے اور اللہ کے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو گے اور ان لوگوں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں لیکن اللہ انھیں جانتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) برائیوں کے قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوجاتی ہے جبھی تو وہ پسماندہ ہوتی ہیں اس لئے اس نقالی سے ان کے حصہ میں اچھائیاں کم اور برائیاں زیادہ آتی ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ کسی ترقی یافتہ تمدن کا اثر دوسری قوموں پر پڑنا ناگزیر ہے بلکہ ہر نیا تمدن بہت حد تک دوسری بہت سی قوموں اور تمدنوں کا خوشہ چیں ہوتا ہے اس لئے داعی انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خوشہ چینی کا ایک عجیب وغریب طریقہ ارشاد فرمایا ہے کہ جس پر عمل کر کے دوسروں کی اچھائیوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور برائیوں سے احتراز کیا جاسکتا ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام آپ نے یہ کیا کہ اچھائی اور برائی کا معیار مقرر کیا پھر ذہنی تبدیلی کے ذریعہ ہر اچھائی کو اپنانے اور قبول کرنے کا حکم دیا خواہ کہیں بھی پائی جائے اور ہر برائی سے بچنے کی تاکید کی خواہ کتنے ہی خوشنما پردوں میں لپیٹ کر آئے۔ اچھائیوں کے بارے میں آپ نے فرمایا

الكلمة الحكمة ضالة المؤمن فحيث وجدها فهو احق بها (الحدیث)	ہر حکمت واچھائی مومن کی گم شدہ چیز ہے جہاں کہیں پائے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔

اس میں بنیادی نکتہ یہ ہے اچھائی جب دوسرے سے کی جائے تو اپنی چیز سمجھ کر لی جائے نہ کہ دوسروں کی چیز سمجھ کر اس طریق سے ہر خوددار قوم دوسروں کی برائیاں لینے سے احتراز کرے گی کیوں کہ وہ اس کی نہ ہوں گی اس حدیث سے ہر ہر قدم پر دوسری قوم کی نقالی کرنے کا معاملہ ختم ہوجاتا ہے۔

برائیوں کے بارے میں آپ نے فرمایا

من تشبه بقوم فهو منهم (الحدیث)	جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انھیں میں سے سمجھا جائے گا۔

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

آیت میں بصیغۂ امر قومی زندگی کے ہر موقف اور ہر موڑ پر قوت و طاقت کے سامان سے لیس ہونے کا حکم دیا گیا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کوئی دور ایسا نہیں ہے کہ اس کشمکش حیات میں مادیت کے بغیر کام چل سکے۔

نیز "من قوۃ" کے لفظ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہست و بود کی دنیا میں مادی ارتقار ضروری ہے اور اس ارتقار کا ساتھ دیئے بغیر کوئی قوم اپنے کو باقی نہیں رکھ سکتی ہے۔ چنانچہ یہ لفظ اپنے وسیع اور جامع مفہوم کی بنا پر زمانہ کے تقاضا کے مطابق قوت و طاقت کے ہر ضروری سامان کو شامل ہے۔

اور "ما استطعتم" کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک تمہارے بس میں ہے اپنے مقدور کے مطابق قوت و طاقت کا سامان فراہم کر کے مزاحمت اور مدافعت کے لئے ہر وقت تیار رہو ایسا نہیں ہے کہ جب تک دنیا جہان کے ہتھیار اور سامان جنگ نہ مہیا ہو جائیں اس وقت تک برابر بے بسی کا عذر ہوتا رہے۔

پھر اس کے بعد کی چند آیتوں میں ایسے اخلاقی اوصاف کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو زندگی کو منظم کر کے اس میں حرکت و عمل پیدا کر دیتے ہیں مثلاً (۱) ایمان و یقین (۲) ایثار و قربانی (۳) تنظیم جماعت (۴) اعتماد و توکل (۵) تائید غیبی کی امید (۶) محبت و رحمت

جو لوگ قوموں اور جماعتوں کی "نفسیات" سے واقف ہیں وہ اس امر کو بخوبی جانتے ہیں کہ ان اوصاف کا اثر ان کی زندگی پر کتنا اور کس قدر پڑتا ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ	اے ایمان والو اللہ کے لئے مضبوطی سے قائم رہنے
لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ	والے اور انصاف سے گواہی دینے والے ہو جاؤ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اچھائی اور برائی کا معیار مقرر ہونے کے بعد کوئی باعزت قوم جس کے پاس تھوڑی سی بھی قومی حمیت اور غیرت باقی ہوگی وہ اس بات کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہ ہوگی کہ دوسری قوموں کی برائیاں اختیار کر کے اپنے دامن پر اس جیسا ہونے کا بدنما دھبہ لگائے اور اپنی ہلاکت کے لئے گڈھا کھود دے نفسیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ داعی انقلاب نے ان دونوں حدیثوں میں کیا کچھ کہہ دیا ہے ۱۲

شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا ۟ هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ

کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کے لئے نہ آمادہ کرے کہ اس کے ساتھ بے انصافی کرو ہر حال میں انصاف کرو یہی تقویٰ سے لگتی بات ہے اور اللہ سے ڈرو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۚ اِنۡ یَّکُنۡ غَنِیًّا اَوۡ فَقِیۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰی بِهِمَا ۟ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰۤی اَنۡ تَعۡدِلُوۡا ۴ ۱۳۴

اے ایمان والو مضبوطی کے ساتھ انصاف پر قائم رہنے والے اور خدا لگتی گواہی دینے والے ہو جاؤ اگرچہ یہ گواہی اپنے نفس یا ماں باپ اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو (جن کے خلاف گواہی دی جا رہی ہے) اگر ان میں کوئی مالدار یا محتاج ہے (تو تمہیں اس کی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ) اللہ سب سے بڑھ کر ان کی پرداخت کرنے والا ہے (کہیں) ان کی خاطر تم اپنی خواہش کی اتباع کرکے حق وانصاف سے انحراف نہ کر جاؤ۔

یعنی اخلاق کی ایسے اعلیٰ پیمانہ پر تنظیم ہونی چاہیئے کہ اس کے نفاذ میں کسی گروہ کی دشمنی یا کسی عزیز سے عزیز ترین کی جانب داری حتیٰ کہ اپنی ذات کی رعایت کو بھی دخل نہ ہو۔

قرآن حکیم نے عدالت پر سب سے زیادہ زور دیا ہے قومی زندگی کی روح رواں یہی خصلت ہے، اور "اصلح" بننے کے لئے یہی معیار ہے۔

قرآن حکیم میں "عدل" اور "عدالت" پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اس لئے یہاں اس کی تشریح کر دینا چاہیئے تاکہ قومی زندگی میں اس کا مقام واضح ہو سکے نیز یہ بات معلوم ہو جائے کہ قوم کو اصلح بنانے میں اسے کس قدر دخل ہے۔

اس بارے میں دنیا کے چند مشہور مفکرین کے خیالات یہ ہیں۔

امام غزالیؒ نے "عدل" کو مجموعۂ فضائل قرار دیتے ہوئے اس کی یہ تعریف کی ہے

"قوتِ عقلی اور قوت شہوانی کی ضروری ترتیب اور پھر اس ترتیب کے مطابق ان قوتوں کے وجود پذیر ہونے کا نام "عدل" ہے۔"

پھر کہتے ہیں۔

"عدل چوں کہ مجموعۂ فضائل کا نام ہے اس لئے فضائل کے تینوں اصول (عفت۔ حکمت۔ شجاعت) کے فروع خود عدل کے فروع ہیں"۔ [۱]

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے عدالت کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

ھی ملکۃ فی النفس تصدر عنہا	"عدالت" ایک "ملکہ" کا نام ہے جس سے ایسے
الافعال التی یقام بھا نظام المدینۃ	اعمال و افعال صادر ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعہ
والحی بسہولۃ [۲]	ملکی اور قومی انتظام بآسانی قیام پذیر ہوتے ہیں"۔

شاہ صاحب عدالت ایک ایسے "ملکہ" کو کہتے ہیں کہ اس کے حاصل ہونے کے بعد فکری و عملی دونوں قوتیں ٹھیک ٹھیک استعمال ہونے لگتی ہیں اور حقوق و فرائض کی ادائیگی میں سہولت ہوتی ہے۔

یعنی قومی زندگی کی جب ایسی تنظیم ہو کہ ہر شے اپنے محل اور اپنی حدود کے اندر ہو اور ہر شخص اپنا حق پائے اور بغیر کسی کمی کے دوسرے کا حق ادا کرے تو وہ عادل قوم کہی جائے گی۔

قومی اور جماعتی عدل میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ہر فرد عدل کے قائم کرنے میں اپنی ڈیوٹی پوری کرے اور عدل کو بروئے کار لانے کے لئے جن جن اعمال و افعال کی ضرورت ہے ہر فرد اپنی طاقت بھر انھیں انجام دے۔

یورپ کے چند ماہرین اخلاق کے اقوال عدالت کے بارے میں یہ ہیں۔

آر۔ اے۔ پی۔ روجرس کہتے ہیں

"چار فضائل اصلیہ حکمت۔ شجاعت۔ اعتدال اور عدالت میں عدالت سب سے بلند پایہ ہے یہ تمام فضائل کا اتمام اور سرتاج ہے کیوں کہ اگر یہ نہ ہو تو باقی اپنی غایت کو کھو بیٹھیں"۔ [۳]

افلاطون نے عدالت کی یہ تعریف کی ہے۔

---

[۱] احیاء العلوم جلد ۳ ص ۴۲ از اخلاق و فلسفۂ اخلاق ص ۵۰۲ [۲] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۹۸ [۳] تاریخ اخلاق ص ۳۳

"ہر شخص اپنا کام کرے اور دوسرے کے کام میں دخل نہ دے"

عدالت کا اصلی جوہر روحانی و داخلی ہے[1]

ظاہر ہے کہ یہ صورت اسی وقت ممکن ہے جب کہ معاشرہ کی اعلی پیمانہ پر تنظیم ہو۔

پروفیسر جان ڈیوی اور پروفیسر جمیس ایچ ٹفٹس کہتے ہیں عدالت کے تین معنی ہیں

(۱) عدالت کا لفظ جب بہت ہی وسیع معنی میں استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد صداقت شعاری۔ درست کرداری اور راست بازی ہوتی ہے اس مفہوم کے لحاظ سے عدالت اخلاق کا ماحصل ہے یہ نیکی کی ایک قسم نہیں ہے بلکہ عین نیکی ہے عادلانہ فعل ہی واجب العمل فعل ہے۔

(۲) یہی شے انصاف پسندی، دادگری، ناطرفداری اور دیانت داری کی شکل اختیار کر لیتی ہے

(۳) عدالت کے سب سے محدود معنی وہ ہیں جن کی رو سے عدالت اور قانون کے ذریعے حقوق کی حمایت ہوتی ہے۔

ارسطو کے زمانہ سے (اور اس کے تتبع میں) آخر الذکر عدالت کی دو قسمیں کی جاتی ہیں

(۱) توزیعی۔ یہ ہر ایک کو بقدر استحقاق عزت و دولت وغیرہ دیتی ہے۔ (۲) اصلاحی۔ یہ مکافات اور تلافی کے ذریعہ حدود قانون سے تجاوز کرنے والوں کے مقابلہ میں قانون کی حمایت کرتی ہے اور اس طرح قانون کی عظمت کو برقرار رکھتی ہے[2]

ان تفصیلات کے پیش نظر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عدالت اور عدل کے مفہوم کی وسعت اور گہرائی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ قومی اور جماعتی زندگی کی روح رواں یہی خصلت ہے دنیا کی جو قوم جس قدر اس خصلت کو اپنائے گی اسی لحاظ سے وہ دوسروں کے مقابلے میں "اصلح" قرار دی جائے گی۔

انسانی فطرت سے معاشرہ کے ارتقاء اور اخلاقیت و مادیت دونوں کی ضرورت پر استشہاد

غور سے دیکھا جائے تو انسان اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے کسی ایک حالت یا ایک درجہ پر قناعت نہیں کر سکتا بلکہ اس کے سامنے ترقی کی غیر محدود شاہراہیں ہونا ضروری ہیں۔ اور یہ شاہراہیں

---

[1] تاریخ اخلاق ص۲۳۳ [2] اخلاقیات حصہ دوم باب ۱۹ ص۴۳۲

اخلاقیت اور مادیت دونوں گوشوں میں ہونی چاہئیں ورنہ وہ اپنی "تشنگی" بجھانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

اس کی صراحت جس طرح دنیا کے حالات، کا جائزہ لینے سے ہوتی ہے کہ مادی عروج کے کمال پر پہنچ جانے کے باوجود سسکتی ہوئی انسانیت اور بلکتی ہوئی روحانیت کی تسکین کے لئے کوئی سامان نہیں ہے۔ سہ

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

اسی طرح اس نظریہ سے بھی ہوتی ہے جو انسان کے بارے میں قرآن حکیم نے پیش کیا ہے انسان قرآن حکیم کی نظر میں کسی حیوان کی ترقی یافتہ شکل نہیں ہے بلکہ وہ ایک مستقل مخلوق ہے جہاں حیوانیت کا درجہ ختم ہو کر مافوق حیوانیت کا درجہ شروع ہوتا ہے۔

ایسے ہی وہ "جواہر" جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرنے والے ہیں اور اس کے اندر خلافت اور نیابت کی شان پیدا کرنے والے ہیں وہ نہ تو کسی مخلوق کے عطا کردہ ہیں اور نہ ہی کسی تدریج ترقی کا نتیجہ ہیں جیسا کہ ڈارون وغیرہ کا خیال ہے بلکہ وہ دراصل صفات الٰہی کا "پرتو" اور "خلقت بدی" کا نتیجہ ہیں۔

اسی بنا پر قرآن حکیم نے ایک موقع پر "جوہر انسانیت" کو خدائی روح پھونک دینے سے تعبیر کیا ہے اور بے شمار جگہ تسخیر کائنات کی طرف توجہ دلا کر معاشرہ کے ارتقاء کی راہیں کھولی ہیں۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۳۲/۹ — پھر اللہ نے انسان کو درست کیا اور اس میں اپنی روح سے (کچھ) پھونک دیا اور تمہارے لئے کان آنکھ اور دل بنایا۔

اس جوہر کے بعد ہی انسان تمام تر شرافت و فضیلت کا مستحق ٹھہرا ہے اور بے شمار تنظیمی و تخلیقی

صلاحیتوں کا مالک ہوا ہے

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۱۵/۷۸	پھر جب میں انسان کو درست کردوں اور اس میں اپنی روح سے (کچھ) پھونک دوں تو تم (فرشتے) اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑو۔

جس کے بنانے میں خداوند تعالیٰ کا (اس کے حال اور شان کے مطابق) دست مبارک مصروف عمل ہوا ہو ظاہر ہے کہ اس کی وسعتوں اور بلندیوں کا کیا مقام ہوگا اور کس قدر صلاحیتیں اس کے اندر ودیعت کی گئی ہوں گی۔

ایک موقع پر اس امتیازی شان کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ۴۵/۷۶	(اے ابلیس) جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اس کو سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روکا ہے

اس سلسلہ کی ایک حدیث نقل کرتا ہوں جس کے مفہوم پر غور فرمائیے۔

عن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لما خلق اللہ آدم وذریتہ قالت الملائکۃ یارب خلقتھم یاکلون ویشربون وینکحون ویرکبون فاجعل لھم الدنیا ولنا الآخرۃ قال اللہ لا اجعل من خلقتہ بیدی ونفخت فیہ من روحی کمن قلت لہ کن فکان (شعب الایمان مشکوٰۃ)	حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ جب اللہ نے آدمؑ اور ان کی ذریت کو پیدا کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار آپ نے ان لوگوں کو ایسا بنایا کہ وہ کھاتے پیتے ہیں نکاح کرتے ہیں (دنیوی اوصاف سے متصف ہیں) اس لئے آپ دنیا کو ان کے حصہ میں کردیجئے اور آخرت کو ہمارے حصہ میں کردیجئے حق تعالیٰ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور جس میں اپنی روح سے (کچھ) پھونکا اس مخلوق کو میں ان کے برابر نہ کردوں گا

جن کو میں نے لفظ "کن" سے پیدا کیا ہے

ظاہر ہے کہ ایسی مخلوق کے بارے میں یہ سوچنا بھی گناہ ہے کہ وہ کسی ایک حالت یا درجہ پر قناعت کر کے معاشرہ کے ارتقار کی نئی راہیں نہ ڈھونڈے گی۔

دراصل نیابتِ الٰہی کا تصور ہی زندگی کے لئے ایک ایسا نصب العین بہم پہنچاتا ہے کہ انسان کو پرواز کرنے کے لئے اس سے بلند تر کوئی نصب العین نہیں ہو سکتا ہے نہ اخلاقی دنیا میں اور نہ مادی دنیا میں۔

بھلا ایسی صورت میں کون باور کرے گا کہ مادیت یا اخلاقیت کے بغیر کوئی قوم حقیقی و دائمی زندگی حاصل کر سکتی ہے یہ تو اسی حالت میں ممکن ہے جب کہ ایک طرف اخلاق کی اعلیٰ پیمانہ پر تنظیم ہو اور دوسری طرف مادیات کا ارتقار ہوتا رہے اور پھر یہ دونوں مل کر معاشرہ کے ارتقار کا موجب بنیں۔

(باقی آئندہ)

العلم والعلماء

یہ جلیل القدر امام حدیث علامہ ابن عبد البر کی شہرۂ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے، مترجم کتاب مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی اس دور کے بے مثال ادیب اور مترجم سمجھے جاتے ہیں، موصوف نے یہ ترجمہ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا جو اب ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے علم اور فضیلتِ علم کے بیان، اہلِ علم کی عظمت اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی، اس متبرک کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے، ایک زبردست محدث کی کتاب اور ملیح آبادی صاحب کا ترجمہ موعظتوں اور نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک دفعہ ضرور پڑھئے۔ صفحات ۳۰۰، بڑی تقطیع قیمت چار روپے آٹھ آنے مجلد پانچ روپے آٹھ آنے۔

تاریخی حقائق

از

(جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی دار العلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر)

حسن اتفاق سے آج تاریخ ملت جلد ششم سامنے آگئی، پلٹ کر دیکھا تو اپنے وہ نشانات نظر آئے جو میں نے آج سے کئی سال پہلے پڑھتے وقت لگائے تھے، جی میں آیا یہ محنت کیوں ضائع جائے ان کے موثر واقعات ناظرین کی خدمت میں پیش کر دئے جائیں، ممکن ہے کسی کو فائدہ پہنچ جائے، اپنے انھی خیالات کے پیش نظر یہ چند واقعات حاضر خدمت ہیں۔

دعا فرمائی جائے "تاریخی حقائق" کا جو سلسلہ کئی سال سے چل رہا ہے، وہ کتابی شکل میں مرتب ہو کر اہل علم اور ارباب فضل و کمال کی خدمت میں پیش ہو سکے۔ گو ان حقائق کی علمی ترتیب کوئی آسان کام نہیں۔ (ظفیر صدیقی)

خلیفہ متوکل المتوفی ۲۴۷ھ اپنی سیرت میں بڑا ممتاز گذرا ہے، گو شیعوں نے اس کو بری طرح بدنام کرنے کی سعی کی ہے، مورخین کا بیان ہے:

"متوکل کو رعایا کا بڑا خیال تھا اور ان کے ساتھ منصفانہ سلوک کرتا تھا، وہ کہا کرتا تھا اگلے خلفاء رعایا پر اس لئے سختی کیا کرتے تھے کہ وہ اس سختی کے خوف سے ان کے مطیع رہیں اور میں نرمی کرتا ہوں، تاکہ وہ مجھ سے محبت کریں، مرے پاس آئیں اور مری اطاعت کریں[1]"

آج سے سیکڑوں برس پہلے کے حکمراں کا یہ سلوک تھا، اپنی رعایا کے ساتھ، جس کے متعلق کہا جا سکتا جمہوری دور نہیں تھا، مگر غور کیجئے یہ پریم و محبت، یہ اخلاق اور حسن سلوک اب روئے زمین پر باقی ہے؟ اب تو صرف زبانی لمبے دعوے کے سوا عمل کہیں نظر ہی نہیں آتا، مسعودی

---

[1] تاریخ ملت جلد ۶ ص ۲۹۵ بحوالہ تاریخ خطیب ص ۱۶۶ ج ۷

جیسے مورخ کا بیان ہے۔

"متوکل کا زمانہ اپنی بھلائیوں، خوبیوں، سرسبزی و شادابی، فارغ البالی اور رفاہیت، عیش و عشرت کے لحاظ سے عہد سردار تھا، سارے خواص و عوام خوش و خرم تھے"[1]

متوکل کے عدل و انصاف کے متعلق مسعودی لکھتا ہے۔

"عدل و انصاف کے لحاظ سے بھی متوکل کا زمانہ ممتاز شمار کیا جاتا تھا"[2]

آہ اب تو یہ خوبیاں ہمارے زمانہ میں عنقا ہیں، نہ رعایا خوش و خرم ہے، اور نہ کوئی غریب، حد یہ ہے کہ ہمارے اور دوسرے اکثر ملک کی زیادہ آبادی مشقت اور فاقہ کی زندگی گذارتی ہے، عدل و انصاف کس کو کہتے ہیں، آج کوئی جانتا بھی نہیں، حکمراں طبقہ صرف اپنے بیانوں میں عدل و انصاف کا نمائشی طور پر نام لے لیتے ہیں، ورنہ عمل سے کوئی تعلق نہیں، انصاف ہمارے ملک میں بکتا ہے، الا ماشاء اللہ۔

متوکل نے اپنے دورِ حکومت میں رشوت ستانی کی بھی اصلاح کی اور کامیاب رہا! اس سلسلہ میں بھی مورخ کا بیان ہے۔

"متوکل کے اولین عہد میں رشوت کا بازار گرم تھا، مگر متوکل نے بڑے بڑے عہدہ داروں کو سخت سزائیں دیں، اور گراں قدر جرمانے کئے، جس سے رشوت ستانی کا دروازہ بند ہو گیا"[3]

ہمارے ملک میں رشوت ستانی کے بند کرنے کے لئے جتنی بھی کوششیں ہوتی ہیں، کوئی بھی کامیاب نہیں ہوتی۔ بلکہ نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے، رات دن کھلم کھلا رشوت ستانی کا بازار گرم ہے، حکومت کے جس محکمہ میں چلے جائیے بغیر رشوت کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا، حد ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں رشوت بند کرنے کا اختیار ہے غالباً وہ خود بھی پاک نہیں، اور اسی کا نتیجہ ہے رشوت کا بازار سرد نہیں پڑتا۔

---

[1] تاریخ ملت جلد ۶ ص ۳۱ بحوالہ تاریخ خطیب ج ۷ ص ۱۶۶ [2] تاریخ ملت ج ۶ ص ۳۰ [3] ایضاً ج ۶ ص ۳۱

اس حسنِ انتظام اور عدل و انصاف کا نتیجہ یہ تھا کہ عہد متوکل میں ہر طرح کی برکت ہوئی، متوکل نے اپنے ہاتھ سے داد و دہش میں کروڑہا روپیہ خرچ کیا، مگر با ایں ہمہ جب دنیا سے رخصت ہوا، تو خزانہ میں بقول مسعودی چالیس لاکھ دینار اور ستر لاکھ درہم چھوڑ گیا۔

متوکل نے احیاء سنت اور اشاعتِ حدیث کے علاوہ ترجمہ و تصنیف پر بھی توجہ دی، "بیت الحکمت" کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا اور اس کا افسر حنین بن اسحاق کو بنایا، اور اس کے تحت مترجمین کی ایک جماعت تھی، اس میں مورخین نے لکھا ہے

"متوکل نے حنین کی بے انتہا قدردانی کی، ایوانات شاہی میں سے تین محل اس کی رہائش کے لئے خالی کردیئے اور ان کو ہر قسم کے آرائشی سامان سے سجا کر شاہی کتب خانہ بھی وہیں رکھوا دیا پندرہ ہزار ماہوار تنخواہ مقرر تھی"[1]

علم و علماء کی یہ قدردانی اب کہاں رہی، اب تو چار سو بیس قسم کے لوگ ہوتے ہیں، حکومت انکی کی قدردانی کرتی ہے، بڑی ناشکری ہوگی اگر اس موقع سے نظام حیدر آباد کی یاد نہ دلائی جائے جنہوں نے پچھلے دنوں علم اور اہل علم دونوں کی خوب عزت اور قدردانی کی، اور علوم فنون پر لاکھوں روپے خرچ کئے،

منتصر المتوفی ۲۴۸ھ بڑا بامروت، عفیف، اور خلیق بادشاہ گذرا ہے اس کے متعلق علامہ سیوطی کا بیان ہے

"منتصر نے رعیت میں عدل و انصاف پھیلایا، اور لوگ باوجود اس کی ہیبت کے اس کی طرف مائل ہوگئے، کیونکہ وہ سخی اور حلیم الطبع تھا"

اب عدل و انصاف تو نہیں، ہاں ظلم و جور ضرور پھیلاتے ہیں، مورخ ہمارے اس دور کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو وہ انصاف کا باب قائم کرے گا، اور پوری کد و کاوش کے بعد لکھے گا افسوس عدل و انصاف کا کوئی سبق آموز واقعہ نہیں مل سکا۔

---

[1] تاریخ ملت جلد ششم ص۱۴۱

لکھا ہے منتصر نے ایک دفعہ اپنے باپ کے خزانہ سے کچھ فرش نکلوائے، ان میں سے ایک فرش کے وسط میں ایک دائرہ بنا ہوا تھا جس میں ایک سوار کی تصویر تھی اور فرش کے کنارے کچھ لکھا ہوا تھا، ایک فارسی خواں کو بلوا کر پڑھوایا تو معلوم ہوا کہ لکھا ہے میں "شیرویہ بن کسریٰ بن ہرمز ہوں میں نے اپنے باپ کو قتل کیا لیکن مجھے چھ ماہ سے زیادہ سلطنت کرنا نصیب نہ ہوا" منتصر یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا، اس نے بھی اپنے باپ کو قتل کرایا تھا مگر حال یہ تھا۔

"اس واقعہ کا غم بہت تھا، شب و روز باپ کے لئے رویا کرتا تھا، اس غم میں چھ ماہ میں گھل گھل کر سوکھ گیا۔"[۱]

اپنے گناہ پر اس طرح کا پچھتاوا اب کہاں ہوتا، اب تو اپنے گناہ کو چھپانے کے لئے سیکڑوں الزام تراشے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے ہندوستان کی ریاست کے ایک نائب وزیر اعظم کو اس کے سابق وزیر اعظم ہی نے فرش سے عرش پر پہنچایا، مگر آج یہ عبرت انگیز واقعہ دنیا کے سامنے ہے کہ اسی بد اندیش نے اپنے سابق وزیر اعظم کو جیل میں بند کر ڈالا ہے اور الٹے ان ہی پر الزام ڈالتا ہے، اور اسے اب تک اپنے اس گناہ کا احساس نہیں ہے۔

خلیفہ مہتدی المتوفی ۲۵۶ھ متقی، دین دار اور امانت دار تھا، اپنی خصوصیات میں امتیاز کا مالک گذرا ہے، اس کا یہ واقعہ پڑھنے کے لائق ہے۔

ہاشم بن قاسم کہتے ہیں کہ رمضان میں شام کے وقت مہتدی کے پاس میں بیٹھا تھا جب میں چلنے لگا، تو مہتدی کہنے لگا، ہاشم بیٹھ جاؤ، میں بیٹھ گیا، پھر ہم نے افطار کیا اور نماز پڑھی مہتدی نے کھانا مانگا، تو ایک بید کی ڈلیا میں کھانا آیا، اس میں پتلی پتلی روٹیاں تھیں اور ایک برتن میں تھوڑا سا نمک، دوسرے میں سرکہ اور تیسرے میں زیتون کا تیل تھا، مجھ سے بھی کھانے کو کہا میں نے کھانا شروع کیا، اور دل میں سوچا کھانا اور بھی آتا ہوگا، مہتدی نے مری طرف دیکھ کر پوچھا کیا تمہارا روزہ نہ تھا، میں نے کہا تھا، پھر پوچھا، کیا کل روزہ نہ رکھوگے؟ میں نے عرض کیا رکھوں گا، اور عرض

[۱] تاریخ ملت، ج ۴۹/۴۷

کیا امیرالمومنین! یہ تو ماہ رمضان ہے خلیفہ بولا پھر تو اچھی طرح سے کھاؤ، اور امید یہ نہ رکھو کہ اور کھانا آئے گا، کیوں کہ اس کے سوا اور مرے لئے کھانا نہیں ہے، یہ سن کر مجھے سخت تعجب ہوا، اور میں نے تعجب سے پوچھا کہ امیرالمومنین یہ کیا معاملہ ہے، خدا نے آپ کو تمام نعمتیں عطا کی ہوئی ہیں، مہتدی نے کہا بات یہ ہے کہ بنو امیہ میں عمر وبن عبدالعزیزؒ شخص پیدا ہوا اور بنی ہاشم میں نہ ہوا۔"

یہ جذبہ نیک اب ڈھونڈے کہاں ملتا ہے، اسلاف کرام کی یہ ساری خوبیاں ہمارے لئے ایک افسانہ بن کر رہ گئی ہیں، امیرالمومنین اور اتنی سادہ غذا، اللہ تعالیٰ کی دین ہے، اب تو آدمی جہاں امیر یا وزیر بنا، سمجھنے لگا، ہم چنیں دیگرے نیست، اور قوم کا روپیہ بے دریغ اپنی عافیت میں پھونک ڈالتا ہے، کبر و نخوت سے اس کی گردن تن جاتی ہے، اور نام و نمود میں ہزاروں روپے پانی کی طرح بہا ڈالتا ہے۔

یہ تو اس کی رہائش تھی، اب اندازہ لگایئے اپنی قوم اور رعایا کے حق میں کیسا تھا مورخین اس کے عدل وانصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مہتدی کی سیرت میں سب سے نمایاں اس کا عدل وانصاف اور امر و نواہی کا قیام ہے، اس نے عدل کے لئے ایک خاص عمارت قبتہ المظالم کے نام سے بنوائی، جہاں روزانہ بیٹھ کر عوام و خواص کی دادرسی کیا کرتا۔"[1]

آہ اب تو ہر چیز ممکن ہے مل جائے، مگر بڑوں کے یہاں جس چیز کا سب سے زیادہ قحط ہے وہ عدل وانصاف ہے، ہمارے اس دور میں دنیا سے انصاف کا نام حرف غلط کی طرح مٹا چلا جارہا ہے اور کسی کو احساس تک نہیں، جس کو بڑا منصف جانتے ہوں ان کے سامنے کسی امیر غریب کا مقدمہ لے جایئے، آپ دیکھیں گے کہ امیر وزیر اور لیڈر کے مقابلہ میں غریب، مزدور اور رعایا کو انصاف نہ مل سکے گا، مہتدی کی سیرت میں یہ واقعہ ملتا ہے۔

"ایک دفعہ کسی شخص نے اس کے لڑکے پر دعویٰ کیا، مہتدی نے شاہزادہ کو طلب کیا اور مدعی کے

---

[1] تاریخ ملت ج ۴ ص ۹۶

پہلو میں کھڑا کر کے دعوے کی سماعت کی، شہزادے نے اقرار کر لیا، مہتدی نے اسی وقت مدعی کا حق دلوا دیا۔[1]

دل پر ہاتھ رکھ کر کہا جائے اب اس طرح کا انصاف ہو سکے گا، کوئی وزیر ایسا کرنے کو تیار ہے؟

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں   محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

لکھا ہے کہ مہتدی نے دورِ عباسیہ کے سارے لوازماتِ عشرت کو فنا کے گھاٹ اتار دیا حد یہ ہے کہ باپ دادا سے دستر خوان کا خرچ جو دس ہزار یومیہ تھا اسے سو درہم کر دیا اور ہمارے اس دور کا حال یہ ہے کہ جو باپ دادا سے سو روپے ماہانہ خرچ کرتا چلا آرہا تھا وزیر بننے کے بعد ہزاروں روپے روزانہ اپنی ذات پر خرچ کرنے سے کبھی نہیں گھبراتا، رعایا کو کہتا ہے کہ تم تیس ایکڑ سے زیادہ زمین نہ رکھو، مگر خود دو چار ہزار ماہانہ حکومت کے خزانہ سے وصول کرتا ہے، اسی ہندوستان میں جس کو دس گز سے زیادہ رہنے کا مکان نہ تھا، وہ صرف اپنے کتوں پر سات سات سو روپے ماہانہ خرچ کرتا ہے

معتمد کے دور کے ایک عالم ابو بکر احمد بن عمر خصاف المتوفی ۲۶۱ھ کی خودداری کا حال سننے کے لائق ہے، اپنے وقت کے جید عالم، کتنی کتابوں کے مصنف مگر با ایں ہمہ

"نعلین و موزہ دوزی کی کمائی سے زندگی بسر کرتے تھے، حکومت کے دست نگر نہ تھے"[2]

اللہ اللہ یہ تھا اپنے علم کا پاس، اور اپنے علم کی قدر و منزلت دوسروں کے آگے اسے رسوا نہ کیا، سوچئے کیسا حلال ذریعہ معاش پسند کیا، اور اپنے آپ کو غلامی کی ذلت سے بچا لیا، آج کوئی اہل علم ایسا شاید تصور بھی نہ کر سکے گا،

اسی سلسلہ میں معتضد کے دور کے ایک عالم کی کہانی سن لیجئے، لکھا ہے

"ابو الحسن نوری دربار کی طرف سے گذرے، خدام کشتی میں نبیذ کے مٹکے لے جا رہے تھے دریافت کیا یہ کس کے ہیں، معلوم ہوا معتضد نے منگوائے ہیں، آپ نے تمام مٹکے توڑ دیئے، جب معتضد نے مسکرا کر پوچھا کہ تم کو محتسب کس نے بنایا ہے، تو فوراً جواب دیا کہ جس نے تجھے خلیفہ مقرر کیا، معتضد نے سنا اور سر جھکا لیا۔"[3]

---

[1] تاریخ ملت ج۲ص۹۳ [2] تاریخ ملت ج۲ص۹۵

یہ تھے علمائے حق کی جماعت کے ایک فرد، حق بات کہنے میں ذرا لگی باک نہیں کرتے تھے، خلیفہ وقت کو برجستہ جواب دیا جارہا ہے، اور اسی کے مٹکے توڑے جارہے ہیں، حالانکہ نبیذ ان چیزوں میں ہے جس کی حرمت مختلف فیہ ہے، علمائے عراق اس کی حرمت کے نہیں بلکہ جواز کے قائل ہیں ــــــــ مگر باایں ہمہ نہ خوف اور نہ مروت۔ سچ کہا اقبال مرحوم نے

آئین جوانمرداں حق گوئی و بیباکی   اللہ کے شیروں کو، آتی نہیں روباہی

مکتفی المتوفی ۲۹۵ھ بڑی خوبیوں کا مالک تھا، لکھا ہے

"مکتفی کی خوش خلقی مشہور تھی، عدل وانصاف میں کسی خلیفہ سے پیچھے نہ تھا"

مورخین نے اس کے عدل وانصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

"اس (مکتفی) کے والد نے دوسروں کے مکانات بحق حکومت ضبط کر کے نعمت خانے بنوائے تھے، ان کو گروا دیا اور ورثاء کو رقمیں دیں، اور مساجد بنوا دیں، اور قصر میں جو مکانات آئے تھے ان کے مالکوں کو وہ مکانات دے دیئے"[1]

فرمایا جائے اب اس طرح کا عدل وانصاف روئے زمین پر باقی رہا، اب تو ایک کے بعد جو دوسرا آتا ہے وہ اور ظالم اور لوٹ کھسوٹ کرنے والا ہوتا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہے اور رعایا میں الحفیظ والاماں کا کہرام مچا ہوا ہے،

مکتفی کا جب آخری وقت آیا، اور بیمار پڑا، تو خشیت الٰہی کا سبق آموز اثر دیکھنے والوں نے دیکھا، مورخین نے لکھا ہے

"مکتفی نے اپنی بیماری میں کہا کہ مجھے ان سات سو دیناروں کا بڑا خطرہ لگا ہوا ہے، جو اپنے خرچ میں لے آیا ہوں، حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ مسلمانوں کا مال ہے اور مجھے اس کی چنداں احتیاج بھی نہ تھی، اگر فردائے قیامت میں مجھ سے اس کی پرسش ہوئی، تو میرے ساتھ بری گذرے گی، میں اپنی غلطی پر خدا سے مغفرت مانگتا ہوں"[2]

---

[1] تاریخ ملت ج ۲ ص ۱۳۱

اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائیں، فرماں روائی کا حق ادا کر گئے، پوری زندگی میں بحیثیت خلیفہ سات سو خرچ کیا، تو اس پر کانپ رہے ہیں، کہ رب العزت کے یہاں کیا پیش آئے، قوم کی امانت تھی، کوئی معمولی چیز نہ تھی، مگر آہ آج قوم کے روپے جس بے دردی سے ارباب حکومت اڑاتے ہیں وہ جاننے والوں سے پوچھئے تفصیل سننے کے بعد کتنے کو یقین نہ آئے گا اب ارباب حکومت خادم نہیں ڈاکو ہوتے ہیں اب قوم کے ساتھ صرف زبانی ہمدردی باقی رہ گئی ہے۔

مقتدر ایک خلیفہ گذرا ہے، جو اپنے طمطراق کے اعتبار سے بڑا نامی گرامی تھا، لیکن رات بھر عورتوں کی صحبت میں رہتا تھا اور عیش پرستی نے اس کو نکما بنا دیا تھا، لونڈیوں اور محلات شاہی پر لاکھوں روپے خرچ کرتا، قیمتی جواہرات ان پر نثار کرتا رہتا، ایک دفعہ ایک رومی سفیر آیا تو اس موقع سے لاکھوں روپے اس کے خیر مقدم میں خرچ کر ڈالا، دار الشجرہ نامی محل کے متعلق لکھا ہے۔

"محل دار الشجرہ میں سونے چاندی کا ایک درخت بنایا گیا تھا اس کا تنہ اور شاخیں سونے، چاندی کی تھیں پتیاں اور پھول پھل جواہرات کے، شاخوں کی بناوٹ اس طرح کی تھی کہ وہ ہوا سے اصلی شاخوں کی طرح جھومتی تھیں، ان پر سونے اور چاندی کے طیور بٹھائے گئے، ان میں یہ صفت رکھی گئی تھی کہ جب ان کے جوف میں ہوا بھرتی تھی تو ان سے چہچہانے کی سی آواز نکلتی تھی، اور سب کی بولیاں ایک دوسرے سے جدا تھیں[۱]"

اندازہ لگایا جائے، قوم و ملک کا کتنا روپیہ اس بے کار چیز میں خرچ کیا گیا ہوگا مگر جانتے ہیں اس کا انجام کیا ہوا، اور کیسا بدلہ ملا۔ اس کی موت کا واقعہ لکھتے ہوئے لکھا ہے

"نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۲۰ھ میں بری طرح قتل ہوا، سر جدا کر کے لکڑی پر آویزاں کیا گیا، بدن پر سے کپڑے اتار کر لاش عریاں چھوڑ دی گئی، ایک راہ گیر نے گڑھا کھود کر مقتدر کی لاش کو زمین میں دفن کر دیا[۲]"

قدرت کا انتقام بڑا زبردست ہوتا ہے، حکمراں طبقہ میں جو لوگ قوم و ملک کو فائدہ پہنچانے کی جگہ خود فائدہ اٹھاتے ہیں ان کو آنکھیں کھول کر اس واقعہ کو پڑھنا چاہیئے اور عبرت حاصل کرنا چاہیئے، خدا کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔

متقی المتوفی ۳۵۷ھ میں دینی اور اخلاقی خوبیاں بہت تھیں خطیب کا بیان ہے

"وہ اپنے پیشرو خلفاء کے بہت سے اعمال و افعال سے محترز رہا، نبیذ کبھی نہیں پی، ہر وقت قرآن شریف تلاوت کرتا رہتا، اور کہا کرتا تھا کہ اس سے بڑھ کر کوئی رفیق و ندیم نہیں، اپنی کنیزوں کو منہ نہیں لگایا[۳]"

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، صاحب حکومت ہونے کے باوجود ان خوبیوں کا مالک ہونا کوئی آسان بات نہیں اب تو ہمارے زمانہ میں ارباب حکومت مذہبی اعمال و اخلاق سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ جائز کنیزوں کی بات تو الگ رہی۔ ناجائز دوشیزاؤں سے بھی منہ کالا کرنے میں نہیں شرماتے ہیں

ادبیات

غزل

از

(جناب الم مظفر نگری)

تائیدِ وفا ہیں کرم عام ہمارے
سب عشق کے پیغام ہیں پیغام ہمارے

ہم مستحقِ بادۂ گل رنگ کبھی تھے
حصے میں ہے اب دُردِ تہِ جام ہمارے

جب چاہے تو تقدیرِ زمانہ کو بدل دے
یہ کام ہے تیرا دلِ ناکام ہمارے

اس وادیٔ تکلیف میں ہم گرمِ سفر ہیں
ہے ساتھ جہاں منزلِ آرام ہمارے

وہ بھی نہ شرف یابِ توجہ ہوئے آخر
جو نالے گئے تا لبِ بام ہمارے

کیا اب کے بھی نکلیں گے نہ اے فصلِ بہاری
پر ٹوٹ گئے تھے جو تہِ دام ہمارے

کہتے ہیں اس آواز میں اک سوز نیا ہے
سنتے ہیں وہ نالے جو سرِ شام ہمارے

جتنے بھی تھے سب جاگ اُٹھے خفتہ ارادے
کام آ ہی گئی گردشِ ایام ہمارے

تنظیمِ جہاں ہوتی ہے ان سے سحر و شام
فطرت کے اشارات ہیں پیغام ہمارے

ثابت ہوئے پاکیزگیٔ عشق کے ضامن
جو کام تھے آلودۂ الزام ہمارے

جنت میں بھی ہیں شغلِ مے و جام کے چرچے
ہے ساتھ یہاں بھی طمعِ خام ہمارے

کیا فائدہ پہنچے گا بھلا طوفِ حرم سے
دل جب کہ ہیں گرویدۂ اصنام ہمارے

یاد اس کی پھر اک تازہ الم بن کے رہے گی
دل سے جو مٹا بھی غمِ ایام ہمارے

اپنی ہے الم مے کدۂ عشق کی ہر چیز
شیشے بھی ہمارے ہیں یہاں جام ہمارے

غزل

از

(جناب شارقؔ ایم۔ اے)

کوئی کیا جانے اُس کے حُسن کی دنیا کہاں تک ہے
وہیں تک دیکھ سکتا ہے نظر جس کی جہاں تک ہے

تڑپتا ہوں کسی کی یاد میں اور یہ سمجھتا ہوں
یہ بے چینی محبت کی فقط عمرِ رواں تک ہے

خلش بڑھتی چلی جاتی ہے ہر لحظہ نگاہوں کی
خدا جانے ہمارے شوق کا عالم کہاں تک ہے

کسی کا تجربہ کچھ ہو مگر میں اتنا کہتا ہوں
بھرم اہل محبت کا فقط ضبطِ فغاں تک ہے

بڑی مدت کے بعد اس کا یقیں آیا محبت کو
کہ اس کے رُخ کی تابانی مرے سوزِ نہاں تک ہے

گذر جا بے نیازانہ تماشا گاہ ہستی سے
کہ یہ اُلجھن طبیعت کی غمِ سود و زیاں تک ہے

نہ رہ جائے کہیں مٹ کر یہ بعدِ سجدہ اے شارقؔ
عجب اک کیف کا عالم جبیں سے آستاں تک ہے

غزل

از

(جناب قمرؔ مرادآبادی)

حُسنِ مہ و انجم بھی اپنی ہی جبیں پہلے
ہم سے ہی بکھیرے تھے انوارِ یقیں پہلے

اب لغزشِ پیہم پر ہنستا ہے زمانہ کیا
منزل کے تصور میں دوڑے تھے ہمیں پہلے

اِس ہوش کی دنیا سے بیگانہ گزر اے دل
دیوانوں کو ملتی ہے معراجِ یقیں پہلے

کچھ اُن کو جوانی کا احساس نہ تھا اوّل
کچھ میری نگاہیں بھی گستاخ نہ تھیں پہلے

نظروں سے ذرا آگے، کچھ دورِ تخیل سے
میں نے تمہیں دیکھا ہے اک بار کہیں پہلے

مجبور ہیں کچھ وہ بھی فطرت کے تقاضوں سے
جس بار اٹھیں نظریں مجھ پر ہی پڑیں پہلے

میخانۂ ہستی میں پیتا ہے وہی اوّل
جس کو تری رحمت کا آتا ہے یقیں پہلے

سجدے بھی قمرؔ اپنے اب ننگِ عبادت ہیں
مسجودِ ملائک تھے ہم خاک نشیں پہلے

تبصرے

مختصر تاریخ ہند | مترجمہ جناب محمد یوسف صاحب کوکن ایم ۔ اے تقطیع کلاں ضخامت ۲۶۰ صفحات ٹائپ جلی اور روشن قیمت مجلد ؏ روپیہ مطبوعہ مدراس یونیورسٹی۔

مسٹر ڈبلو۔ ایچ مورلینڈ نے ہندوستان کی ایک تاریخ لکھی تھی جو انگریزی داں طبقہ میں بہت مشہور اور مقبول ہوئی۔ بعد میں بنگال کے مشہور فاضل اے۔ سی۔ چٹرجی نے اس پر نظر ثانی کرکے اور اپنی طرف سے چند ابواب اور جدید معلومات کا اضافہ کرکے اس کو پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد سے اب تک اس کتاب کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں۔ جناب محمد یوسف صاحب جو جنوبی ہند میں عربی، فارسی اور اردو کے مشہور فاضل ہیں۔ انھوں نے مدراس یونیورسٹی کی فرمائش پر اسی کتاب کو اردو کا جامہ پہنایا ہے اس کتاب میں مسلمان بادشاہوں کی نسبت اگرچہ ان افسانوی داستانوں کے بیان کرنے سے یا ان کے کیرکٹر اور نظام حکمرانی کی نسبت ان آرار کے ظاہر کرنے سے گریز نہیں کیا گیا۔ جو عام طور پر انگریز سیاحوں اور مورخوں کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ تاہم اس حیثیت سے یہ کتاب قابل قدر ہے کہ اس میں تاریخی واقعات کے بجائے زیادہ تر باشندگان ہند کے ہر دور کے اہم سیاسی، تمدنی، تہذیبی اور معاشی پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس سے قطع نظر لائق مترجم کا کمال اپنی جگہ پر مستحق تحسین وستائش ہے کہ انھوں نے اس قدر ضخیم کتاب کا ترجمہ اس خوبی اور عمدگی کے ساتھ کیا ہے کہ ترجمہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ایک مستقل کتاب معلوم ہوتی ہے جو شستہ و رواں اور شگفتہ اردو میں لکھی گئی ہو اس کے علاوہ مدراس یونیورسٹی بھی اردو زبان کے قدر دانوں کی طرف سے بہت کچھ مبارک باد اور شکریہ کی مستحق ہے کہ اس دور میں بھی اُس نے اردو کو یہ اہمیت دے رکھی ہے کہ ایسی ایسی ضخیم کتابیں اُس میں ترجمہ کراتی ہے اور بصرفِ زرِ کثیر اُس کو شائع کرنے کا اہتمام کرتی ہے ارباب اردو کا فرض ہے کہ وہ

ان کتابوں کو خرید کر ادارہ اس یونیورسٹی کی حوصلہ افزائی کریں۔ تاکہ یہ سلسلہ وہ آئندہ بھی قائم رکھ سکے۔ ورنہ مدعی بھی اگر سست ہوا تو گواہ کب تک چست رہے گا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ تقطیع متوسط ضخامت ۳۰۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد پانچ روپے پتہ :۔ ادارۂ اسلامیات انارکلی نمبر ۱۹۰ لاہور۔ پاکستان۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ ہمارے ملک کے بڑے مشہور اور بلند پایہ فاضل اسلامیات اور محقق مصنف ہیں جو اب ٹرکی میں جا کر بس گئے ہیں۔ یہ کتاب موصوف کے ہی متعدد مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ سیاست اور اس سیاست کے عملی نتائج وبرکات کے مختلف پہلوؤں پر بڑے دل نشین انداز میں بحث کی گئی ہے اور اُس زمانہ میں مختلف ملکوں کے جو سیاسی حالات تھے ان کا ذکر کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنے پیغام کے ذریعہ ان میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور دنیا کو ایک ایسا منشور عطا فرمایا جو امن عامہ اور تکمیل انسانیت کی آخری دستاویز ہے۔ یہ کتاب اس لایق ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ علم سیاست کا ہر طالب علم اس کا بغور مطالعہ کرے۔

بھگوت گیتا منظوم موسومہ بہ نسیم عرفان از جناب منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی تقطیع خورد ضخامت ۲۶۰ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت مجلد ؎، پتہ :۔ آدرش کتاب گھر دہلی۔

جناب منور لکھنوی اردو کے مشہور شاعر شیوا بیان ہیں۔ نظم نگاری پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے موصوف نے عرصہ ہوا ہندو مذہب کی مشہور روحانی اور فلسفیانہ کتاب بھگوت گیتا کا اردو میں کامیاب منظوم ترجمہ کیا تھا جو اسی زمانہ میں اہل ذوق اور ارباب نظر کے حلقوں میں بڑا مقبول ہوا تھا۔ اب موصوف نے اسی کی نظر ثانی کے بعد بڑے اہتمام وانتظام سے دوبارہ شائع کیا ہے۔ کسی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا یوں بھی کار آسان نہیں ہے اور پھر ترجمہ بھی نظم میں اور وہ بھی بھگوت گیتا ایسی کتاب کا جو بہت دقیق روحانی فلسفہ کے اہم مباحث

پر مشتمل ہے۔ اس طرح وادیِ ہفت خواں کو کامیابی کے ساتھ طے کر لینا لائق مصنف کا ایک بڑا قابلِ قدر ادبی کارنامہ ہے جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں امید ہے کہ اربابِ ذوق اس کے مطالعہ سے مسرور و شادکام ہوں گے۔

ذکرِ حبیب | مرتبہ جناب خالد مینائی ایم۔ اے تقطیع خورد ضخامت ۲۷۱ صفحات طباعت و کتابت اعلیٰ قیمت مجلد ۱۲/عہ دو روپیہ بارہ آنے پتہ:۔ مکتبۃ الحبیب عالم گیر مارکیٹ لاہور۔

حضرت امیر مینائی کا نعتیہ کلام عام طور پر بہت مشہور و مقبول ہے۔ گھر گھر بڑے شوق و اشتیاق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اب لایق مرتب نے اس کلام کا انتخاب کر کے دیدہ زیب کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کیا ہے اور ساتھ ہی حضرت مرحوم کی نثر کا بھی نمونہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی مختصراً لکھے گئے ہیں۔ حضرت امیر مینائی بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ اونچے درجہ کے عالم اور متقی بھی تھے اس بنار پر روایات کے نقل کرنے میں انھوں نے وہ بے احتیاطی نہیں برتی جو عام طور پر اس قسم کے موقعوں میں برتی جاتی ہے۔ اس طرح یہ کتاب حضرت مرحوم کے نعتیہ کلام نظم و نثر کا ایک بہت خوشنما دیدہ زیب اور دل پسند مجموعہ بن گیا ہے۔ عورتیں اور مرد اس سے یکساں طور پر اپنی مجالس میلاد میں اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

جذباتِ درد | از جناب درد کاکوروی تقطیع متوسط ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ ۳۰/اے ذیل دار پارک اچھرہ لاہور۔

جناب درد نے حضرت محسن کاکوروی کے خاندان سے قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے شاعری کا ذوق موروثی طور پر پایا ہے۔ غزل اور نظم سبھی لکھتے ہیں زبان میں صفائی اور شستگی ہے اور انداز بیان۔ دورِ متوسط کے شعرائے لکھنؤ کا سا ہے۔ لیکن کلام میں پختگی اور استواری پائی جاتی ہے جس سے ان کی کہنہ مشقی کا پتہ چلتا ہے صحت زبان کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ شروع میں خود شاعر کے قلم سے ایک طویل دیباچہ ہے جس میں اپنے ذاتی اور خاندانی حالات کے علاوہ اپنی ادبی زندگی کی سرگذشت بیان کی ہے۔

مزاحیہ افسانے | از کرشن چندر تقطیع خورد ضخامت ۱۴۴ صفحات کتابت و طباعت ۷/ قیمت ہے، تین روپیہ پتہ :- آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی۔

جناب کرشن چندر اُردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ اور اگرچہ ترقی پسند ادیبوں کی بز سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں وہ بے اعتدالی اور بے راہ روی نہیں ہے جو اسی جماعت کے بعض دوسرے افراد کا خاصہ ہو گئی ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں میں رومانیت کے ساتھ زندگی کی واقعیت اور طنز کے ساتھ سنجیدگی بھی ہوتی ہے اس لئے ان کے افسانے پڑھ کر کچھ آنکھیں بھی کھلتی ہیں اور دماغ کو سرور بھی ملتا ہے۔ یہ کتاب موصوف کے بارہ مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں مصنف کی قلمی خصوصیات پوری طرح جلوہ گر ہیں۔

بین الاقوامی سوشلزم | از جناب ضیار الحسن فاروقی ایم۔ اے تقطیع خورد ضخامت ۳۹ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸/ مصنف سے مدینہ منزل بجنور (یوپی) کے پتہ سے ملے گی۔

یہ کتابچہ اگرچہ مختصر ہے لیکن بین الاقوامی سوشلزم سے متعلق ٹھوس معلومات کا حامل ہے۔ اس سوشلزم کا مقصد کیا ہے؟ کن حالات میں کن لوگوں نے اس کو قائم کیا ہے؟ اب تک اس میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں؟ ان سب سوالات کا جواب دیا گیا ہے اور مفید معلومات پیش کی گئی ہیں اس کے لائق مصنف خود اس تحریک کے محقق طالب علم رہے ہیں اور انھوں نے بڑی سنجیدگی اور غور سے اس کا مطالعہ کیا ہے اس بنا پر اس میں جو معلومات ہیں مستند اور ٹھوس ہیں۔ اردو داں حضرات اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

برہان

جلد ۳۵ شمارہ ۶

دسمبر ۱۹۵۵ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

مدھیا پردیش کے مشہور شہر ناگپور میں مسلمانوں کی ایک انجمن حامی اسلام کے نام سے عرصہ دراز سے قائم ہے۔ یہ انجمن دوسرے اسلامی کاموں کے علاوہ ایک ہائی سکول بھی چلا رہی ہے جو کم وبیش ساٹھ سال سے مسلمانوں کی تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے۔ چند سال سے انجمن ہائی سکول سال میں ایک مرتبہ سوشل گیدرنگ کا ہفتہ مناتا ہے جس میں مختلف شعبوں میں طلبار کے کام کی نمائش ہوتی ہے، کھیل ہوتے ہیں، ڈرامہ ہوتا ہے اور مشاعرہ وغیرہ ہوتا ہے اور اس طرح یہ ہفتہ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اس ہفتہ کا افتتاح عموماً صوبہ کا گورنر یا کوئی وزیر یا کوئی جج کرتا ہے۔ لیکن اس سال انجمن کی مجلس منتظمہ نے خاکسار راقم الحروف سے درخواست کی کہ میں افتتاح کروں اور اس تقریب سے ایک تقریر کروں۔ میں نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ ۲۵ر نومبر کی شام کو بمبئی میل سے روانہ ہو کر ۲۶ر کی شام کو ناگپور پہنچا۔ ۲۷ر کی صبح کو دس بجے اسکول کے وسیع وعریض ہال میں ہفتہ کا افتتاح کرتے ہوئے "آزاد ہند میں مسلمانوں کی تعلیم" کے موضوع پر ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی۔ جلسہ میں انجمن کے معزز عہدہ داروں، اسکول کے اساتذہ اور طلبار کے علاوہ شہر کے موقر مسلمان اور ہندو بھی بڑی تعداد میں شریک تھے، اسی دن شب میں بشیر سیٹھ صاحب نے مومن پورہ میں ایک پبلک جلسہ کا بھی انتظام کر رکھا تھا، چنانچہ شب کو نو بجے سیرت کے موضوع پر تقریر کی جو پونے دو گھنٹہ کے قریب ہوئی۔ دوسرے دن یعنی ۲۸ر کو دو بجے اسکول کے ہال میں اسکول کے اساتذہ کو خطاب کیا۔ ناگپور یونیورسٹی کی بزم ادب نے میری آمد کی اطلاع پاکر پہلے سے ہی ایک جلسہ کا اعلان کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس بزم کے زیر انتظام "موجودہ ترقی یافتہ زبانوں میں اردو کی حیثیت" کے عنوان پر یونیورسٹی کے عظیم الشان ہال میں ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی۔ اس جلسہ میں یونیورسٹی کے ہندو مسلم طلبار کے علاوہ جناب عبدالقادر صدیقی ڈپٹی منسٹر۔ محکمہ تعلیم کے افسران اعلیٰ۔ کالج کے پرنسپل اور معززین شہر شریک تھے اور اوپر گیلریوں میں خواتین تھیں۔

وقت کے وقت سائنس کالج کے طلبار نے اپنے یہاں اور صدر ناگپور کی مسلمان خواتین نے انجمن کے سکریٹری صاحب کی معرفت خاص خواتین کے ایک اجتماع میں تقریر کرنے کی درخواست کی۔ لیکن وقت کی تنگی کے باعث بالکل مجبوری تھی اس لئے معذرت کردی گئی۔

ڈھائی دن کے قیام ناگپور میں احباب اور بزرگوں نے جو قدر افزائی کی ہے اس کے لئے تہ دل سے شکرگذار ہوں۔ ۲۶ر اور ۲۷ر کی درمیانی شب میں انجمن کی طرف سے ایک ڈنر دیا گیا جس میں تیس چالیس انجمن کے عہدہ دار اور دوسرے مدعو حضرات تشریف فرما تھے۔ ۲۷ر کی شام کو جناب عباس علی صاحب کمال صدر انجمن نے اپنی عالی شان کوٹھی میں نہایت پُرتکلف عصرانہ دیا۔ اس میں بھی چالیس کے قریب افسرانِ حکومت اور معزز مسلمان شریک تھے۔ شب میں سیٹھ بشیر صاحب نے متعدد حضرات کے ساتھ کھانے پر مدعو کیا۔ ۲۸ر کو جناب محمد حنیف صاحب انڈر سکریٹری فینانس ڈپارٹمنٹ کے بنگلہ پر ڈنر تھا موصوف کے خسر جناب شمس الحسن واسطی میرے پرانے کرم فرما بزرگ ہیں وہ آج کل وہیں رہتے ہیں حنیف صاحب سے ملاقات انھیں کے توسط سے ہوئی ان حضرات کے علاوہ ناگپور کے مشہور رئیس حاجی عبدالغنی صاحب اور نواب غلام دستگیر خاں صاحب نے روزانہ صبح و شام تشریف لاکر اور اپنی موٹر کار آمد و رفت اور ناگپور کی مکمل سیر کے لئے عنایت فرما کر حسنِ تعلقِ خاطر کا ثبوت دیا ہے۔ یہ عاجز اس کے لئے سراپا سپاس ہے۔ اس ذیل میں عزیزی مولوی محمد تقی صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جو اکثر اوقات ساتھ ہی رہے اور بعض معمولی ضرورتوں کی فراہمی میں مدد دیتے رہے۔

۲۹ر کی صبح کو ناگپور سے روانہ ہوا تو ناگپور یونیورسٹی کی بزم ادب کے پُرجوش اور ہونہار سکریٹری مجاہد صاحب نے مقامی انگریزی روزنامہ "ہیتاواڈا" کا اسی دن صبح کا پرچہ لاکر دیا۔ دیکھا تو اس اخبار نے یونیورسٹی ہال میں اردو پر میری تقریر کو پورے دو کالموں میں دو کالمی جلی سرخیوں کے زیرعنوان شائع کیا تھا۔ اخبار کا رپورٹر جلسہ میں موجود تھا اس نے پوری تقریر قلمبند کی تھی۔

جہاں تک انجمن ہائی سکول کا تعلق ہے سب سے زیادہ تین حضرات خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ انجمن کے سکریٹری جناب مونس حسین صاحب۔ ہائی سکول کے ہڈ ماسٹر جناب ارشاد اللہ

خاں صاحب اور اسکول کے عربک ٹیچر مولانا سید احمد شاہجہان پوری ان تینوں اصحاب کو ہائی سکول کے ساتھ محبت نہیں عشق ہے۔ جناب سکریٹری صاحب اخلاص و عمل کے پیکر ہیں اور موجودہ صبر آزما حالات میں بھی نہایت پامردی اور ہمت کے ساتھ یہ ہائی سکول اور ایک اس کی برانچ جو مڈل سکول ہے کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں اور مڈل سکول کے لئے ایک نئی عمارت بنوا رہے ہیں۔ دونوں سکولوں میں کم و بیش ایک ہزار مسلمان طلبا تعلیم پاتے ہیں جناب ہڈ ماسٹر صاحب پرانے ماہرِ تعلیم ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے منتظم اور نہایت باہوش و معاملہ فہم انسان ہیں۔ تقسیم کے بعد اس ہائی سکول میں بھی خاک اُڑنے لگی تھی لیکن سکریٹری اور ہڈ ماسٹر دونوں کی جدوجہد اور خلوص کا یہ اثر ہے کہ آج تعلیمی اور انتظامی اعتبار سے پھر سکول کا شمار صوبہ کے نمایاں تر سکولوں میں ہونے لگا ہے تقسیم نے مالی اعتبار سے تمام اسلامی اداروں کو جو عظیم نقصان پہنچایا ہے یہ ادارہ اب تک اس میں بُری طرح مبتلا ہے۔ اب جو اسلامی ادارہ جہاں کہیں ہے وہ ملک کے سب مسلمانوں کے ہاتوں میں ایک امانت ہے اس لئے مقامی مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کا بھی قومی فرض ہے کہ وہ ان اداروں کی خبر گیری کریں۔ ورنہ ایک بنا بنایا ادارہ اگر فنا ہو گیا تو پھر اس کا دوبارہ قایم کرنا ناممکن ہو جائے گا اور اس کا ضرر صرف اُس مقام کے مسلمانوں کو نہیں بلکہ سب ہی مسلمانوں کو پہنچے گا۔ ذاتی طور پر میرے مختصر تر قیام مالیگوں میں ان تینوں حضرات نے جس خلوص و محبت اور کرم گستری کا عملی ثبوت دیا ہے وہ رسمی شکریہ کے حدود سے بالا ہے۔ اللہ تعالیٰ میری طرف سے ان کو اس کا اجر عطا فرمائے۔

افسوس ہے گذشتہ مہینہ اقبال سہیل بھی چل بسے۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے باقیاتِ صالحات اور اُس عہد کی دیرینہ روایات کے حاملین میں سے تھے۔ غیر معمولی ذہین و ذکی تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے۔ وہ اگر وکیل نہ ہوتے اور مزاج لاابالی نہ ہوتا تو علم و ادب کے میدان میں ان کی شہسواری کا مقابلہ بہت کم لوگ کر سکتے تھے۔ طبیعت حد درجہ دقیقہ رس اور دماغ بڑا نکتہ آفریں پایا تھا۔ نغز گوئی کے ساتھ اشعار میں روانی غضب کی ہوتی تھی۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ انھوں نے جو نعتیہ نظمیں لکھی ہیں وہ بھی بڑے معرکہ کی ہیں نثر بھی بہت اچھی لکھتے تھے۔ اگر کوئی صاحب اُن کے مضامینِ نثر و نظم کو مرتب کر کے یکجا شائع کر دیں تو یہ اردو ادب کی مفید اور لائقِ قدر خدمت ہوگی۔ ورنہ ان ادبی جواہر پاروں کے ضائع ہو جانے کا

نقشہ عراق و عجم

نقشہ ماخوذ از اٹلس آف دی اسلامک ہسٹری

[بصرہ، اُبلہ، عبّادان، عُذَیب، کوفہ، بانقیار، اُلّیس، جلولار، تکریت، حُلوان، کا تخمینی تعین معجم البلدان یاقوت کے بیان کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ سواد کی تخمینی حد بندی نقطوں سے کی گئی ہے، سواد کا رقبہ دریا، نہریں، چشمے، جنگل، تالاب اور بستیاں نکال کر چھتیس ۳۶ لاکھ ایکڑ بتایا گیا ہے، اس رقبہ میں مزروعہ اور غیر مزروعہ ہر دو قسم کی آراضی تھی۔]

موصل
خراسان
حلوان
تکریت
الّیس
جلولار
مدائن
حیرہ
بانقیا
کوفہ
عذیب
عبادان
بصرہ
ابلہ
شراف
زرود
مدینہ
مکہ
طائف
بحر متوسط
شام
خلیج فارس
جزیرہ نمائے عرب
بحر عرب

حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط

۲۔ محاذِ عراق و عجم

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق
(استاذ ادبیات عربی۔ دہلی یونی ورسٹی)

(۶)

۵۳۔ سعد بن ابی وقاص اور فوجیوں کے نام

[ذیل کا خط عقد الفرید میں بیان ہوا ہے، اس کتاب کے مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ یہ خط سعد کو کہاں موصول ہوا اور نہ یہ کہ اس کے راوی کون ہیں، تاہم خط کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ سے قادسیہ سفر کے دوران میں کسی مرحلہ پر سعد کو ملا۔ جہاں تک مجھے علم ہے کسی دوسری مطبوعہ قدیم تاریخ میں اس کا ذکر نہیں ہے، اور یہ بات جہاں تعجب خیز ہے شک انگیز بھی ہے، بہر حال یہ حضرت عمر کا (جو مختصر نویس مشہور ہیں اور غالباً تھے بھی) سب سے لمبا خط ہے اور اس کا مضمون عالی و فوجی اقدار پر مشتمل ہے۔]

میں تم کو اور تمہاری فوج کو تاکید کرتا ہوں کہ

(۱) ہر حال میں خدا سے ڈرتے رہیں کیوں کہ خدا کا خوف دشمن کے مقابلہ میں بہترین ہتھیار اور جنگ کی سب سے مؤثر چال ہے۔

(۲) تم اور تمہاری فوج دشمن سے جتنے چوکنا رہیں اس سے زیادہ "معاصی" سے ہوشیار رہیں کیوں کہ فوج کو دشمن سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا خود اپنے معاصی سے پہنچتا ہے

(۳) مسلمانوں کی فتح کا راز یہ ہے کہ ان کا دشمن گرفتارِ "معاصی" ہے، اگر ایسا نہ ہو تو ہم دشمن پر

فتح نہ پاسکیں، کیوں کہ ہماری تعداد اس سے کم ہے اور ہمارے ہتیار اس کے ہتیاروں سے گھٹیا ہیں اگر "معاصی" میں ہم دشمن کے برابر ہوں تو وہ قوت میں ہم سے بڑھ جائے گا اور اگر ہم اپنی راستبازی کی قوت سے اس پر غلبہ نہ پاسکیں تو اپنی فوجی قوت سے یقیناً نہیں پاسکیں گے۔

(۴) تم کو یاد رہے کہ خدا کی طرف سے ایسے فرشتے مامور ہیں جو تمہارے چال چلن پر نظر رکھتے ہیں، جن کو تمہارے ہر فعل کا علم ہوتا ہے، ان سے غیرت کرو اور خدا کی نافرمانی (معاصی) سے بچتے رہو۔

(۵) یہ نہ کہو کہ دشمن چوں کہ برا ہے اس لئے کبھی ہم پر فتح نہ پاسکے گا کیوں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض قوموں پر ان سے بڑی قومیں غالب آجاتی ہیں جس طرح مجوسی کافر بنواسرائیل پر غالب آگئے جب کہ بنواسرائیل نے نافرمانیوں سے خدا کو ناراض کیا، فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولاً۔

(۶) خدا سے دعار مانگو کہ تمہارے اندر "معاصی" سے بچنے کی طاقت پیدا ہو اور یہ دعار اسی خلوص سے ہو جس سے دشمن پر فتح پانے کی دعار مانگتے ہو، میں بھی اپنے اور تمہارے لئے خدا سے یہ دعار مانگتا ہوں۔

(۷) کوچ کی حالت میں فوج کے آرام کا خیال رکھو اور اتنا زیادہ ان کو نہ چلاؤ کہ تھک جائیں

(۸) ایسی جگہ ٹھہرنے سے ان کو نہ روکو جہاں سہولت و آرام ہو، تاکہ وہ جب دشمن سے مقابل ہوں تو ان کی توانائی بحال ہو، وہ ایک ایسے دشمن سے لڑنے جارہے ہیں جو گھر میں بیٹھا ہے اور جس کے سپاہی اور جانور تازہ دم ہیں۔

(۹) دوران کوچ میں ہر ہفتہ ایک دن اور ایک رات قیام کرو تاکہ فوج کو آرام ملے اور وہ اپنے ہتیار اور سامان درست کرسکیں۔

(۱۰) جن لوگوں سے تم صلح کر دیا جو جزیہ دے کر تمہاری پناہ میں آجائیں، ان کی بستیوں سے دور پڑاؤ ڈالو، اور کسی کو ان بستیوں میں نہ جانے دو سوائے اس شخص کے جس کی سیرت پر تم کو پورا

پورا بھروسہ ہو۔

(۱۱) تمہارا کوئی سپاہی یا فوجی افسر بستی والوں کی کسی چیز پر ناجائز قبضہ نہ کرے، کیونکہ تم نے ان کی حفاظت ان کی جان مال اور آبرو کے احترام کا ذمہ لیا ہے اور یہ ایک آزمائش ہے جس طرح اپنے مواخذات سے عہدہ برآ ہونے کی ذمہ داری ان کے (یعنی ذمیوں اور اہل معاہدہ) کے لئے ایک آزمائش ہے، جب تک وہ اس ذمہ داری کو خوبی سے انجام دیتے رہیں۔[۲]

(۱۲) جن لوگوں سے تم نے صلح کی ہو ان پر ظلم و ستم کر کے دشمن پر فتح پانے کی خواہش نہ کرو۔

(۱۳) جب دشمن کے علاقہ میں پہنچو تو تحقیق حال کے لئے جاسوس بھیجو اور دشمن کے حالات سے پوری طرح باخبر رہو۔

(۱۴) تمہارے پاس جاسوسی اور مشورہ کے لئے ایسے عرب یا مقامی غیر عرب ہوں جن کی نیک نیتی اور حق گوئی پر تم کو اعتماد ہو، کیونکہ عادۃً جھوٹا اگر سچی خبر بھی لائے تو تم کو اس سے فائدہ نہ ہوگا، اور دھوکہ باز تمہارے خلاف جاسوسی کرے گا نہ کہ تمہارے حق میں۔

(۱۵) دشمن کے علاقہ سے قریب پہنچ کر تم کو چاہیئے کہ ادھر ادھر رسالے بھیجو، اور دشمن اور اپنے درمیان دستے پھیلا دو، یہ دستے رسد اور فوجی اہمیت کی چیزوں کو دشمن تک پہنچنے سے باز رکھیں، اور رسالے دشمن کی دفاعی خامیاں دریافت کریں۔

(۱۶) رسالوں کے لئے ایسے لوگ منتخب کرو جو بہادر اور صائب رائے ہوں اور ان کو تیز رفتار گھوڑے دو۔

(۱۷) دستوں میں ایسے لوگ ہوں جن کو جہاد کی لگن ہو اور جو تلواروں کے نیچے پامردی سے ڈٹے رہیں۔

(۱۸) رسالوں اور دستوں کے انتخاب میں ذاتی دلچسپی کو دخل نہ دو، کیونکہ ایسا کرنے سے تمہارے مشن کو جو نقصان پہنچے گا اور تمہاری لیاقت پر جو حرف آئے گا وہ اس فائدہ سے کہیں زیادہ ہوگا جو دوستوں کے ساتھ رعایت کرنے سے ممکن ہے۔

(۱۹) رسالے اور دستے اسی سمت کو بھیجو جہاں ان کے شکست کھانے، نقصان اٹھانے

۲؎ تمہارا فرض ہے کہ تم ان [illegible]

یا تباہ ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

(۲۰) جب دشمن تمہارے سامنے آئے تو اپنی بکھری ہوئی فوجیں، رسالے اور دستے سب اپنے قریب جمع کر لو اور اپنی قوت اور چالوں سے کام لینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

(۲۱) جب تک دشمن خود حملہ آور نہ ہو، لڑنے میں جلدی نہ کرو، تاکہ تم اس کی فوجی خامیوں اور دفاعی کمزوریوں سے واقف ہو سکو اور اپنے گرد و پیش سے مقامی باشندوں کی طرح باخبر ہو جاؤ، اس واقفیت کے بعد تم اُس بصیرت سے لڑ سکو گے جس سے دشمن لڑنے پر قادر ہو گا۔

(۲۲) اس کے علاوہ تم اپنی فوج پر پہرہ دار مقرر کرو اور حتی المقدور شب خون سے چوکنا رہو۔

(۲۳) اگر کوئی ایسا قیدی جس کو امان نہ دی گئی ہو تمہارے پاس لایا جائے تو اس کی گردن مار دو تاکہ دشمن کے دل میں ڈر بیٹھ جائے، اللہ تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا نگہبان ہے اور اُسی کی مدد پر فتح کا دار و مدار ہے[1] (عقد الفرید، ابن عبد ربہٖ، مصر ۱۹۱۳، ۱/ ۶۷ - ۶۸)

۵۴- سعد بن ابی وقاص کے نام

[سعد نے فتح قادسیہ کے بعد مرکز کو خوش خبری کا خط بھیجا اور اس میں لکھا کہ جنگ ختم ہونے کے دوسرے دن شام سے سات سو ستر مجاہدوں کی کمک وارد ہوئی ہے، میں نے ان کو مالِ غنیمت میں شریک نہیں کیا اور اس باب میں آپ کی رائے کا منتظر ہوں، جواب میں حضرت عمرؓ نے لکھا]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، سلام علیک، میں اس معبود کا سپاسگذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور اس کے نبی محمدؐ پر درود بھیجتا ہوں، تمہارا خط ملا، اس فتح کے لئے خدا کا بہت بہت شکرگذار ہوں جو تمہارے ہاتھوں اس نے ہم کو عطا کی، خدا نے مجھ کو تمہارا حاکمِ اعلیٰ

[1] یہ خط نہایت الأرب نُویری (مصر، ۶/ ۱۶۸ - ۱۶۹) جواہر الادب، احمد ہاشمی بک (مصر ۱/ ۱۷۷) اور عصر القرآن، محمد مہدی بصیر (بغداد ص ۴۴ - ۴۵) میں بھی نقل ہوا ہے، مگر ماخذ سب کا عقد الفرید ہے جسے اسپین کے ادیب ابن عبد ربہ نے چوتھی صدی ہجری میں تصنیف کیا۔

بنا کر میری آزمائش کرنا چاہی ہے، جس طرح تم کو میرا ماتحت کر کے تمہاری آزمائش کرنا چاہی ہے، وانی واللہ لا احصی شیئاً من امورکم فاعلمہ واماذا اجتمع صلح (؟) جب حاکم ہمدرد ہو اور رعایا اس کی خیر اندیش تو حاکم کا فرض ہے کہ رعایا کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور رعایا کا فرض ہے کہ وہ اس برتاؤ کی قدر کرے اور حاکم کی شکر گذار ہو، مالِ غنیمت ان لوگوں کا حق ہے جو جنگ میں شریک ہوں، اور جو لوگ بطور کمک جنگ ختم ہونے کے تین دن کے اندر آئیں ان کو بھی مالِ غنیمت کا کچھ حصہ ملنا چاہیئے۔ تمہارے غلام اور موالی اگر جنگ شروع ہونے کے تین دن کے اندر شریک ہوں تو وہ بھی مالِ غنیمت سے حصہ پائیں گے۔ جو مال و متاع بطور غنیمت تمہارے قبضہ میں آئے اس کی تقسیم انصاف سے کرو۔[1]

۵۵۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[زُہرہ بن حَوِیَّہ جُشَمی سعد کے مقدمۃ الجیش کے ایک نوعمر، نڈر، اور چابک دست کمانڈر تھے۔ ہر خطرہ میں گھس جاتے تھے، تلوار بازی اور تیر اندازی میں ان کو غیر معمولی مہارت تھی۔ جنگ قادسیہ میں بہت سے ایرانی ان کی تلوار کا شکار ہوئے، ان میں ایک بہت بڑا فوجی افسر جالینوس تھا، زُہرہ نے اس کی وردی اور ہتیار اُتار لئے، وردی پر اتنا قیمتی کام تھا کہ کہا جاتا ہے اس کی قیمت ستر ہزار درہم (تقریباً چالیس ہزار روپے) تھی۔ زُہرہ وردی پہن کر سعد کے پاس آئے تو سعد نے وردی اتار لی اور ترشی سے کہا کہ تم نے میری اجازت کا بھی انتظار نہ کیا اور وردی پر قابض ہو گئے۔ زہرہ کو یہ سختی ناگوار ہوئی اور انھوں نے شکایت کا خط مرکز کو لکھا اور سعد نے بھی زُہرہ کی بے ضابطگی اور اس قدر قیمتی وردی پر تن تنہا قابض ہونے کی شکایت کی تو حضرت عمرؓ نے ذیل کا خط بھیجا۔]

"تم زُہرہ جیسے شخص سے اُلجھے، حالاں کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ اس نے جنگ کی آگ میں کیسی کیسی لپٹیں کھائی ہیں اور ابھی یہ آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے۔

---

[1] فتوح الشام واقدی مصر، ذکر فتوحات عراق، ۲/۱۱۵)

(۳) سخت گیری سے اُس کا حوصلہ نہ توڑو اور نہ اُس کا دل بُرا کرو۔

(۴) وردی اور ہتیار جو اس نے جالینوس کو مار کر لئے ہیں بحال کر دو اور اُس کو دوسرے مجاہدینِ قادسیہ سے پانچ سو درہم زیادہ عطار (سالانہ تنخواہ) دو۔[1]

۵۶ و ۵۷ سعد بن ابی وقاص کے نام

[ذیل کے دو خط سعد کے ان دو مراسلوں کے جواب میں ہیں جن میں انھوں نے فتح قادسیہ کے بعد حضرت عمر سے مشورہ کیا تھا کہ سواد کے رئیسوں اور کاشتکاروں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے پہلے مراسلہ میں انھوں نے لکھا:— سواد کے بعض رئیس دعوی کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے خالد اور مثنیٰ کے فتوحات کے زمانہ میں ان سے معاہدے کئے تھے، مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے خالد اور مثنیٰ سے معاہدہ کرنے والے سارے رئیس باستثنار، بانقیا، باسما، اور الّیس الآخرۃ، معاہدے توڑ کر باغی ہو گئے تھے۔ ان رئیسوں کا دعویٰ ہے کہ ایرانیوں نے ان کو عہد شکنی اور مسلمانوں سے لڑنے پر مجبور کیا، تاہم نہ تو وہ ہم سے لڑے اور نہ اپنے علاقے چھوڑ کر بھاگے۔ دوسرے مراسلہ کا مضمون یہ تھا:— اہلِ سواد جنگ کے زمانہ میں گھر بار چھوڑ کر محفوظ جگہ چلے گئے تھے اور ایک جماعت نے مدائن میں پناہ لی تھی۔ جنگ کے بعد متعدد رئیس ہمارے پاس آئے جنہوں نے پاسِ عہد کیا تھا اور ہمارے خلاف جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے، ہم نے ان کے وہ معاہدے جو انھوں نے ہمارے پیش رو مسلمانوں (یعنی خالد اور مثنیٰ) سے کئے تھے مشروط طور پر بحال کر دیئے ہیں۔ بتایئے ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے جو

(۱) معاہدوں پر قائم رہے۔

(۲) جو گھر بار چھوڑ کر چلے گئے۔

(۳) جو دعوی کرتے ہیں کہ ان کو عہد شکنی اور لڑنے پر مجبور کیا گیا مگر وہ نہ تو بھاگے اور نہ لڑے۔

---

[1] حضرت عمر نے ۱۵ھ میں مجاہدین بدر کی سالانہ تنخواہ ۵ ہزار درہم سالانہ مقرر کی تھی، اور مجاہدین قادسیہ کی دو ہزار سالانہ، مگر جن لوگوں نے اس جنگ میں غیر معمولی کرتب دکھائے تھے، ان کو پانچ سو درہم زیادہ دیئے گئے یعنی ڈھائی ہزار سالانہ، ایسے[2]

[2] لوگ "اعزازی تنخواہ دار" کہلائے (طبری ج ۴ ص ۱۳۵/۲)

(۴) جو مقیم رہے اور جزیہ دینے کو تیار ہیں۔ امیر المؤمنین ہم ایک بڑے دل نشین اور سرسبز ملک میں ہیں جہاں کی بستیاں اور اراضی جنگ کے زیر اثر اجڑ گئی ہیں، ہماری رائے ہے کہ اہل سواد کی دل جوئی کی جائے اور ان کے ساتھ نرم برتاؤ کیا جائے، اس سے سواد کی زراعت اور خوش حالی قائم رہے گی اور دشمن کے حوصلے بھی پست ہو جائیں گے۔"]

حضرت عمر نے خط پا کر ایک عام جلسہ میں تقریر کی اور حاضرین کو دونوں مراسلوں کے مضمون سے آگاہ کر کے ان کی رائے معلوم کی، عمائدین صحابہ نے کہا: جو معاہد رئیس اپنے اپنے علاقوں میں رہے ہوں اور انھوں نے ایرانیوں کے ساتھ تعاون نہ کیا ہو، ان سے جو معاہدے کئے گئے ہوں وہ برقرار رکھے جائیں۔

(۲) جو معاہد اس بات کے مدعی ہوں کہ ان کو ایرانیوں نے نقض عہد اور جنگی تعاون پر مجبور کیا مگر انھوں نے نہ عہد توڑا اور نہ جنگی مدد دی، ایسے لوگوں کے حق میں اگر شہادت مل جائے تو ان کے معاہدوں کو بھی برقرار رکھا جائے اور اگر شہادت ان کے خلاف ہو تو معاہدوں کو منسوخ کر دیا جائے اور ان سے نئے معاہدے کئے جائیں۔

(۳) جو لوگ گھر بار چھوڑ کر چلے گئے ہوں ان کے معاملہ میں مسلمانوں کو اختیار ہے کہ چاہے ان سے مصالحت کر کے جزیہ گذار بنالیں یا ان کی اراضی و املاک پر خود قابض ہو جائیں۔

(۴) جو لوگ اپنے گھر مقیم رہے ہوں اور مسلمانوں کی سیادت تسلیم کریں ان پر جزیہ لگایا جائے ورنہ ان کو گھر بار چھوڑ کر جلا وطن ہونے پر مجبور کیا جائے۔

پہلے مراسلہ کا جواب

"واضح ہو کہ خدائے بزرگ و برتر نے ہر معاملہ میں انسان کو (بشرط مجبوری) ترک و اخذ کا حق دیا ہے مگر دو معاملے اس سے مستثنیٰ ہیں:۔ انصاف، اور خدا کی یاد۔ خدا کی یاد میں کسی انسان کو کسی حال میں ترک و اخذ کا حق نہیں ہے، کیوں کہ خدا چاہتا ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ یاد کیا جائے۔ انصاف کے معاملہ میں بھی کسی کو یہ اختیار نہیں کہ ایک کے ساتھ انصاف کرے اور ایک کے

ساتھ نہ کرے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ عزیز و بے گانہ، دوست و دشمن، مصیبت و شادمانی، ہر شخص اور ہر حال میں انصاف سے کام لے۔ انصاف اگرچہ نرم نظر آتا ہے، مگر اس میں ظلم و باطل کے توڑنے اور خدائی نافرمانی کو رد کرنے کی بے پناہ قوت ہے۔

(۲) جو اہلِ سواد معاہدے پر قائم رہے ہوں اور انھوں نے کسی طرح تمہارے خلاف کارروائی نہ کی ہو تو وہ تمہاری امان میں ہیں اور ان سے جزیہ وصول کیا جائے۔

(۳) جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو عہد شکنی پر مجبور کیا گیا، مگر انھوں نے تم سے نہ تو جنگ کی نہ جلاوطن ہوئے، تو تم کو اختیار ہے چاہے ان کا دعویٰ مان لو اور چاہے اس کو رد کر کے مزعومہ معاہدوں کو برقرار نہ رکھو اور ان کو ایرانی علاقہ میں پہنچا دو۔

دوسرے مراسلہ کا جواب

جو رئیس اپنے اپنے علاقوں میں مقیم رہے ہوں اور ان سے معاہدے نہ ہوئے ہوں ان کے ساتھ اہلِ معاہدہ کا سا معاملہ کیا جائے، کیوں کہ وہ گھر بار چھوڑ کر نہیں گئے اور نہ انھوں نے تمہارے خلاف کوئی کارروائی کی۔

(۲) جن کاشتکاروں کا طرزِ عمل یہ رہا ہو ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا جائے۔

(۳) جو رئیس دعویٰ کریں کہ ان سے معاہدے کئے گئے تھے (اور انھوں نے تمہارے خلاف ایرانیوں کے ساتھ تعاون نہ کیا ہو) اور ان کے دعوی کی تائید میں ثبوت فراہم ہو تو وہ بھی جزیہ دے کر مسلمانوں کی امان میں رہیں گے اور اگر ثبوت ان کے خلاف بہم ہو تو اُن کے پرانے معاہدے منسوخ کر دئے جائیں اور ان سے نئے معاہدے کئے جائیں۔

(۴) جن رئیسوں نے ایرانیوں کے ساتھ تعاون کیا ہو اور گھر بار چھوڑ کر چلے گئے ہوں تو ان کے معاملہ میں تم کو خدا کی طرف سے اختیار ہے کہ ان کو بلا کر ان کی اراضی اور املاک لوٹا دو، اور وہ جزیہ دے کر مسلمانوں کی امان میں رہیں، اور اگر وہ واپس آنا پسند نہ کریں تو ان کی اراضی و املاک آپس میں بانٹ لو۔[1]

---

[1] طبری ۴ / ۱۴۵

۵۸۔ سعد بن ابی وقاص کے نام

[قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج، بلاذری نے فتوح البلدان اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں حضرت عمرؓ کا ایک خط نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے سواد فتح کر کے مطالبہ کیا تھا کہ وہاں کی اراضی اور باشندے ان کی ملک میں دے دیئے جائیں، مگر حضرت عمرؓ نے یہ مطالبہ نہ مانا اور ذیل کا خط لکھا۔]

"تمھارا خط ملا، تم نے لکھا ہے کہ مسلمان وہ اراضی آپس میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جس کو انھوں نے بزور شمشیر فتح کیا ہے۔

(۲) میرا یہ خط پا کر دیکھو کہ مسلمان تمہارے لشکر میں شکست خوردہ دشمن کا کیا سامان اور مویشی لائے ہیں، اس سامان کو خمس نکال کر لشکر پر تقسیم کر دو۔

(۳) اور اراضی، دریاؤں اور نہروں کو ان لوگوں کے پاس چھوڑ دو جو ان کو کاشت کرتے رہے ہیں، تاکہ ان سے جو خراج وصول ہو وہ مسلمانوں کی تنخواہوں اور وظیفوں میں دیا جا سکے، اگر تم نے سواد کی اراضی فوج میں تقسیم کر دی تو بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے کچھ نہ بچے گا۔

(۴) میں نے تم کو ہدایت کی تھی کہ جب کسی قوم سے مقابل ہو تو لڑنے سے پہلے اس کو اسلام کی دعوت دو۔

(۵) اور یہ کہ جو شخص جنگ سے پہلے دعوت قبول کر لے گا اس کی حیثیت دوسرے مسلمانوں کی سی ہوگی، اس کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور اس پر وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مسلمانوں پر عاید ہیں، اور اس کو مال غنیمت میں حصہ بھی ملے گا۔

(۶) اور جو شخص جنگ اور شکست کے بعد اسلام لائے گا، اس کی حیثیت بھی مسلمان کی سی ہوگی، لیکن اس کی دولت کے مالک مسلمان ہوں گے، کیوں کہ اسلام لانے سے پہلے اس کی دولت مسلمانوں کی ملک ہو چکی ہے[1]۔)

---

[1] اس خط کا مابین القوسین حصہ فتوح البلدان اور تاریخ دمشق میں نہیں ہے، یہ پورا خط کتاب الخراج سے لیا گیا ہے۔

۵۹ - سعد بن ابی وقاص کے نام

[جسر کی شکست میں چار ہزار مسلمان قتل اور غرق ہوئے، دو ہزار بھاگ کر صحراؤں اور مدینہ میں چھپ گئے اور مثنیٰ بن حارثہ کے پاس صرف تین ہزار کی جمعیت رہ گئی، ایرانیوں سے نمٹنے کے لئے انھوں نے مرکز سے کمک طلب کی، حضرت عمرؓ نے یمن کے قبیلہ بجیلہ کو جو اس وقت مدینہ آیا ہوا تھا، مثنیٰ کی مدد کو بھیجنا چاہا مگر ان کو عراق کی بجائے شام جانے پر اصرار تھا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی جسر کی تباہی سے لوگ ڈرے ہوئے تھے، اور دوسرے شام کے محاذ پر یمن کے بہت سے قبیلے جا چکے تھے اور بجیلہ اپنے ہم نسب قبائل کے ساتھ رہنے کے خواہش مند تھے، وقت کے شدید تقاضہ کے زیر اثر حضرت عمرؓ نے بجیلہ کو ایک رعایت دے کر عراق کی طرف مائل کرنا ضروری سمجھا انھوں نے جریر سے کہا جو بجیلہ کے لیڈر تھے کہ اگر تم عراق کے محاذ پر چلے جاؤ تو تمھیں اور تمہارے قبیلہ کو فتوحات کے خُمس کا چوتھائی حصہ دیا جائے گا، قبیلہ نے یہ پیشکش منظور کی - یہ تو طبری (۴/۷۰) کے راویوں کا قول ہے، اس کے علاوہ ایک روایت جسے فتوح البلدان (ص ۲۷۷) نے نقل کیا ہے اور جس کی بنیاد پر ذیل کا خط وارد ہوا ہے یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے مفتوحہ اراضی و غنائم کے چوتھائی حصہ کا وعدہ کیا تھا، اور ایک تیسری روایت تو یہاں تک ہے کہ تین برس تک قبیلہ بجیلہ کو سواد کا چوتھائی خراج بھی دیا جاتا رہا تھی کہ حضرت عمرؓ نے جریر کو اس بات پر مائل کیا کہ وہ سارے مسلمانوں کے حق میں اس آمدنی سے دستبردار ہو جائیں اور وہ ہو گئے - جلولاء میں ایرانیوں نے دوسری بڑی شکست کھائی اور سواد کا سارا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا تو بجیلہ نے فتوحات کا چوتھا حصہ طلب کیا، سعد نے اس کی اطلاع مرکز کو دی تو یہ خط آیا -]

" اگر جریر یہ سمجھتے ہوں کہ ان کی فوج اور انھوں نے " مُؤَلَّفَۃُ القلوب " کے خاص حصہ کی خاطر جنگ کی تھی تو ان کو یہ حصہ دے دو، اور اگر انھوں نے جنگ اسلام کی خاطر اور انعام ایزدی کے حصول کے لئے کی تھی، تو وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح ہیں، ان کو وہی فوائد حاصل ہوں گے جو

دوسرے مسلمانوں کو ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو دوسرے مسلمانوں پر ہیں۔" [۱]

۶۰ - قُطبہ بن قَتادہ سَدُوسی کے نام

[جب خالد بن ولید یمامہ سے چل کر فُرات کے آس پاس کا ایرانی علاقہ فتح کرتے ہوئے حیرہ روانہ ہوئے تو انھوں نے ایک عرب سردار قُطبہ بن قَتادہ سَدُوسی کو دِجلہ و فُرات کے دہانہ کی نگرانی کے لئے چھوڑ دیا تھا، قُطبہ کے پاس فوج کم تھی، پھر بھی وہ ایرانی بستیوں اور استحکامات پر چھاپے مارتے رہتے تھے جس طرح مثنیٰ بن حارثہ حیرہ کے اطراف میں چھاپے مار رہے تھے، سنہ ۱۴ھ میں انھوں نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ اگر آپ تھوڑی سی فوج بھیج دیں تو میں آس پاس کے ایرانیوں کو مار بھگاؤں جواب میں حضرت عمرؓ نے ذیل کا خط لکھا۔]

"تمہارا خط موصول ہوا، تم نے لکھا ہے کہ تم آس پاس کے فارسیوں پر حملے کر رہے ہو تمہاری یہ کارروائی مناسب ہے، جب تک میرے پاس سے مزید ہدایات آئیں اپنی جگہ ٹھہرے رہو اور خوب چوکنا رہو کہ تمھارے ساتھیوں کو دشمن کے ہاتھوں کوئی نقصان نہ پہنچے۔" (طبری ۴/ ۱۵۰)

۶۱ - عُتبہ بن غَزوان کے نام

[اُبُلّہ سنہ ۱۴ھ میں صحابی عُتبہ بن غَزوان کی قیادت میں فتح ہوا، یہ اہم بندرگاہ دِجلہ اور فُرات کے دہانہ کے پاس بصرہ سے کوئی چودہ [۱۴] میل شمال مشرق میں خلیج فارس پر واقع تھا، جہاں ہندوستان، جزائر ہند اور چین سے تجارتی جہاز آتے تھے، اس پر فارسیوں کا قبضہ تھا، یہاں کے مالِ غنیمت سے ایک شخص کو حصہ میں ایک بڑی دیگچی ملی جو پیتل کی خیال کی گئی مگر واقعتہً سونے کی تھی، جب حقیقتِ حال کا علم عُتبہ کو ہوا تو انھوں نے حضرت عمرؓ سے استفسار کیا کہ آیا دیگچی واپس لے لی جائے یا پانے والے کے پاس رہنے دی جائے۔

"اگر سلمہ (دیگچی پانے والے کا نام) خدا کی قسم کھا کر کہے کہ اس نے دیگچی کو پیتل کا سمجھ کر لیا تھا تب تو اس کے حق میں بحال رکھی جائے، ورنہ اس کو مسلمان آپس میں بانٹ لیں۔" (طبری ۴/ ۱۵۲)

[۱] فتوح البلدان بلاذری ص ۳۴۸

خواب

از

پروفیسر مولانا سید عبد الماجد صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر
(اسلامک ایجوکیشن بہار)

عالمِ خواب کی دل چسپیاں بیداری سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ بعض اوقات بڑھ جاتی ہیں۔ بیداری میں ہم انھیں مناظر کا نظارہ کرتے ہیں جو ہمارے سامنے موجود ہوتے ہیں، اور جب کبھی عالمِ تصور کی سیر کرنے لگتے ہیں تو یہ میدان مشاہدۂ نظری سے زیادہ وسیع ہے۔ پھر بھی بعض فلسفی قیود اس کو محدود کر دیتے ہیں، عالمِ تصور میں ہم کبھی جشنِ ماضی کا مزا لیتے ہیں اور کبھی اپنے مستقبل کی رنگین تصویر اپنی آرزوں کی روشنی میں کھینچنے لگتے ہیں لیکن اس کا دار و مدار بھی اپنے گذشتہ تجربوں پر ہوتا ہے، کیوں کہ ہم اپنے صفحۂ تخیل پر کوئی ایسا نقشہ نہیں کھینچ سکتے ہیں جس سے ہمارا ذہن خالی ہو، یہ ہوتا ہے کہ ایک قسم کی بیل پر دوسرے قسم کے بوٹے لگا کر ایک نیا گلدستہ بنا لیتے ہیں، لیکن اس جوڑ توڑ کے لئے بھی موقع محل، تناسب، وضع قطع، حسن و قبح، کی رعایت لازمی ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ امکان عقلی کی سند کے بغیر کوئی نقشہ قبول خاطر نہیں ہوتا۔ اگر ہم چاہیں کہ ایک ایسے باغ کا تصور کریں جو محض ہوا پر معلق ہو تو قوتِ متخیلہ تھوڑی کاوش کے بعد عاجز ہو کر رہ جائے گی، کیوں کہ جب کسی درخت کا تصور ذہن میں آتا ہے تو فطرتاً ایسی زمین نظر آنے لگتی ہے جس سے اس کی جڑ کا تعلق ہو کیوں کہ عقلِ انسانی اسی کی عادی ہے۔ اور جب آپ کسی ایسے درخت کا تصور کرنے لگیں، جس کو کسی زمین سے تعلق نہ ہو۔ تو یہ نقشہ نہیں جمتا، برخلاف اس کے عالمِ خواب تمام عقلی قیود سے آزاد ہے اور ہر فلسفی پابندی سے بری کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک آن اور ایک مکان میں متضاد نقشے دیکھتے ہیں، کبھی تاریکی دیکھتے ہیں اور اسی تاریکی میں آفتاب کا تصور بھی آجاتا ہے، کبھی آگ دیکھتے ہیں اور اسی سے بالکل متصل

بہتا ہوا چشمہ نظر آتا ہے ایک مردہ دیکھتے ہیں اور پھر اسی سے گفتگو ہونے لگتی ہے۔ سوال وجواب ہوتا ہے، قبر دیکھتے ہیں اور اس میں دل کش چمن کا نظارہ آتا ہے۔ بھلا کہئے خواب کی یہ دلچسپیاں کس قدر بڑھی چڑھی ہیں۔ آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ ہمارے یہ خواب کیا ہیں، اور ہماری روزمرہ کی زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ ہم دانستہ یا نادانستہ اس سے کیا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ خواب کے مختلف پہلو آپ کو دکھاؤں!

خواب صداقت اور کذب کے لحاظ سے تین قسم کے ہوتے ہیں، (۱) نفسانی (۲) روحانی (۳) رحمانی پہلی قسم کا تعلق فلسفۂ نفسیات سے ہے، دوسری کا روحانیات (SPIRITUALISM) سے اور تیسری کا الہیات (DIVINITY) سے ہماری عقلیں اکثر ان چیزوں کے سمجھنے سے قاصر رہتی ہیں جو طبیعات (METAPHYSICS) سے بالا ہیں، ہمارا استدلال، ہماری تحقیق ہمارا قیاس زیادہ تر ہمارے طبعی تجربات سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے میں پہلے خواب کے ان نظریات کو پیش کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق طبیعات اور نفسیات سے ہے۔ مسٹر فرائڈ کا تو دعویٰ ہے کہ خواب کا تعلق محض نفسیات ہی سے ہے اور اس کا روحانیات اور الہیات سے کوئی واسطہ نہیں، میں ان کے اس خیال کو ان کی عدمِ واقفیت پر محمول کرتا ہوں کیوں کہ یہ فلسفۂ نفسیات کے ماہر تو بے شک ہیں لیکن ان کی روحانی اور مذہبی واقفیت بہت محدود ہے، میں نے اپنے رسالہ رویائے صادقہ PROPHETIC DREAM میں ان کے بعض ایسے نظریات جو انھوں نے اپنی کتاب "تعبیرات خواب" INTERPRETATION OF DREAM میں رویائے صادقہ کے خلاف قایم کئے ہیں ایک بسیط بحث کی ہے، اور تجربات سے استدلال کرتے ہوئے سو سے زیادہ ایسے جواب درج کئے ہیں کہ جن کی صداقت ثابت ہو چکی ہے۔ اس مضمون میں اتنی گنجایش نہیں کہ یہ مختلف فیہ بحث چھیڑی جائے، میں خواب کے نفسیاتی نظریات کو مانتے ہوئے رویائے صادقہ کا بھی قائل ہوں، جس کو بالاختصار پیش کروں گا،

انسان کی نظر کے سامنے سے جتنی چیزیں گذرتی ہیں اس کی تصویریں صفحاتِ خیال پر آجاتی ہیں اور فطرتاً ایک سینما کا سا مسلسل فلم تیار ہو جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ جب کبھی ہم کسی گذشتہ واقعات کو

یاد کرتے ہیں تو ایک مسلسل نقشہ سامنے آجاتا ہے، جس طرح کسی کتاب سے کسی خاص مضمون کو نکالنے سے پہلے فہرست مضامین پر نظر دوڑانی ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی گذشتہ واقعہ سے اپنے حافظہ کا ربط قایم کرنے سے پہلے ہم جلد جلد کتابِ خیال کی ورق گردانی کر جاتے ہیں، ہمیں اپنے حافظہ سے کام لینے میں ایک رابطہ کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے وہ واقعہ جلد یاد آتا ہے جس کی مشابہت ہمیں خارج میں نظر آتی ہے۔ اس کو یوں سمجھیں کہ اگر کسی شخص کو کسی سفر میں ایک تنہائی کے مقام پر کوئی بھیانک شکل نظر آگئی تو اس واقعہ کا اعادہ ہر اس موقع پر ہوجاتا ہے، جب کسی سفر میں تنہائی کا موقع آجاتا ہے، یا جب کوئی کریہہ منظر تصویر نظر سے گذرتی ہے، یا جب کبھی کسی اور وجہ سے خوف زدہ ہوجاتا ہے، کیوں کہ سفر کی تنہائی، کسی تصویر کا کریہہ منظر ہونا، خوف کا طاری ہوجانا، الگ الگ اس واقعہ کی کیفیتوں سے مشابہ ہیں، جس واقعہ کی مشابہت جلد تصویر میں نہیں آتی، اس کے یاد کرنے میں دقت ہوتی ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان اس کے اعادہ سے مجبور ہوجاتا ہے، اسی کیفیت کو نسیان کہتے ہیں ہر انسان کے دماغ میں کچھ ایسے نقشے موجود ہیں کہ جن کا اکثر اعادہ ہوتا رہتا ہے، بعض ایسے نقشے ہیں جن کو غور و فکر کے بعد تصور میں لانا ممکن ہے، اور بعض نقشے ایسے ہیں جو عالم نسیان کے ایسی تاریک تہ میں پڑے ہیں کہ جن کا اعادہ ناممکن ہے۔

انسان کا دماغ کبھی معطل نہیں رہتا، اکثر حواس خمسہ کے محسوسات سے متاثر ہو کر دماغ اس کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور کبھی تو ان محسوسات کو اپنا کھلونا بنا کر اس سے کھیلتا رہتا ہے۔ اور مزے لیتا رہتا ہے اور کبھی ان سے مقابلہ کرتا ہے، جس کے اثر سے جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور اس اشتغال کا نتیجہ کبھی راحت کبھی رنج ہوتا ہے، کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا کہ دماغ معطل اور نچلا ہو کر سکون حاصل کرے، دماغ اور دل کی حرکت ایک ہی وقت رکتی ہے، اور اسی کو موت کہتے ہیں، ورنہ خواب میں غشی میں، سکتے میں ہر حالت میں دل و دماغ اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات ایک زندہ شخص کے قلب کی حرکت محسوس نہ ہو سکے یا اس کے شغلِ دماغ کا اثر حواس خارجی پر نہ پڑ سکے۔

خواب حواسِ خارجی کے معطل ہونے کو کہتے ہیں، یعنی جب انسان دیکھنے، سننے، چھونے، سونگھنے، اور چکھنے کی مشغولیتوں سے علیحدہ ہو کر پڑ جاتا ہے، تو اس حالت کو خواب کہتے ہیں، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ تمام حواسِ خمسہ کی طاقت زائل ہو جاتی ہے، بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ ان کا رابطہ خارجی ماحول سے باطن کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اس کا طبعی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ طبیعت یک سو ہو کر قوئ بدنی کی اصلاح کی طرف مائل ہو جاتی ہے، اور بدلِ ما تحلل ہونے لگتا ہے۔

دماغی تشاغل میں سب سے زیادہ قوتِ ممیزہ کام کرتی ہے، کیوں کہ ایک چیز سے دوسری چیز کا امتیاز کر کے اس پر کسی کیفیت یا حال کا حکم اثباتی یا انکاری صادر کرتی ہے، یہ مسلم ہے کہ بیداری کے لئے تمیز لازمی شے ہے۔ اس لئے قوتِ ممیزہ تھک کر حالتِ خواب میں معطل ہو جاتی ہے، اور اس کے معطل ہونے سے قوتِ حافظہ اور مدرکہ بھی بے کار ہو جاتی ہے، ساتھ ہی ساتھ دماغ اپنی مشغولیت کے لئے متخیلہ کی مختلف تصویریں اُلٹ پھیر کر مطالعہ کرنے لگتا ہے بغیر کسی امتیاز کے مختلف تصویریں سامنے آنے لگتی ہیں، اور روحِ حیوانی اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے، اکثر اتفاقی طور سے مسلسل نقشے کسی گذشتہ واقعہ کے پیش آتے ہیں، جو تسلسل اور تناسب کی وجہ سے حافظہ پر منقش ہو جاتے ہیں، اور بیداری کے بعد یاد آتے ہیں، اب اگر وہ گذشتہ واقعے عالمِ بیداری میں لائقِ اعادہ تھے، یعنی اس کو وہ شخص یاد کر سکتا تھا تو یاد آجاتا ہے کہ یہ واقعہ فلاں مقام اور فلاں زمانہ کا تھا۔ لیکن جب وہ ایسے نقشے ہوتے ہیں جو نسیان کی تہ میں بیٹھ چکے ہیں تو انسان اس کو ایک نیا منظر سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی ماہرِ نفسیات اس کی تحلیلِ نفسی کرنے لگے تو بہت ممکن ہے کہ یہ پتہ چل جائے کہ خواب کا وہ نقشہ بیداری کے کسی گذشتہ واقعہ کی تصویر ہے۔ مگر سرسری نظر میں وہ نیا نقشہ معلوم ہوتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نقشے مسلسل نہیں ہوتے ہیں بلکہ غیر مسلسل، ایسی حالت میں اس کا رابطہ گذشتہ واقعہ سے پیدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے، فرض کیجئے احمد نے کبھی محمود کے ساتھ چمن کی سیر کی تھی اور اثنائے سیر میں ایک گلاب پر ایک بلبل کو دیکھا کہ گرد گھوم گھوم کر نغمہ سرائی کر رہی ہے، اور کسی دوسرے موقع پر یہ واقعہ گذرا تھا کہ احمد ایک ہاتھی پر سوار ہے اور ایک شیر کا شکار کرنے کا تہیہ کر رہا ہے، اب

دونوں واقعے کبھی اس طرح مختلط ہو جاتے ہیں کہ ایک تصویر دوسرے منظر کی دوسری تصویر سے متصل نظر آتی ہے، اور بعض کا نقشہ ذہن سے غائب ہو جاتا ہے، اب وہ دیکھتا ہے کہ ایک باغ میں محمود گلاب کے پودے کے سامنے کھڑا ہے احمد اس کو تیر مارنے کا تہیہ کر رہا ہے، اور پھر محمود بلبل بن کر پرواز کرنے لگتا ہے۔ اور ایک ہاتھی پر شیر سوار ہے محمود اس کے کان کے پاس احمد کی شکایت کرتا ہے۔ اور احمد کے خلاف اس کو ابھارتا ہے، اگرچہ یہ خواب دو گذشتہ واقعوں کا مجموعہ ہے لیکن اختلاط کی صورت نے نیا نقشہ بنا دیا ہے جس کے بعض جزو عقلِ انسانی کے خلاف ہیں۔ لیکن چوں کہ قوتِ ممیزہ کام نہیں کر رہی ہے اور مدرکہ بھی معطل ہے۔ اس لئے محالات کا استحالہ ظاہر نہیں ہوتا۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عالمِ خواب میں وہ نقشہ نظر آتا ہے جو بالکل نیا ہوتا ہے اور انسان یہ سمجھتا ہے میں نے کبھی ایسی شکل دیکھی نہیں، حالانکہ وہ کسی ایسی حالت میں دیکھ چکا ہے کہ جس وقت اس نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ کی تھی۔ اور اس کی وجہ سے وہ یاد نہ آسکا اور نہ اس کا اعادہ ممکن تھا، جیسے ہم کبھی کسی بڑے شہر کی سیر کرتے ہیں۔ بازار میں مختلف سائن بورڈ نظر آتے ہیں۔ ہم بغیر کسی توجہ کے اس کو محض سرسری نگاہ سے دیکھتے ہوئے گذر جاتے۔ اور کبھی خواب میں دیکھتے ہیں۔ کیونکہ متخیلہ کے فلم پر ہر اس چیز کی تصویر آجاتی ہے جو نظر کے سامنے گذرتی ہے اب دیکھنے والا جب یہ خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ بھٹاچاریا اینڈ کو کے سامنے کھڑا ہو کر کوئی دوا مانگ رہا ہے۔ تو اس کو تعجب ہوتا ہے کہ بھٹاچاریا اینڈ کو کا نقشہ اس کے ذہن میں کیوں کر آ گیا۔ حالانکہ یہ اس کے متخیلہ کا محفوظ سرمایہ تھا۔ اس طرح خواب میں انسان اکثر بھولی بھالی باتیں دیکھ لیتا ہے۔ جس کا بے داری میں یاد کرنا محال ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ بے داری کے تصور کے لئے رابطہ اور تسلسل لازم ہے۔ برخلاف اس کے خواب میں اکثر بے ربط اور غیر مسلسل نقشے نظر آتے ہیں۔

کبھی خواب میں انسان ایسے نقشے دیکھتا ہے۔ جو عقلاً محال ہوتے ہیں۔ جیسے ایک شخص اپنے کو ہوا میں پرواز کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور کبھی عالمِ خواب میں اس کو اس امر پہ استعجاب نہیں ہوتا۔ کبھی کوئی ایسی مخلوق نظر آتی ہے۔ جس کا وجود خارج میں محال ہے۔ ایک شخص نے یہ

دیکھا کہ ایک شیر دوڑا ہوا اس کی طرف آرہا ہے۔ اور اس کے منہ سے کثرت سے دھواں نکل رہا ہے جس سے فضا تاریک ہوتی جاتی ہے۔ اگرچہ عقلاً یہ شکل محال ہے۔ لیکن عالمِ خواب کے لئے بہت ممکن ہے۔ اس میں کوئی استعجاب نہیں۔ کیونکہ تصوراتِ ذہنی میں شیر کے نقشے موجود ہیں۔ کسی نے بالمشاہدہ شیر دیکھا ہے۔ کسی نے شیر کی تصویریں دیکھی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ریلوے انجن سے دھواں نکلتے ہوئے بھی بارہا دیکھا ہے۔ اس کا نقشہ ذہن میں موجود ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انجن کی ساخت عالمِ خواب میں شیر کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ عقلی مناسبت اور مطابقت شیر اور انجن کی بعید از قیاس نہیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان کے سامنے چلتی ہوئی انجن کا آجانا اس کی زندگی کے لئے ویسا ہی خطرناک ہے۔ جیسا کہ ایک شیر کا پہنچنا۔ اس لئے شیر کی جگہ پر انجن اور انجن کی جگہ پر شیر ذہنی اہمیت کے لحاظ سے بعید نہیں۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ جب کہ قوتِ ممیزہ نے اپنا کام چھوڑ دیا ہو۔

خواب میں ہمیشہ یہ نہیں ہوتا کہ کسی چیز کی اصلی شکل ہو بہو ظاہر ہو۔ بلکہ اکثر مثالی شکلیں نظر آتی ہیں۔ بالخصوص غیر مادی چیزوں کا اکثر انکشاف مادی شکلوں میں ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں توجیہہ بیان کروں۔ اس بات کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ خیالی دنیا میں مادی اور غیر مادی چیزیں ایک ہی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ مادی چیز کا نقشہ یا تصویر مادیت سے خالی ہوتی ہے۔ اس کو یوں سمجھیں کہ شیر کی تصویر کسی جسامت اور اس کے لوازماتِ خارجی سے ہمیشہ پاک ہوتی ہے ہر تصویر کی اہمیت عالمِ خیال میں اس کے حسن و قبح، اس کے نفع و نقصان کی صلاحیت کے اعتبار سے ہوتی ہے جب کسی فنا کرنے والی چیز کا خیال آتا ہے تو آگ، پانی اور ہوا کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اور کبھی بعض ان اسلحہ یا ادویہ کا تصور آجاتا ہے۔ جو انسانی ہستی کے فنا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ آگ کا تصور اس لئے آتا ہے کہ اکثر چیزیں جل کر فنا ہو جاتی ہیں۔ بعض چیزیں گھل مل کر فنا ہوتی ہیں اس لئے پانی کا تصور ذہن میں آتا ہے اور بعض بخارات ہوا میں مل کر فنا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہوا کا خیال آتا ہے۔

یہ نہیں ہوتا کہ ہمیشہ ایک چیز کا نقشہ ایک ہی جذبہ یا ایک ہی اثر ظاہر کرنے کو پیش ہو۔ کیونکہ

ہر شے کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ اس لئے مختلف چیزیں مختلف اوقات میں معنی ظاہر کرنے کو تصور میں یا خواب میں آتی ہیں۔ ایک آگ ہے کہ کبھی اس سے کسی چیز کے فنا کرنے کا اثر ظاہر ہوتا ہے کبھی اس سے روشنی کا کام لیا جاتا ہے۔ کبھی کسی چیز کے گلانے اور پکانے کا کام لیا جاتا ہے کبھی اس سے کسی چیز کا تصفیہ ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی عالم خواب میں فنا اور نیستی کا نقشہ آگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی اس سے حسد اور عداوت ظاہر ہوتی ہے۔ کبھی روشن خیالی اور نور ایسے خواب کی تعبیر ہوتی ہے۔ کبھی محنت اور سرگرمی مراد ہوتی ہے۔ کبھی صلح، استغفار اور مغفرت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ تعبیر خواب ایک اہم فن ہے۔ جس کے حصول کے لئے نہ صرف علم نفسیات کا ماہر ہونا ہی ضروری ہے بلکہ طبیعات سے بھی واقفیت حاصل کرنا لازمی ہے۔ ایک شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کے گھر میں آگ لگی ہوئی ہے اور گھر والے سب کے سب اس سے گھر گئے ہیں۔ اور اس حالت میں اس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کی تعبیر بیان کرنے سے پہلے آپ کو اس سے چند باتیں دریافت کر لینی ضروری ہیں۔

(۱) اس منظر سے اس کے دل پر کیا اثر پڑا۔

(۲) خواب کے قبل اس کے دماغ میں کیا تخیلات تھے۔

(۳) خانہ جنگی کا کوئی اثر ہے یا نہیں۔

(۴) آپس میں صلح و آشتی کا کوئی نیا ذریعہ قائم ہونے والا ہے یا نہیں۔

(۵) کسی نئے مفید یا غیر مفید مسئلہ پر مشورہ درپیش ہے یا نہیں۔

(۶) کوئی کسی شادی یا غمی کی خبر قبل سے معلوم ہے یا نہیں۔

(۷) کسی خاص عقیدے مذہب کی بحث چھڑی ہے یا نہیں۔

ازیں قبیل مختلف سوالات کی ضرورت ہے۔ ان سوالات سے ماحول کا پتہ چل جائے گا اور ماحول کا پتہ چل جانے کے بعد اسی کی مناسبت سے تعبیر بیان کرنا مناسب ہوگا۔ کیوں کہ ذہن ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر کوئی خاص نقشہ قایم کرتا ہے۔ جو حالتِ خواب میں ظاہر ہو جاتا ہے بعض خواب جسمانی عوارض کی وجہ سے کسی خاص شکل میں ظاہر ہوتے ہیں ایک وہ شخص جس

کے دماغ میں سوداوی مادے زیادہ موجود ہوں وہ اکثر خواب میں تاریکی دیکھتا ہے۔ اور مختلف قسم کے ہولناک مناظر اس کی نظر کے سامنے آتے ہیں۔ ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ جب وہ سوتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک شخص آگ روشن کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو اس آگ میں ڈالے اور وہ ڈر کر بھاگتا ہے۔ میں نے بتا دیا کہ اس کے مزاج میں صفرا کا مادہ بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے خون میں احتراق پیدا ہو رہا ہے۔ اور سوداویت بھی بڑھی ہے۔ چنانچہ تنقیہ ہوا اور وہ چین کی نیند سونے لگا۔ میری یہ تعبیر اس اصول پر مبنی تھی کہ احتراق کا تعلق مزاج میں صفرا سے ہے اور آگ کی سرخی خون پر دلالت کرتی ہے۔ اور دوسری طرف دھوئیں وغیرہ سے سوداویت ظاہر ہوتی ہے

امراضِ جسمانی کے علاوہ اخلاقی حسن و قبح بھی خوابوں سے ظاہر ہوتا ہے اور بعض اوقات کسی شخص کی سیرت کا اندازہ لگانے کا سب سے بہتر ذریعہ خواب ہوتا ہے بعض ایسے جذبات کا انکشاف خوابوں کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے۔ جس سے صاحبِ خواب خود غافل ہوتا ہے۔ ہر خاص و عام کے لئے یہ سمجھنا دشوار ہے کہ انسان کیوں کر خود اپنے جذبات سے غافل ہو سکتا ہے۔ یہ فلسفۂ نفسیات کا نہایت دلچسپ نظریہ ہے اور اس سے بہت مفید نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس کا دارومدار اس کلیہ پر ہے۔ کہ قوتِ مُدرکہ کی دو قسمیں ہیں، مُدرکۂ ظاہرہ اور مُدرکۂ باطنہ لیکن زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ مُدرکۂ ظاہری کے ذریعہ سے صورتِ خیالی قائم ہوتی ہے اور کبھی کبھی مُدرکۂ باطنی سے بھی صورتِ خیالی پیدا ہوتی ہے اور اسی مُدرکۂ باطنی پر نتائجِ خواب کا مدار ہے۔ مُدرکۂ ظاہری کا تعلق حواسِ خمسہ ظاہرہ سے ہے اور مُدرکۂ باطنہ کا حواسِ باطنہ سے۔ منافع الاعضائ کے سارے افعال مدرکہ باطنہ کے تحت انجام پاتے ہیں۔ جس طرح ایک انسان اس امر سے واقف نہیں ہوتا کہ کون سا غیر فطری مادہ کس عضو میں جمع ہو رہا ہے جو کسی وقت عارضۂ جسمانی کا سبب ہو جائے گا۔ جب عارضہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے عضوِ بدنی پر نقصان ظاہر ہوتا ہے۔ تب کہیں اس کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح بعض کیفیت دماغ یا قلب جس کا تعلق الخفیں مدرکۂ باطنہ سے ہے۔ اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک اس کا اثر حواسِ ظاہرہ پر نہیں پڑتا۔ کبھی کبھی کوئی عداوت یا محبت طبیعتِ انسانی کی باطنی فضا

میں موجود ہوتی ہے لیکن انسان کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ ایسے ایسے جذبات اکثر خواب سے ظاہر ہو جاتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے جذبات کو دباتا ہے اور اپنے عمل کے زور سے اس کو دور کر دیتا ہے اس کا تصورِ ذہنی اس سے بے خبر ہو جاتا ہے لیکن طبیعتِ باطنی اس سے آشنا رہتی ہے، ایک پرہیزگار شخص خواب دیکھتا ہے کہ اس کے سامنے شراب لائی گئی وہ پیالہ ہاتھ میں لیتا ہے اور جھجکتا ہے اور آخر کار کچھ سوچ کر ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے اور شراب نوشی کے ارتکاب سے باز رہتا ہے اس خواب سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ شراب نوشی کے ارتکاب سے بچا لیکن اس کا ضمیر اس خیال سے خالی نہیں ہے اس طرح رنج وغم، راحت ومسرت عداوت ومحبت جو اس کے اندر پوشیدہ ہے کبھی کبھی خواب سے ظاہر ہو جاتی ہے اس لئے دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ خواب ہر خاص وعام پر ظاہر نہ کیا جائے کیوں کہ اس بات کا ڈر ہے کہ وہ جذباتِ قلبی جس سے وہ خود غافل ہے دوسروں پر ظاہر ہو جائیں یہی سبب ہے کہ بزرگان نے عوام کے سامنے خواب بیان کرنے سے منع کیا ہے۔

خواب میں جذبات اپنی اصلی حالت میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی ان کا عکسِ نقیض نظر آتا ہے اگر زید خواب دیکھے کہ وہ بکر کا جانی دشمن ہے اور اس کے قتل کی سازش کر رہا ہے تو اس سے سمجھنا لازم نہیں کہ زید کے دل میں بکر کی عداوت کا جذبہ پوشیدہ ہے کیوں کہ بہت ممکن ہے کہ اس کی انتہائی محبت کا عکس نقیض اس شکل میں ظاہر ہوا ہو تصورِ ذہنیہ میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نقش خیالی بالکل اُلٹ جاتا ہے جس کی وجہ سے دشمنی محبت کی صورت میں اور محبت دشمنی کی صورت میں نظر آتی ہے اگر کوئی یہ کہے کہ یہ عقلاً کیوں کر ممکن ہے کہ ایک چیز عالمِ خیال میں اپنے ضد کی شکل اختیار کر لے اس معمہ کو آپ یوں سمجھیں کہ (الاشیاء تعرف باضدادہا) کوئی شے ذہنی اس وقت تک متشخص نہیں ہوتی جب تک اس کے اضداد کا تخیل کسی نہ کسی صورت میں موجود نہ ہو محبت کی سب سے آسان تعریف یہ ہے کہ وہ عداوت کا ضد ہے جب تک تاریکی کا تخیل موجود نہ ہو روشنی کا تصور عقلی محال ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ خواب میں قوتِ ممیزہ معطل ہو جاتی ہے۔ اسی لئے دماغ اپنی مشغولیت کی غرض سے ہر صورتِ خیالی کو اُلٹ پھیر کر دیکھنے لگتا ہے یہی سبب ہے کہ جب ایک نقشہ سیدھا

نظر آتا ہے تو کبھی کبھی اس کا الٹا نقشہ ظاہر ہو جانا بہت ممکن ہے ہر چیز کو اپنی اصلی حالت پر قایم رکھنا قوتِ ممیزہ ہی کا کام ہے اس کے بغیر ہر طرح کی گڑبڑی پیدا ہو جانا ممکن ہے۔

سب سے زیادہ تعجب خیز کیفیت خواب کی یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی ایک شخص وہ جذبات خواب میں دیکھتا ہے جو کسی دوسرے شخص کے دل میں ہوتے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ زید خواب دیکھ لیتا ہے کہ بکر اس کے قتل کی سازش کر رہا ہے۔ اس کی تعبیر کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ بکر کے دل میں زید کی عداوت پوشیدہ ہے کبھی اس کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ بکر زید سے غایت محبت رکھتا ہے کیوں کہ میں کہہ چکا ہوں کہ بعض اوقات خواب میں عکس نقیض بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ایک شخص کا جذبہ جو کبھی دل و دماغ میں پوشیدہ ہے۔ وہ دوسروں پر کیوں کر ظاہر ہو جاتا ہے یہ نظریہ ماہرانِ فلسفۂ نفسیات کے نزدیک مسلم ہے کہ ایک شخص کے خیالات دوسرے پر منعکس ہوتے ہیں اور یہ طاقت فطری ہے، اس کا استدلال تجربات سے ہوتا ہے۔ کتبِ نفسیات میں ایسے تجربات بے شمار مندرج ہیں جن سے انعکاسِ خیال ثابت ہوتا ہے۔ آپ جب چاہیں آزما کر دیکھ لیں کہ کوئی ہوشیار سے ہوشیار کینہ کش جب کبھی اپنے دلی کینہ کو چھپا کر خلوص و محبت کا اظہار کرنے لگتا ہے تو ایک معمولی سمجھ والا انسان اگر پوری طرح متیقن نہیں ہوتا کہ کینہ اور عداوت کے جذبات چھپائے جا رہے ہیں۔ تو کم از کم مشکوک ضرور ہو جاتا ہے۔ اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس کے دل میں آپ کی طرف سے خلوص ہے۔ آپ کا دل خود بخود اس کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی آپ خود اس میلانِ طبع سے متعجب ہو جاتے ہیں، بارہا تو یہ ہو چکا ہے کہ جب کوئی خطرہ آنے والا ہوتا ہے تو خود بخود دل میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ انہی واقعات پر انعکاسِ خیالی مبنی ہے۔

ہم کبھی خواب میں پیش آنے والے واقعات دیکھ لیتے ہیں۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ جن آنے والے واقعات سے ذہن بالکل خالی ہے۔ ان کے متعلق انسان کوئی خواب دیکھ سکے ان کے سامنے جب کبھی ایسا خواب پیش کیا جاتا ہے کہ جس سے کسی واقعہ کی واقفیت پہلے سے خواب دیکھنے والے کے علم یا خیال میں موجود نہیں تو وہ اس کا تجسس کرتے ہیں کہ کسی عنوان

سے اس واقعہ کا علم یا اس کے لواحق کا علم ہو، صراحتاً یا کنایتہً یا ضمناً کسی طرح اس کے علم کا ذہن پر اثر پڑ چکا ہے کیوں کہ وہ خیال کو محض ایک آئینہ سمجھتے ہیں جس پر وہی چیز منقش ہوتی ہے جو اس کے سامنے ہو یا فوٹو کا کیمرہ جس میں وہی تصویریں اترتی ہیں جو سامنے گذرتی ہیں اور ان کے نزدیک ادراک کا ذریعہ محض حواسِ خمسہ ظاہری ہیں۔ لیکن میرے نزدیک سب سے بڑا ذریعہ ادراک کا وہ چیز ہے جس پر حواس خمسہ کا وجود منحصر ہے یعنی روح جب روح جسم سے علیحدہ ہو جاتی ہے تو حواس خمسہ کا وجود باقی نہیں رہتا وجودِ انسانی کی ساری طاقتیں فیضانِ روحانیہ کا نتیجہ ہیں۔ اور یہ امر مسلم ہے کہ روح حواسِ خمسہ کی محتاج نہیں بلکہ حواس خمسہ اپنے قوتِ ادراکیہ روح سے حاصل کرتا ہے۔ روح میں بغیر جسم کے بھی ساری صلاحیتیں موجود رہتی ہیں۔ ہمارے اس نظریہ کا دار مدار اُن انکشافات روحانیہ پر ہے جو آج یورپ و امریکہ سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ اور تمام مذاہب عالم اور حکمائے سلف قوت روحانیہ کو مانتے آئے ہیں۔ ہم آئے دن تجربہ کرتے رہتے ہیں کہ جب کسی عارضی طریقہ پر بھی حواس خمسہ کو سُست کر دیا جاتا ہے۔ طاقت روحانی بڑھ جاتی ہے اور ایک زندہ شخص کی روح عالم ارواح سے تعلق پیدا کر لیتی ہے آج اسی طریقہ سے (HYPNOTISM) مراسلاتِ روحانیہ جاری ہیں۔ میں اس بحث پر اپنے مضمون "روحانی دنیا" میں ایک حد تک روشنی ڈال چکا ہوں اور ابھی ضرورت ہے کہ موقع پا کر اس کی اور وضاحت کی جائے اس وقت ہمیں اتنا بتا دینا ہے کہ جب حالت خواب میں انسان کے حواس خمسہ معطل ہو جاتے ہیں اور انہماکِ عقلی سے روح کو فرصت ملتی ہے تو روح عالمِ ارواح میں سیر کرنے لگتی ہے اس اثنائے سیر میں بعض پیش آنے والے واقعات منکشف ہو جاتے ہیں۔

یہ مسئلہ عوام کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ ہونے والے واقعات کا انکشاف عالم ارواح میں کیوں کر ممکن ہے یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ روح عالم خواب میں ارواح کی سیر کرتی ہے تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ہونے والے واقعات کا پتہ عالمِ ارواح میں مل جائے۔ حضرت محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب فتوحات مکیہ میں عالم مثال اور عالمِ ارواح کی بحث میں ہونے والے واقعات کا

ممثل ہونا صراحت سے تحریر فرمایا ہے۔ علاوہ اس کے اور بزرگان نے بھی ارواح کی پیشینگوئیوں کے واقعات تحریر فرمائے ہیں لیکن اس دورِ مغرب زدگی میں جب تک مغربی محققین کا حوالہ نہ دیا جائے کوئی بات قابل قبول نہیں ہوتی۔ اس لئے میں سر اولیور سلوج کی کتاب روحانی دنیا کے حوالہ سے ریمنڈ کا یہ بیان پیش کر دینا چاہتا ہوں کہ دنیا میں جب کوئی حادثہ وقوع پذیر ہونے لگتا ہے تو کچھ روز قبل اس کا عکس ایک روشن ستون کی صورت میں اس عالم سے اس عالم تک پہنچتا ہے جس سے سمجھ لیتے ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے۔ یہ بیان اس سلسلہ کے سوال و جواب میں ہے کہ ریمنڈ نے اولیور لوج کو کہہ کر قبل سے متنبہ کر دیا تھا کہ اس پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ جب ایک درخت سے ٹکر لگنے کا حادثہ وقوع پذیر ہوا تب اولیور لوج نے ریمنڈ سے روحانی مراسلات کے سلسلہ میں دریافت کیا کہ اس واقع کی خبر اس کو قبل از وقت کیوں کر ہوئی۔ کتاب مذکور میں متعدد پیشینگوئیاں درج ہیں جو روحانی مراسلات سے ظاہر ہوئیں۔ اور ان کی صداقت کا تجربہ ہوا ایسے خواب کا تعلق روحانیات سے ہے انھیں روحانی کہتے ہیں ان میں پیشینگوئیاں ہوتی ہیں۔ اور کبھی کبھی ہونے والے واقعات منکشف ہو جاتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ روحانی خواب کا تعلق ہمیشہ عالمِ ارواح سے ہو بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خواب میں ایک شخص ایسے مقام کی سیر کر لیتا ہے جس کو اس نے بیداری میں کبھی نہیں دیکھا۔ کبھی گم شدہ اشیاء کا پتہ چلا لیتا ہے۔ اور جب بیدار ہو کر تلاش کرتا ہے تو وہیں پاتا ہے۔ جہاں خواب میں دیکھتا ہے۔ یوں تو سینکڑوں خواب تشریح تصدیق کے ساتھ ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ لیکن اس مضمون میں درج کرنے کی گنجائش نہیں محض ایک مختصر خواب جس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے پیش کرتا ہوں۔ ایک طلائی زیور ایک مختار صاحب کے یہاں گم ہو گیا۔ مولوی عبداللطیف صاحب مرحوم کو خبر ہوئی۔ دوسرے دن خواب سے بیدار ہو کر آپ نے کمرہ کی چوکی کو ہٹانے کا حکم دیا۔ جب چوکی ہٹائی گئی دیوار میں ایک سوراخ نظر آیا۔ مولوی صاحب موصوف نے اس سوراخ کو کھدوایا۔ کچھ دور پر وہ گم شدہ زیور ملا۔ مولوی موصوف نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ یہ زیور اس سوراخ کے اندر ہے اور

جب تک نہ ملا تھا شبہ تھا کہ شاید یہ خواب غلط ہوگا۔ الحمدللہ کہ مل گیا۔ اور سب لوگوں کو خواب کی صداقت کا اعتراف ہوا۔ اس مضمون میں گنجایش نہیں کہ ایسے اور خواب پیش کروں۔ بعض ایسے واقعات خواب میں دیکھے گئے جن کا تصور عقل سے بعید تھا۔ گذشتہ زلزلہ بہار کے واقع ہونے کے چند روز قبل ایک محترم خاتون نے وہ واقعات مکانات کے گرنے لوگوں کے بھاگنے اور چیخنے کے دیکھے۔ اور دیکھ کر اپنے شوہر سے بیان کیا۔ لیکن ہر شخص نے اس کو اضغاثِ احلام تصور کیا۔ لیکن بعد کو اس کی تصدیق ہوگئی۔

وہ پیشینگوئیاں جو خدا کی طرف سے اولیار اور انبیار کو ہوتی ہیں۔ اس کا تعلق محض فیضانِ عالمِ قدسی سے ہے۔ جب باری تعالیٰ اپنے نبی یا ولی کو کسی واقع سے متنبہ کرنا یا کوئی مژدہ سنانا چاہتا ہے تو خواب میں اس کے سامنے وہ امر پیش کر دیتا ہے ایسے خواب کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دنیا میں ہمارے بعد وحی تو نہیں خواب ہوا کریں گے اس کی کیفیت اور نوعیت کے متعلق نہ کوئی نظریہ قایم کیا جاسکتا ہے نہ توجیہہ بیان کی جاسکتی ہے میں ایسے روحانی خواب کے متعلق ایک الگ رسالہ PROPHETIC DREAM لکھ چکا ہوں۔

تاریخی حقائق

از

(جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی)

دارالعلوم معینیہ ساسخر ضلع مونگیر

علی گڈھ میگزین نے اس سال علی گڈھ نمبر نکالا، سنا تو مجھے بھی پڑھنے کا شوق ہوا، حسن اتفاق سے مرے اس شوق کی خبر "ہمارے اردو رکھتے ہوئے دوست" سید علی امام صاحب (علیگ) کو ہو گئی، دوسالہ خفگی اور ترکِ تعلقات کے عزم محکم کے باوجود انھوں نے لطف وکرم ہی سے کام لیا، اور "علی گڈھ نمبر" مرے پاس پہنچ گیا۔ ———— میں نے اسے پڑھا، پڑھتے وقت کچھ خاص واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا، ان پر نشان ڈالتا گیا، آج انھی میں سے چند واقعات مندرجہ بالا عنوان سے حاضر خدمت ہیں اگر ان تاریخی حقایق سے کسی صاحب کو کوئی فائدہ پہنچے تو وہ سید صاحب کا شکریہ ادا کریں۔ (ظفیر صدیقی)

سرسید احمد خاں بانی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کو علمی دنیا میں جو شہرت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، ان کے مذہبی خیالات سے متعلق لوگوں میں بلاشبہ مختلف رائیں ہیں مگر جہاں تک اپنی معلومات کا تعلق ہے ان کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ ان کے اخلاص وللٰہیت کے باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں

مولانا حالی مرحوم لکھتے ہیں

"جب سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچی، جس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس نے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگا نہیں رکھا، اس وقت جو حال سرسید

کی بے چینی اور جوش و خروش کا تعادہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔"[1]

اللہ اللہ یہ حال ہے اس مسلمان کا جس کو کہا جاتا ہے کہ بعض مصالح کی بنیاد پر انگریزی حکومت اور خود انگریزوں سے بڑا خاصا تعلق تھا تعلقات اپنی جگہ تھے، مگر دین کے معاملہ میں دیکھ رہے ہیں کتنے بے چین ہیں اور کیسا ان میں جوش و خروش ہے آج ان کا نام لینے والے ہر معاملہ میں ان کا بار بار حوالہ دیں گے، مگر جہاں دین کی بات ہو، وہاں ان کا سارا حسنِ ظن رکھا کا رکھا ہی رہ جاتا ہے۔ اور ان میں کوئی بے چینی پیدا نہیں ہوتی ـــــــ مولانا حالی مرحوم ہی کا بیان ہے

"وہ (سر سید) جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے، اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے، اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں"[2]

اس کو بار بار پڑھئے اور سوچئے، سر سید مرحوم میں کتنی اور کیسی غیرت و حمیتِ دینی پائی جاتی تھی مگر آہ ان کے نام لیواؤں میں اب یہ غیرت و حمیت دینی کہاں نظر آتی ہے؟ جو دو چار ہیں اُن کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، بلکہ اب تو خود اسی یونیورسٹی کے فرزندانِ ارجمند اپنی اسی یونیورسٹی میں بیٹھ بیٹھ کر سر ولیم سے زیادہ سخت حملے کرتے رہتے ہیں، اور ان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ تیر کس کا دل زخمی کر رہا ہے، اور کس کے کلیجہ کو چھید رہا ہے۔

سر سید مرحوم اپنے ایک خط میں اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں

"ان دنوں ذرا میرے دل کو سوزش ہے ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت صلعم کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا، اور ان کی نا انصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔"[3]

یہ اس شخص کی گواہی ہے جو جدید تعلیم یافتوں کا امام ہے، کیا اس کے بعد بھی یقین نہ ہوگا کہ عیسائیوں نے مذہب اور دین کی باتوں کے بیان کرنے میں بڑی نا انصافیاں کی ہیں، بے جا تعصب سے کام لیا ہے، جن جدید تعلیم یافتوں کے دینی معلومات کا بیشتر ذخیرہ انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، ان کو سوچنا چاہیئے، کہ ان کے "دینی معلومات" کی حیثیت پھر کیا رہ جاتی ہے؟

---

[1] علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر ص۵۵ [2] ایضاً [3] علی گڑھ نمبر ص۹۹

ولیم میور وغیرہ نے کتنی گندگی اُچھالی ہوگی، کہ سرسید مرحوم کے قلم سے یہ جملے ٹپک پڑے۔

"مصمم ارادہ کرلیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے، اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مرگیا حاضر کرو ع

"مارا ہمیں تمغۂ شہنشاہی بس است"[1]

اللہ اللہ یہ ہے محبتِ رسول، اور حمیت دین کا جذبہ، کہاں ہیں وہ لوگ۔ جو سرسید کا نام لے کر اپنی بڑائی جتاتے ہیں اور ان کی غیرت وحمیت جواب دے گئی ہے، وہ ہر جائز ناجائز شعبہ میں تو خرچ کر سکتے ہیں، مگر دین کی عزت وعظمت کی خاطر ایک پیسہ خرچ کرنا جرم سمجھتے ہیں، حد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں زبان کھولنے کی بھی ان کو جرأت نہیں ہوتی، دماغی عیاشی کے لئے سیکڑوں ناول اور ڈرامے لکھ سکتے ہیں مگر دین کی عظمت اور اس کی سربلندی کے لئے ایک جملہ لکھنے میں بھی شرم محسوس کرتے ہیں، اور سوچتے ہیں اس کا کیا معاوضہ ملے گا۔

سرسید مرحوم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے گئے اعتراض کا صرف جواب ہی نہیں لکھا، بلکہ اس کے چھپوانے کی صورت بھی خود ہی سوچی، اور کتابت وطباعت کے اخراجات کی خود ہی فکر کی، اس سلسلہ میں سید مرحوم لکھتے ہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ اس خط کے پہنچنے کے بعد میر ظہور حسین کے پاس جائیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دونوں صاحب مل کر کسی مہاجن سے ہزار روپیہ قرض لیجئے، سود اور روپیہ میں ادا کر دوں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے اور میں نے لکھا ہے کہ کتابیں اور مرا اسباب یہاں تک کہ مرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو"[2]

اس وقت سود کی لین دین کی بحث چھوڑیئے۔ اور ایمانداری سے سید مرحوم کے بے پناہ ایمانی جذبہ اور دینی غیرت وحمیت کا اندازہ لگایئے، اور دیکھئے ان کے جوش وخروش کا کیا عالم ہے

---

[1] علی گڈھ نمبر ص۹۹ [2] ایضاً ص۱۰۰

اور وہ کس قدر بے چین ہیں، اور لندن میں بیٹھ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا کیسا حق ادا کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں نہ انگریزوں کے علوم وفنون سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ حکومتِ وقت سے خوف زدہ۔

آہ جس یونیورسٹی کے بانی کے ایمان وعمل کا یہ حال ہے، آج اس ادارہ کے فیض یافتوں کی ذہنی حالت قابلِ صد افسوس ہے، دنیاوی لحاظ سے بلاشبہ یہ بہت اونچے، بلند خیال، بلند اقبال اور ہر طرح قابلِ مدح وستائش ہیں، مگر جہاں تک دینی غیرت وحمیت اور ایمان وعمل کا تعلق ہے، اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ بجز چند افراد بانیِ ادارہ کے ساتھ ان کو کوئی خاص گرویدگی نہیں، کاش لوگ سوچتے کہ بانیِ ادارہ کا مقصد جہاں دنیا کے اونچے عہدے حاصل کرنا تھا، وہاں یہ بھی مقصد تھا کہ مسلمان ان اونچے عہدوں پر رہ کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی خدمت انجام دیں، اور اس دین پر جہاں سے زد پڑ رہی ہو۔ اس کا دروازہ بند کرنے کی سعی کریں۔

سرسید مرحوم میں جس طرح دینی غیرت تھی، اسی طرح آپ کو مسلمان اور مسلمانی تاریخ سے محبت تھی، چنانچہ کوئی مؤلف و مصنف اگر اپنی کتابوں میں مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرتا اور آپ کو معلوم ہو جاتا تو برداشت نہیں کرتے تھے اس سلسلہ میں آپ نے ایک مرتبہ محسن الملک کو لکھا۔

"انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی بُرائی نہیں ہے، جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو"[1]

کہاں ہیں انگریز مصنفوں کے کلمہ گو! آنکھیں کھول کر دیکھیں سید مرحوم جیسے رواداراور انگریز دوست کا کیا خیال ہے یہ کوئی دیوبندی مولوی کا بیان نہیں، بلکہ مسلم یونیورسٹی کے بانی کی تحریر ہے، علیگ بھائی بھی اسے غور سے پڑھیں، جو انگریز مصنفوں کی تاریخوں پر بغیر کافی تحقیق یقین کرلیتے ہیں، اور بے چارے مسلمان محقق مصنفوں کو اپنے خیال میں کوئی وقعت نہیں دیتے، اور حد یہ ہے کہ فارسی، عربی اور اردو صحیح تاریخوں کا پڑھنا ان کو بار گذرتا ہے۔

---

[1] علی گڈھ میگزین علی گڈھ نمبر ص۱۰۳

انگریز مصنفوں کی بے ایمانی کا راز فاش کرنے کے بعد سر سید مرحوم آگے رقمطراز ہیں

"ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں، جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات از راہ ناانصافی اور تعصب مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے، اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں"[1]

جس خطرہ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، افسوس آج تک اس خطرہ کا تشفی بخش انسداد نہ ہو سکا سر سید مرحوم نے جس زہر سے مسلمان بچوں کو بچانا چاہا تھا، بعد میں چل کر اس کے ماننے والوں کو اس کا صحیح احساس باقی نہ رہا۔

علیگ برادری نے جتنا دھیان ناول اور افسانے پر دیا، کاش یہ اس کا کوئی ادنیٰ حصہ تاریخ پر صرف کرتے، تو آج اردو میں صحیح تاریخوں کا بڑا ذخیرہ ہوتا، گو اب بھی اردو میں صحیح تاریخوں کی کمی نہیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے نظام حیدر آباد کو، جس کی علم دوستی کی بدولت بہت سی عربی تاریخیں اردو میں منتقل ہو سکیں۔

لندن میں رہ کر سر سید مرحوم ایک ایک چیز کو عبرت و بصیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کی حالت پر آنسو بہاتے ہیں، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے، یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حمایت اور بے جا تعصب اور تنزلِ موجودہ اور ذلت آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے"[2]

جو اپنی قوم کو کہیں نہیں بھولتا، دوسروں کی ترقی دیکھ کر اپنی قوم کے تنزل پر آنسو بہاتا ہے، اور ان اسباب کو تلاش کرتا ہے جن کی وجہ سے قوم پامال ہو رہی ہے ——— دنیا سن کر سکتہ میں آجائے گی کہ آج ان کے نام لیواؤں کی بڑی جماعت بے حسی کی زندگی گذار رہی ہے، اور غفلت کی نیند سوتی ہے، آج اس جماعت کے پیش نظر صرف اپنا ذاتی فائدہ ہے اور بس،

یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سب کے سب ایسے ہی ہیں، بلکہ وہ باکمال اور حساس افراد بھی ہیں جو رات دن قوم کی خیر خواہی میں دل و جان سے منہمک ہیں۔

---

[1] علی گڈھ میگزین علی گڈھ نمبر صفحہ ۱۰۲ [2] ایضاً صفحہ ۱۰۳

سرسید مرحوم نے مسلمانوں کی اسی حالت کا ماتم کیا ہے

"افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ہے، ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں، اور زہر نگلتے ہیں، ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں، اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں"[1]

مگر آہ کس کو بتایا جائے کہ تم جہاں جا رہے ہو، وہاں کھرے سکے نہیں ملتے، کھرے سکوں کی تلاش ہو تو ہمت سے کام لو، مرعوب ہونا ترک کرو، بہادر اور نڈر بنو، اور اپنے ملک و قوم کی خیرخواہی میں لگ جاؤ، نتیجہ خدا کے ہاتھ ہے، تمہارا کام جد و جہد کرنا اور قوم کو راہِ راست دکھانا ہے، سرسید مرحوم نے ایک مرتبہ وقار الملک کو لکھا تھا۔

"میں قسمیہ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے مسلمانوں کی بہتری، ترقی اور درستی اخلاق کی جس پر میں کوشش کر رہا ہوں مطلق توقع نہیں ہے مایوسِ محض ہے مگر اس خیال سے کہ ہمارا فرض کوشش کئے جانا ہے کرتا ہوں بس جس چیز کے حصول سے مایوسی ہو، اس مایوسی کے سبب سے اپنا فرضِ کوشش ترک نہیں ہو سکتا"[2]

یہ ہے اپنے فرض کا احساس، آج جدید تعلیم یافتوں کو کون بتائے کہ آپ کی ذمہ داری بھی بڑی اہم ہے، مگر آپ کو احساس نہیں، آپ بس پڑھنا اور پھر کھانا کمانا ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں، یہ محض غلط ہے، صرف مولویوں کو ہر چیز کا ذمہ دار قرار دے کر مطعون کرنا یہ ذمہ داری کا احساس نہیں ہے، آزاد ہندوستان میں دینی جذبہ لے کر آگے بڑھنے اور قومی خدمت کی بڑی گنجائش ہے۔

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ سرسید عربی فارسی کے بالکل خلاف تھے وہ بالکل غلط ہے اسی طرح ہمارے علیگ بھائیوں میں جن کا یہ خیال ہے کہ عربی فارسی کی کوئی اہمیت ہی نہیں وہ بھی بھول میں ہیں سرسید مرحوم نے ایک بار عماد الملک کو لکھا تھا

"اسی کے ساتھ یہ تدبیر بھی چاہتا ہوں کہ علوم عربیہ اور درس کتب مذہبی جو معدوم ہوتا جاتا ہے، کسی طرح قایم رہے، اگر عربی فارسی ہم میں سے معدوم ہو جائے۔ تو اسی کے ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہو جائے گی"[3]

---

[1] علی گڈھ نمبر ص۱۰۲ [2] ایضاً [3] ایضاً

آہ اب یہ خیال کس کو ہے؟ کہ مذہبی تعلیم اور جس زبان میں اس کا ذخیرہ ہے اس کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے، اور اس سے غفلت موت کے مرادف ہے، آج عربی داں جب تک جدید تعلیم حاصل نہ کرے اور انگریزی داں جب تک علوم مشرقیہ اور دینی معلومات حاصل نہ کرے، اس کا علم ادھورا ہے، تنگ نظری دونوں ہی میں باقی رہ جاتی ہے، کاش لوگ غور کریں

سرسید مرحوم ایک زندہ دل اور با اخلاق انسان تھے، اور ان کا مطمح نظر، نیکی کرنا اور برائی دور کرنا تھا، خود فرماتے ہیں:۔

"ہم کو خدا نے دنیا میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں، برا کرنے والے کی برائی سے ہم کو کیا کام، ہم کو اپنا دل، اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیئے، بدوں یا بدطینتوں پر افسوس کرنا چاہیئے، مگر اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے کو بھی ویسا ہی کرنا ہے، جو لوگ برا کہنے والے ہیں، ان کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیئے، اگر وہ برائی ہم میں ہے، تو اس کے دور کرنے میں کوشش لازم ہے"[1]

یہ ہیں ہمارے گذرے ہوئے بزرگوں کے اخلاق و اعمال، برائی ان کے وہم میں بھی نہیں آتی تھی، بس نیکی ہی نیکی ان کے مدِ نظر رہتی، برائی کا جواب بھی نیکی ہی سے دیا کرتے تاکہ برائی دور ہو، اب یہ اخلاق و اعمال اور صبر و تحمل ہم لوگوں میں کہاں باقی رہا؟ جو لوگ آپ سے روحانی وابستگی رکھتے ہیں ان کو سوچنا چاہیئے، کہ ہمارے اخلاق و اعمال کیوں کر سدھر سکتے ہیں۔

بانیٔ علی گڈھ کا دل میل کچیل اور کینہ کپٹ سے پاک تھا، ایک دفعہ محسن الملک کو ان کے خط کے جواب میں لکھا:۔

"مولوی س۔خ کو اب بھی میں اپنے بھائی سے کم نہیں سمجھتا، مگر جو ملال کہ مرے دل میں ہوا، وہ اب تک کم نہیں ہوا، پھوٹ جاوے وہ آنکھ، جو کسی کو دیکھے اس نگاہ سے، جو اس کے دل میں نہیں ہے، گل جاوے وہ زبان، جو وہ کہے جو اس کے دل میں نہیں ہے، اور ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ، جو وہ لکھے جو اس کے دل میں نہیں ہے"[2]

---

[1] علی گڈھ نمبر ص۱۰۰ [2] ایضاً

دیکھ رہے ہیں منافقت سے بےزاری کا اعلان، اور اخلاصِ عمل کا اظہار، اب تو اس نیکی کو لوگ بے وقوفی کہتے ہیں، وہ بڑا گدھا سمجھا جاتا ہے جس کا عمل دل کے مطابق ہو، اب کمال یہ ہے کہ دل میں کٹاری ہو، اور زبان شیریں، دل میں بُرائی ہو، اور زبان پر تعریف، علیگ برادری اپنے بانی کی اس تحریر کو بار بار پڑھے اور سوچے کہ کیا ہمارا طرزِ عمل یہی ہے، جس کی بانیٔ یونیورسٹی تعلیم دے گئے ہیں۔

سر سید مرحوم کو اپنی قوم سے بڑی ہمدردی تھی، اور قوم و ملت کا غم اتنا غالب تھا کہ وہ اپنا سارا غم فراموش کر گئے تھے، ایک موقع سے انھوں نے ایک انگریز مسٹر شکسپیئر کی مدد کی تھی، اس مدد کے سلسلہ میں ان کو ایک جاگیر دینا چاہا، مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، خود لکھتے ہیں

"جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپے سے زیادہ کی مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا، تو مرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا، کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو، اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں میں نے اس کے لینے سے انکار کیا۔"[1]

اللہ اللہ یہ تھا دردِ دل قوم و ملت کے باب میں، ایک لاکھ کی جاگیر پر لات مار دی اور اپنی غیرت و حمیت کی لاج رکھ لی، سوچا جائے اب ایسے لوگ کہاں باقی رہے؟ اب تو لوگ کوشاں ہوتے ہیں کہ کسی کی گردن مروڑ کر ہم اس کی جائداد پر قابض ہو جائیں۔

کہاں ہیں وہ با اثر حضرات، جو رات دن دوسروں کے برباد کرنے کی فکر میں رہتے ہیں اور اپنی ادنیٰ کمائی کی بڑی قیمت مانگتے ہیں، چاہے دوسرے کے بال بچوں کی لاشوں کو روند کر ہی کیوں نہ حاصل ہو، اس واقعہ سے سبق حاصل کریں۔

۱۸۵۷ء میں بہت سے لوگ بددل ہو کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، حالات دیکھ کر سر سید مرحوم کو بھی پہلے خیال آیا یہی خیال آیا کہ ہندوستان چھوڑ دیں، مگر حالات کا جب انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ

---

[1] علی گڑھ نمبر ص ۱۶۱

کیا تو سمجھ میں آیا کہ میرا خیال غلط ہے، چنانچہ خود لکھتے ہیں:۔

"یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے، کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیئے اور جو مصیبت پڑی ہے، اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنا قومی فرض ہے، میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا"[1]

اسے کہتے ہیں اپنی قوم سے سچی ہمدردی، اپنا آرام دیکھ کر پوری قوم کو بھول جانا کسی قومی لیڈر کا کام نہیں ہو سکتا، کسی اور کا ہو تو ہو سکتا ہے، مگر آہ اسی بوڑھے سپاہی کی یونیورسٹی کے وہ بلند (اقبال) فرزندانِ ارجمند، جو کل تک ہندوستان میں تھے، مگر جوں ہی پاکستان میں ان کو اطمینان بخش جگہ ملی یہاں سے بھاگ گئے، یہ بھی نہ سوچا کہ اس یونیورسٹی کا کیا ہوگا، کل تک جن غریب عوام مسلمان کا نام لے کر ہم نے لیڈری اور برتری حاصل کی ہے، اس کا کیا حشر ہوگا، یہی نہیں بلکہ جب موقع آیا تو بے دردی سے مسلمانوں کو آگ و خون کی بارش میں ڈھکیل دیا، اور خود ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اڑ گئے، خدا جزائے خیر عطا کرے ان لیڈرانِ عظام اور علماء کرام کو، جنہوں نے جان کی بازی لگا کر اس دہکتے جہنم میں مسلمانوں کی جان بچائی، اور ساری مصیبتوں سے دوچار ہو کر اب تک یہاں ڈٹے ہیں، اور قوم و ملک کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مسٹر محمود جو سر سید کے فرزند ارجمند ہیں، بہت ذہین، حاضر الذہن اور دور اندیش تھے، چنانچہ جسٹس محمود کا فیصلہ مدلل و مکمل ہونے میں جو شہرت رکھتا ہے، وہ کسی باخبر سے پوشیدہ نہیں، ان کے متعلق بیان ہے کہ ان کے دل میں خدا کا خوف بہت تھا، ملازمت سے سبکدوش ہو کر جب پنشن پانے لگے، تو قرآنِ پاک اپنے خاص انداز میں پڑھتے اور روتے جاتے تھے، شیخ ممتاز حسین نے لکھا ہے

"گرمی کے موسم میں ایک صبح کو یہ دیکھا گیا کہ سکندر باغ (لکھنؤ) کے سبزہ زار پر پلتھی مار کر محمود صاحب بیٹھے زبانی کچھ پڑھ رہے ہیں، ان کے یہاں رہنے والے ایک صاحب سے یہ معلوم ہوا، کہ ان کو قرآن شریف

---

[1] علی گڈھ نمبر ص ۱۱

کا ایک پارہ زبانی یاد ہے، کچھ دنوں سے اکثر یہ صبح کو تنہائی میں رب العالمین کا دھیان دل میں رکھ کر اسے پڑھتے ہیں، اور اس کے بعد چند اشعار دنیا کی بے ثباتی کے جو انھیں یاد ہیں پڑھ کر رو دیتے ہیں ——

میں صبح کو ٹہلنے نکلا تھا دور سے میں نے خود یہ سماں ایک بار دیکھا کہ محمود صاحب آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں"[1]

یہ ایک انگریزی داں کا صحیح واقعہ ہے، جو اپنے علم و عقل، اور فہم و تدبر میں مسلم ہے، غور کیجئے اللہ کے بندہ پر اپنے آقا اور مالک کا کیسا خوف تھا، یہ کوئی ملا نہیں تھے، بلکہ لندن کے پڑھے ہوئے اور اپنے وقت میں بڑی شہرت و عزت کے مالک، آہ اب تو ہمارے انگریزی دانوں کو قرآن سے لگاؤ ہی نہیں باقی رہا، اب تو اکثریت انھی لوگوں کی ہے جنہوں نے کبھی قرآن پاک پڑھا ہی نہیں ہے، بس سنتے چلے آرہے ہیں، خشیت الٰہی دلوں میں اب کہاں پیدا ہوتی ؟ اب تو جو لوگ اپنے کو مہذب و متمدن کہتے ہیں، ان کی دنیا ہی اور ہے، بھوس بوڑھے ہونے پر بھی موت کی تیاری نہیں کرتے، کہ قیامت میں ذلت و رسوائی سے رستگاری ہو سکے، اس باب میں عالموں کا حال بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔

مولوی بشیر الدین (اٹاوہ) پہلے سر سید کے مخالفوں میں تھے، ان کا بیان ہے کہ "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے چوتھے اجتماع میں میں نے ایک تجویز پیش کی، اور اس پر ایک زور دار تقریر کی، تجویز یہ تھی کہ ڈیلی نورس کی "تاریخ ہندوستان" جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو مسخ کر کے اہانت آمیز انداز میں پیش کیا گیا ہے، نصاب سے حکومت خارج کر دے۔

مولوی بشیر الدین صاحب فرماتے ہیں کہ اس تجویز پر

"سر سید بولنے کھڑے ہوئے تو عالم ہی کچھ اور تھا، ایک ایک لفظ میں دینی حرارت سمائی ہوئی تھی، اور جوشِ اسلامی کا دریا تھا جو اُمنڈ رہا تھا، میں کچھ ہکا بکا سا رہ گیا . . . . . اور مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ یہ شخص ناموسِ اسلام کا سچا محافظ، دینِ رسالت مآب کا سچا پیرو، اور قوم کا سچا ہمدرد ہے"[2]

---

[1] علی گڈھ نمبر ص۲۲۵ [2] ایضاً ص۲۲۴

یہ ایک ناقد اور مخالف کی گواہی ہے، اس کے بعد سر سید کے اخلاص پر شبہ کرنا ظلم ہوگا، غور کیجئے اس مرد مسلمان کے دل میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی محبت تھی، اور آپ کی تعلیمات سے اس کو کتنا عشق تھا، آہ اب مہذب اور متمدن کہے جانے والوں میں دین کی یہ عظمت کہاں باقی رہی؟ اب تو کچھ لوگ آپ کے نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں لکھتے، "محمد صاحب" کہا کرتے ہیں، اور ان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم ادب کے طریقے کو چھوڑ کر گستاخی کر رہے ہیں، اور اگر کسی مصلحت وقت کی وجہ سے زبان پر دین کا نام آتا بھی ہے، تو دل پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔

مولوی بشیر صاحب ہی کا بیان ہے کہ سر سید کسی کو دبانا نہیں چاہتے تھے، ہر ایک کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع دیتے، اور پھر اپنا نقطۂ نظر بہت نرمی سے پیش کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"سر سید میں لاکھ روپیہ کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ہر نیاز مند کو کھل کر بات کرنے کا موقع دیتے تھے، .. .... جس مخالف کے متعلق ان کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ سچائی کے ساتھ ان کے مشن کی مخالفت کر رہا ہے اس کی مخالفت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور بڑے اہتمام سے تسکین بخش انداز میں اس کے اعتراضات کے جوابات دیتے تھے"[1]

اب یہ اندازِ فکر اور یہ اخلاق ہمارے مہذب دوستوں میں کہاں باقی رہا؟ اب تو کوئی اپنے نقطۂ نظر کے خلاف ایک بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں، چاہے کہنے والا کتنا ہی مخلص کیوں نہ ہو، پچھلے دنوں ہر شخص نے مشاہدہ کیا کہ یہ متمدن طبقہ اپنے مخالفوں کی بات سننے سے کتراتا تھا، اور موقع پاکر غنڈوں سے پٹوانے میں بھی ان کو عار نہ ہوتا تھا، بلکہ وہ سمجھتا تھا یہی اعمال و اخلاق کا قانون ہے کاش بانی علی گڈھ کی زندگی کے اس پہلو کو غور سے پڑھتے اور سبق حاصل کرتے۔

مولوی بشیر صاحب فرماتے ہیں

"ایک بار میں نے ان سے کہا کہ آپ نے مسلمانوں میں جدید تعلیم رائج کرنے کا جو کام شروع کیا ہے یہ تو بہت اچھا ہے یہ بتایئے کہ مذہبی معاملات کو کیوں چھیڑ دیا، ..... ہنسے اور فرمایا کہ بھائی اگر میں یہ سوال

---

[1] علی گڈھ نمبر ص۳۴۴

نہ چھیڑتا، تو مسلمان کبھی کالج کی طرف توجہ نہ کرتے"[1]

اس واقعہ سے کتنی سچائی ٹپکتی ہے، معلوم ہوتا ہے سرسید دل کے بہت صاف، اور دماغ کے سلجھے ہوئے آدمی تھے، جھوٹ اور فریب کو برا جانتے تھے، اب تو لوگ ایک غلط بات کے لئے سو جھوٹ بولتے ہیں، اور لفاظی سے اسے صحیح ثابت کرنے کی خواہ مخواہ سعی کرتے ہیں، چاہے ان کو اس سلسلے میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔

علی گڈھ مدرسہ کی بنیاد پہلے پہل مولوی سمیع اللہ مرحوم نے ۱۸۷۵ء میں رکھی، اس وقت سرسید بنارس میں تھے، مگر اس کی باضابطہ بنیاد ۱۸۷۷ء میں رکھی گئی، اور اس میں مولوی سمیع اللہ کے ساتھ سرسید بھی شریک تھے، اس افتتاح کا ایک مؤثر واقعہ مولوی بشیر صاحب بیان کرتے ہیں جو خود مولوی سمیع اللہ نے ان سے بیان کیا تھا۔ کہتے ہیں

"خود مولوی سمیع اللہ نے مجھ سے بیان کیا، کہنے لگے "میں اور سرسید نماز تہجد کے وقت اٹھ کر میدان تعمیر میں گئے، سہانا روح پرور وقت، فضا کی خاموشی، طبیعتوں میں قومی ہمدردی، اور دینی حمیت جوش زن، ایک عجیب کیفیت طاری تھی، سرور انگیز بھی تھی، رقت آمیز بھی، اور عبرت خیز بھی، مغلیہ سلطنت کی تباہی کے بعد ارض ہند پر ملت اسلامیہ کی یہ پہلی بنائے تعمیر تھی، زندگی اور ترقی کے خواب کی پہلی تعبیر، جوش سے طبیعت میں گریہ طاری ہو گیا، ہم دونوں روتے جاتے تھے، رب ذوالجلال کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے جاتے تھے، اور اس کے فضل و بخشش کے لئے زبان پر دعا تھی سرسید مجھ سے اصرار کرتے تھے کہ میں سنگِ بنیاد رکھوں، اور میں سرسید سے اصرار کرتا تھا، آخر میں سرسید کا اصرار غالب آگیا، میں نے انتہائی رقتِ قلب کے ساتھ یہ فریضۂ مسعود انجام دیا"[2]

جس ادارہ کی بنیاد رکھنے والوں نے قلب کی اس رقت کے ساتھ رکھی ہو، اور اس مسعود وقت میں رکھی ہو جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سائلوں کو پکارا جا رہا ہو، پھر بتایا جائے کہ اس خدمت کی قبولیت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، اللہ اللہ کیسا اخلاص ہے، روتے جا رہے ہیں اور اپنے گناہوں

---

[1] علی گڈھ نمبر ص۲۴۵ [2] ایضاً ص۲۴۶

کا اعتراف کرتے جا رہے ہیں، خدا جانتا ہے ایسی بنیاد کبھی بھی بے ثمر نہیں ہو سکتی، آج مسلم یونیورسٹی کی ساری کامیابی انھی بزرگوں اور مخلصوں کی نالۂ صبحگاہی اور گریۂ و بکائے نیم شبی کا نتیجہ ہے، کیسے بتاؤں کہ اب یہ سوز و گداز، یہ خلوص و للٰہیت عنقا ہے، آدمی کی زبان پر تو سب کچھ ہوتا ہے مگر اس کے دل میں کوئی بیج نہیں ہوتا، خدا گواہ ہے آج ہماری ناکامیابی کی بنیادی وجہ یہی اخلاص و للٰہیت اور خضوع و خشوع کا فقدان ہے۔

ہمارے علیگ بھائی اس واقعہ کو بار بار پڑھیں اور سوچیں ان کے اسلاف میں خشیتِ الٰہی کیسی رچی ہوئی تھی، آہ یہ بے لوث خدمت کا جذبہ، قوم کے ساتھ ایسی والہانہ محبت اور اپنی ذلت و مسکنت کا رب العزت کے آگے اس طرح اعتراف اب پچھلوں میں کہاں رہا؟ کاش ہم سمجھتے اور سچائی سے سوچتے،

مولوی سمیع اللہ کا خلوص علی گڈھ کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے، بعد میں سر سید اور مولوی سمیع اللہ مرحوم میں اختلاف اس حد تک بڑھا کہ ترکِ تعلقات کی نوبت آگئی، مگر با ایں ہمہ مولوی سمیع اللہ مرحوم نے کالج کی کبھی برائی نہ چاہی، مولوی بشیر الدین صاحب ہی کا بیان ہے۔

"اس افسوسناک صورت حال کے بعد مولوی سمیع اللہ کالج کے انتظامی امور سے بہت حد تک دست کش رہے، لیکن کالج کے ساتھ ان کی ہمدردیاں اس دور میں بھی باقی رہیں، کالج کے جو طلبا ان سے ملنے جاتے تھے دل کھول کر ان کی مدد کرتے، ان کو بہت مخلصانہ مشورہ دیتے اور خیر و ترقی کی تلقین فرماتے"[1]

میں اپنے علیگ بھائیوں سے ہی پوچھتا ہوں کہ وہ ایمان داری سے بتائیں کہ کیا یہ جذبہ اب ہمارے بڑوں میں باقی رہا؟ اور کیا اب بھی نیک نیتی کا وہی عالم ہے جو ہمارے پہلوں میں تھا؟ اب تو بصد حسرت و افسوس کہنا پڑتا ہے یع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

محسن الملک نے سر سید مرحوم کا ایک عجیب پر اثر واقعہ بیان کیا ہے، جس کے راوی مولوی بشیر الدین صاحب ہیں فرماتے ہیں۔

---

[1] علی گڈھ نمبر ۱۹۵۵ء

"یہ واقعہ انھوں نے مجھے خود بتایا ہے، سرسید سے خاصی بحث رہی، رات میں سو رہے تھے کہ گریہ و زاری کی آواز آئی دیکھا تو معلوم ہوا سید احمد خاں رو رہے ہیں، پوچھا کیا گھر سے کوئی تار آیا ہے، سرسید نے جھلا کر جواب دیا کہ پوری قوم تباہ ہو گئی اور تم پوچھتے ہو گھر سے کوئی تار آیا ہے"[1]

اس سوز و گداز کو ملاحظہ فرمایئے، رات کی تنہائی میں قوم کی بربادی پر رونے والا، اور ملت اسلامیہ کی تباہی پر آنسو بہانے والا اگر کامیاب نہ ہوتا تو پھر دنیا میں کون کامیاب ہوتا، سرسید مرحوم کے اسی خلوص اور سوز و گداز کا نتیجہ تھا کہ رب العزت نے اسے ہر طرح کی کامیابی عطا فرمائی، اور ہر طرح کی عزت سے نوازا۔

اس واقعہ میں ہمارے مہذب لیڈروں اور متمدن جوانوں کے لئے بڑا عبرت آموز سبق ہے، کاش وہ پڑھیں اور اثر قبول کریں۔

وقار الملک کا حصہ علی گڈھ کے قیام میں کسی سے کم نہیں، ان کی بڑی خوبی حق گوئی تھی کبھی اس سلسلہ میں رو رعایت نہ کی، عموماً رائے میں سرسید کے مخالف رہتے، کیوں کہ وقار الملک میں مذہبیت اور آئین و ضابطہ کی پابندی بہت تھی، لکھا ہے

"سرسید کا انتہائی احترام کرنے کے باوجود انھوں نے اپنی رائے میں فرق نہ آنے دیا، اور کھلے طور پر ان کی مخالفت کی، البتہ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ جب اکثریت نے اس کو پاس کر دیا، تو انھوں نے انتہائی خندہ پیشانی سے سر تسلیم خم کر دیا"[2]

یہ وقار الملک کے اخلاص کی دلیل ہے، اپنا نقطۂ نظر پوری قوت سے پیش کرتے، مگر جب اکثریت نے اس کو نہ مانا تو پھر اصرار نہ کیا، کہ یہی بات کیوں نہ ہوئی، ہمارے اس دور میں تو کچھ اور ہی معاملہ ہے، اگر کسی کی بات نہ رہی تو وہ ایک مخالف پارٹی کا روپ دھار لیتا ہے، اور یکسر ادارہ کی ہی مخالفت میں سرگرم عمل ہو جاتا ہے، آج کوئی غور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ جو حق اس کو ہے کیا وہی حق اور لوگوں کو بھی حاصل ہے یا نہیں، اگر سب یہی کرنے

---

[1] علی گڈھ نمبر صفحہ ۲۵ [2] ایضاً صفحہ ۲۵۳

لگیں تو ادارہ کا کیا حال ہو۔ اور غالبًا اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا کوئی اجتماعی ادارہ آج کامیاب نہیں ہوتا۔

وقار الملک کا ایک بڑا ہی مؤثر واقعہ مولوی بشیر الدین صاحب نے نقل کیا ہے فرماتے ہیں

"حیدرآباد میں ان (وقار الملک) کی کوٹھی میں ایک کوٹھری تھی، جس میں ایک اندھا فقیر رہتا تھا، اس کو کھانا نواب صاحب ہی کے مکان سے جاتا تھا، ایک دن زور کی بارش ہو رہی تھی، انھوں نے نوکروں سے کہا، کہ اندھے کو کھانا پہنچا دیا جائے، بارش کے سبب نوکروں نے تعمیلِ ارشاد میں تامل کیا، اور گویا بات ٹال گئے، نواب صاحب (یعنی وقار الملک) خاموشی سے اُٹھے، کھانا لے کر اس اندھے کے پاس گئے، اور بڑی محبت سے اسے کھانا کھلایا۔"[۱]

یہ اخلاق تھا نواب صاحب کا، جو کسی اعتبار سے آج کل کے کسی رئیس اور تعلیم یافتہ سے کم نہ تھے، جو کام ان کے نوکروں پر بار تھا، اسے خود بہ نفس نفیس کیا، اور کس دل جسپی سے کیا کہ کوئی بار محسوس نہ کیا، اور یہ خدمت بھی کس کی کی؟ ایک اندھے فقیر کی۔

غور فرمائیں آج کوئی مالدار تعلیم یافتہ ایسی خدمت کے لئے اپنے آپ کو تیار پاتا ہے، خدا گواہ ہے خاص خاص لوگوں کو چھوڑ کر یہ جذبہ "فقیر نوازی" عنقا ہو چکا ہے، آج کا مہذب طبقہ دوسری دنیا کا انسان ہے، اسے انسانی ہمدردی چھو نہیں گئی ہے، ہمارے اس دور میں یہ خدمت ننگ وعار کے مرادف سمجھی جائے گی، ایک ادنیٰ کا کام اعلیٰ کرے؟ کیسے ہو سکتا ہے، اب تو مالدار اپنے سگے غریب بھائی سے ملنا اپنی ذلت سمجھتا ہے، ایک گریجوٹ بھائی، اپنے جاہل بھائی کو منہ لگانا سب سے بڑا گناہ جانتا ہے، مگر یہ حضرات سوچتے نہیں کہ یہ اخلاقی بلندی نہیں انتہائی گراوٹ ہے ——— اور بڑوں کی بات تو جانے دیجئے آج ایسی "فقیر نوازی" کو معمولی انسان بھی اپنے لئے عار جانتا ہے۔

انھی وقار الملک کا ایک اور واقعہ سننے کے لائق ہے جس سے ان کی مذہبیت کا اندازہ

---

[۱] علی گڈھ میگزین علی گڈھ نمبر ص ۲۵۴

ہوتا ہے، ساتھ ہی ان کی انصاف پسندی اور عدل پروری کا، راوی مولوی بشیر صاحب ہی ہیں فرماتے ہیں

"وقار الملک نے اپنے لڑکے کو ندوہ میں داخل کرا دیا تھا، میں نے پوچھا کہ آپ نے ندوہ میں کیوں داخل کرا دیا کہنے لگے کچھ مذہبیت آجائے گی، میں نے فوراً کہا آپ دوسروں کے لڑکوں کو علی گڈھ بلا کر لامذہب بناتے ہیں، چپ ہو گئے، لڑکے کو ندوہ سے بلا لیا اور علی گڈھ کالج میں نام لکھا دیا۔"[1]

طبیعت کی نیکی اور دل کی سچائی ملاحظہ فرما رہے ہیں، خواہ مخواہ بحث شروع نہ کر دی، بلکہ وہی کیا جو اس وقت ان کو کرنا چاہئیے، ساتھ ہی اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ خود علی گڈھ کے بانیوں کو احساس تھا کہ مسلمان لڑکوں میں جس دینی جذبہ کی ضرورت ہے وہ علی گڈھ میں رہ کر نہیں پیدا ہو سکتا، وہ جذبہ کسی دینی مدرسہ ہی میں پرورش پا سکتا ہے، مگر وقت کا تقاضا تھا جس کے پورا کرنے پر وہ مجبور تھے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ کیا ہمارے رئیس، نواب اور مالداروں میں دینی تعلیم کا احترام باقی رہا، اب تو ان کی بسم اللہ ہی اے ۔ بی ۔ یا ک ۔ کھ سے ہوتی ہے، حد یہ ہے کہ اب مسلمان اپنے بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم دینا بھی ضروری نہیں سمجھتے، نہ نماز، روزہ کا مسئلہ بچہ کو سکھایا جاتا ہے، نہ نہانے دھونے کا، نہ قرآن پڑھنا سکھایا جاتا ہے اور نہ کلمہ اور اس کا معنی، نہ اسلامی تاریخ پڑھائی جاتی ہے اور نہ اسلامی معاملات و اخلاق، اور حد یہ ہے کہ آج مسلمانوں کے بچے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے بھی ناواقف ہوتے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قاضی عبدالغفار صاحب نے لکھا ہے میں مولانا محمد علی جوہر کے اخبار "ہمدرد" کے کارکنوں میں شامل ہوا، تو "مصر" کے عنوان سے ایک اداریہ لکھنے کا حکم ملا، کتابیں دی گئیں، نوٹ لکھائے گئے دس بارہ دن محنت کی لیکن لکھ کر جب پیش خدمت کیا تو مولانا مرحوم نے چند ہی سطریں پڑھ کر منہ بنا لیا اور یہ کہہ کر مسودہ پھینک دیا۔

"یہ کیا فضولیات گھسیٹ کر لائے ہو"

---

[1] علی گڈھ میگزین علی گڈھ نمبر ۲۵

پھر ایک گھنٹہ سمجھاتے رہے، قاضی صاحب کا بیان ہے کہ دوبارہ لکھ کر پیش کیا۔ مگر یہ بھی خوب پسند نہ آیا۔ حکم ہوا تیسری مرتبہ کوشش کرو، میں نے پھر از سرِ نو ترتیب دیا، اب کی جب لے کر حاضر ہوا، تو پڑھا اور شوق سے پڑھا اور پورا مضمون پڑھ کر

"گلے سے لگا لیا، تعریفوں کے پل باندھ دیئے، پہلے جس قدر اُن کی تنقید سے شرمندہ ہوا تھا، اب ان کی توصیف سے شرمندہ ہو گیا معلوم ہوا کہ تنقید کی تلخی ہی میں شہد اور دودھ کی لبریز نہریں بہا کرتی ہیں ہفتوں میرے مضامین کی تعریف ہوتی رہی"[۱]

ملاحظہ فرمایا جائے کہ ہمارے پہلے والے کس طرح اپنے عزیزوں کو تعلیم دیا کرتے تھے، اور اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ بڑے اچھے اچھے ادیب مضمون نگار پیدا ہوئے، اب تو کوئی مسودہ دیکھنے والا ہی نہیں ملتا، جس کو دیجئے وہ کہیں ڈال دے گا، اور ہفتوں مہینوں بلکہ سالوں بعد جا کر پوچھئے۔ جواب دے گا کیا کروں موقع نہیں ملا۔ اور یہ کام آپڑا، اور ایسا ہوا، بس غلط عذروں کی بھرمار کر دیں گے۔ نوجوانوں کی تربیت کرنا لوگ جانتے ہی نہیں۔ ہندوستان کے علماءِ کرام میں یہ امتیاز غالباً صرف حضرت علامہ گیلانی مدظلہٗ کو حاصل ہے کہ ان میں کبھی بھی ذرا سی سستی دیکھنے میں نہ آئی۔ کوئی علمی مضمون اسلام کے لئے دے دیجئے، پڑھتے جائیں گے اور بولتے جائیں گے، معلوم ہوگا کوئی سمندر ہے جو جوش زن ہے، انگریزی دانوں میں چند ہی افراد نکلیں تو نکلیں۔ اس سلسلہ میں اپنا کوئی تجربہ نہیں۔

اخیر میں اپنے محترم دوست سید علی امام صاحب (علیگ) کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی وجہ سے میں ان واقعات کو پڑھ سکا۔

---

[۱] علی گڑھ نمبر ۱۹۵۵ء

رہنمائے قرآن

تزک بابری

مترجم

(جناب محمد رحیم صاحب دھلوی)

(۳)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے برہان بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

مہر نگار خانم | بڑی بیٹی مہر نگار خانم تھیں - ان کی شادی سلطان ابو سعید مرزا کے بڑے بیٹے سلطان احمد مرزا سے ہوئی - احمد مرزا سے ان کے ہاں اولاد نہ ہوئی - پھر جنگ وجدل میں وہ شیبانی خاں کے ہاتھ پڑ گئیں -

میں جب کابل آیا - تو وہ شاہ بیگم کے ساتھ خراسان گئیں اور وہاں سے کابل آگئیں -

شیبانی خاں نے جب ناصر مرزا پر قندھار پہ چڑھائی کی - اور میں لمغان گیا - تو وہ خان مرزا اور شاہ بیگم کے ساتھ بدخشاں چلی گئیں -

مبارک شاہ نے جب خان مرزا کو قلعہ ظفر میں بلایا - تو راستہ میں سلطان ابوبکر کاشغری کی لٹیری فوج نے لوٹ لیا - مہر نگار خانم اور شاہ بیگم اور ان کے ساتھی گرفتار ہو گئے - اور سب کے سب اسی ظالم کی قید میں مر گئے -

قتلق نگار خانم | یونس خاں کی دوسری بیٹی میری والدہ قتلق نگار خانم تھیں - وہ اکثر لڑائیوں اور مصیبتوں میں میرے ساتھ رہی ہیں کابل کی فتح کے بعد پانچ چھ مہینے زندہ رہیں - سنہ ۹۱۱ھ[1] میں ان کا انتقال ہو گیا -

خوب نگار خانم | تیسری بیٹی خوب نگار خانم تھیں - ان کی شادی محمد حسین گورگان[2] دغلت سے ہوئی تھی - ان کے ہاں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئی - لڑکی علبید خاں سے بیاہی گئی - میں نے جب سمرقند اور

[1] ۱۵۰۵ء [2] یہ سلطان محمد خاں کی طرف سے اوراتیبہ کا حاکم تھا -

بخارا فتح کیا ہے تو وہ وہیں تھی۔ چوں کہ وہ بھاگ نہ سکی۔ اس لئے وہیں رہ گئی۔ سلطان سعید خاں[1] کی طرف سے اس لڑکی کا چچا سید محمد مرزا جب ایلچی بن کر میرے پاس سمرقند آیا تو وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ اور سلطان سعید خاں سے اس کی شادی ہو گئی۔ اس کے ہاں بیٹا ہوا اس کا نام حیدر مرزا تھا۔ جب حیدر مرزا کے باپ کو ازبکوں نے مار ڈالا[2] تو وہ میری خدمت میں آ گیا تھا۔ تین چار سال رہا۔ پھر مجھ سے اجازت لے کر خان کے پاس کاشغر چلا گیا۔

باز گردد بہ اصل خود ہمہ چیز زرِ صافی و نقرہ و ارزیز

کہتے ہیں اب وہ تائب ہو گیا ہے اور اس کے اطوار اچھے ہیں۔ مصوری اور خوشنویسی اچھی سیکھ لی ہے۔ تیر، پیکان اور تیر اندازی کے وقت انگوٹھے پر پہننے کے انگشتانے بناتا ہے۔ ہر کام میں اس نے کمال حاصل کیا ہے۔ شعر بھی کہا کرتا ہے۔ اس کی عرضی میرے پاس آئی تھی اس کی انشا بُری نہیں ہے۔

شاہ بیگم | یونس خاں کی دوسری بیوی شاہ بیگم تھیں۔ بیویاں یوں تو اور بھی تھیں۔ مگر صاحب اولاد یہی دونوں ہوئیں۔

شاہ بیگم، بدخشاں کے بادشاہ شاہ سلطان محمد کی بیٹی تھیں۔ بدخشاں کے بادشاہ اپنا نسب اسکندر فیلقوس سے ملاتے ہیں۔ کہتے ہیں اسی بادشاہ کی ایک اور بیٹی تھی۔ وہ شاہ بیگم کی بڑی بہن تھی۔ سلطان ابو سعید مرزا نے اس سے نکاح کیا تھا۔ ابو بکر مرزا اسی کے بطن سے تھا۔ شاہ بیگم سے یونس خاں کے ہاں دو بیٹے[3] اور ایک بیٹی ہوئی۔

سلطان محمود خاں[4] | ان تینوں میں بڑا سلطان محمود خاں تھا۔ جس کو سمرقند وغیرہ کے لوگ جانی بیگ خاں کہتے ہیں۔

سلطان احمد خاں | اس سے چھوٹا سلطان احمد خاں تھا۔ جو الچہ خاں کے نام سے مشہور تھا۔ الچہ

---

[1] سلطان سعید خاں کاشغر کا ایک شہزادہ تھا [2] ۱۵۰۸ء [3] دو بیٹیاں
[4] مسٹر جان لیڈمی نے اپنے ترجمے میں اس کو جنیک خاں لکھا ہے

کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ قل ماقی اور مغلئی زبان میں قاتل کو الاچی کہتے ہیں۔ ان نے چونکہ قوم قل ماق کا کئی دفعہ قتل عام کیا ہے۔ اس لئے اس کو الاچی یعنی قاتل کہنے لگے۔ اور کثرت استعمال ذ الاچی کو الچھ بنا دیا) ان دونوں کے حالات آئندہ بیان ہوں گے۔

سلطان نگار خانم | سب سے چھوٹی اور ایک بہن سے بڑی سلطان نگار خانم تھی۔ اس کی شادی سلطان محمود مرزا (سلطان ابو سعید مرزا کے فرزند) سے ہوئی تھی۔ اس سے ایک فرزند پیدا ہوا۔ جس کا نام سلطان ویس تھا۔ اس کا حال اس کتاب میں آئندہ بیان ہوگا۔

سلطان محمود مرزا کے مرنے کے بعد سلطان نگار خانم اپنے بیٹے کو لے کر چھپ چھپاتے تاشقند میں اپنے بھائیوں کے پاس چلی گئی۔

کئی برس بعد ازبک سلطان سے جو قزاق قوم کے سلاطین میں سے تھا۔ اور چنگیز خاں کے بڑے بیٹے جوجی خاں کی اولاد میں سے تھا اس کی شادی ہو گئی۔

شیبانی خاں نے جب سب کو مار کر تاشقند اور شاہرخیہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت یہ اپنے دس بارہ مغل ملازمین کے ساتھ ازبک سلطان کے پاس چلی گئی تھی۔ ازبک سلطان سے اس کے ہاں دو بیٹیاں ہوئیں۔ ایک کی شادی تو سلاطین شیبانیہ میں سے کسی کے ساتھ ہوئی۔ اور دوسری سلطان سعید خاں کے بیٹے رشید خاں سے بیاہی گئی۔

ازبک سلطان کے انتقال کے بعد اس نے قزاق قوم کے سردار قاسم خاں سے شادی کر لی۔ مشہور ہے کہ قزاق قوم میں قاسم خاں کے برابر کسی خان یا سلطان نے قوم کا انتظام نہیں کیا۔ اس کے لشکر جرار کی گنتی تین لاکھ کے قریب بیان کی جاتی ہے۔

قاسم خاں کے مرنے کے بعد سلطان نگار خانم سعید خاں کاشغری کے پاس چلی گئی

دولت سلطان خانم | یونس خاں کی سب سے چھوٹی بیٹی دولت سلطان خانم تھی۔ جو تاشقند کی ویرانی اور بربادی کے موقعہ پر شیبانی خاں کے لڑکے تیمور سلطان کے نکاح میں آئی اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ سمرقند سے چلتے وقت وہ میرے ساتھ چلی آئی تھی۔ تین چار برس بدخشاں میں رہی۔

اس کے بعد سلطان سعید خاں کے پاس کاشغر چلی گئی۔

الوس آغا | عمر شیخ مرزا کی ایک بیوی خواجہ حسین بیگ کی بیٹی الوس[عـ۱] آغا تھی۔ اس سے ایک لڑکی ہوئی جو چھوٹی سی عمر میں مرگئی۔ پھر اس بیوی کو ڈیڑھ برس بعد چھوڑ دیا تھا۔ [عـ۲]

فاطمہ سلطان آغا | ایک اور بیوی فاطمہ سلطان آغا تھی۔ [عـ۳]

قراکوز بیگم | ایک اور بیوی قراکوز بیگم تھی۔ اس سے انھوں نے اپنی آخر عمر میں شادی کی تھی۔ یہ بہت چہیتی تھی۔ مرزا کی خوشامد کے مارے اس کو ابوسعید[عـ۴] مرزا کے بڑے بھائی منوچہر مرزا کا رشتہ دار بنا دیا تھا۔

حرمیں | حرمیں بہت سی تھیں۔

امید آغاچہ | ان میں سے ایک امید آغاچہ تھی۔ جو مرزا کے سامنے ہی مرگئی۔

تون سلطان | مرزا کے آخر وقت میں تون[عـ۵] سلطان ایک عورت محل میں داخل ہوئی تھی وہ مغل قوم میں سے تھی۔

آغا سلطان | ایک اور، آغا سلطان تھی۔

امراء | مرزا کے امراء میں سے :-

خدا بیروی تیمور تاش | ایک خدا بیروی تیمور تاش تھا۔ وہ آق بوغا بیگ، حاکم ہری کی اولاد میں سے تھا۔ سلطان ابوسعید مرزا نے جب شاہرخیہ میں جوگی مرزا کا محاصرہ کیا۔ اس وقت عمر شیخ مرزا کو فرغانہ کا حاکم بنایا۔ اور ان کی سرکار کا کام خدا بیروی تیمور تاش کو سپرد کر کے اس کو وزیر بنا دیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر پچیس برس کی تھی اگرچہ وہ کمسن تھا۔ مگر اس کا ڈھنگ، انتظام اور قاعدے تعریف کے قابل تھے۔

دو ایک سال بعد جب ابراہیم بیگ چاک نے اوش کے نواح میں لوٹ مار مچائی تو خدا بیروی نے اس کا تعاقب کیا۔ اس سے لڑا اور شکست کھاکر شہید ہوا۔

عـ۱ ایک نسخہ میں اس کا نام آلوس آغائی لکھا ہے۔ عـ۲ ایک نسخہ میں "ایک سال یا ڈیڑھ سال" لکھا ہے۔ عـ۳ فاطمہ سلطان آغا مغل قوم میں سے ایک سردار کی لڑکی تھی۔ یہ عمر شیخ مرزا کی سب سے پہلی بیوی ہے۔ عـ۴ سلطان ابوسعید مرزا، بابر کا دادا تھا۔

عـ۵ ایک نسخہ میں اس کا نام "یون سلطان" ہے

ان دنوں میں سلطان احمد مرزا اوراتیبہ کے سرمائی علاقہ میں تھا۔ جو سمرقند کے مشرق کی جانب ۵ ۹ میل ہے اور آق قیچغائے کے نام سے مشہور ہے۔

سلطان ابوسعید مرزا بابا خاکی میں تھا۔ جو ہری سے مشرق کی جانب چھتیس میل ہے۔

عبدالوہاب شقادل نے بہت جلد یہ خبر مرزا کی خدمت میں پہنچائی۔ اس نے تین سو اکیاسی میل کا راستہ چار دن میں طے کیا۔

حافظ محمد بیگ دولدائی ایک اور امیر حافظ محمد بیگ دولدائی تھا۔ وہ سلطان ملک کاشغری کا بیٹا اور احمد حاجی بیگ کا چھوٹا بھائی تھا۔ خدابیردی کے مرنے کے بعد اس کا عہدہ اسی کو دیا گیا۔

سلطان ابوسعید مرزا کے مرنے کے بعد اندجان کے امراء سے اس کی نہ بنی۔ وہ سلطان احمد مرزا کے پاس سمرقند چلا گیا۔ عہ

سلطان احمد مرزا کی شکست کی خبر جس وقت معلوم ہوئی[عہ] اس وقت حافظ محمد بیگ اوراتیبہ کا حاکم تھا۔ عمر شیخ مرزا جب سمرقند فتح کرنے کے ارادے سے اوراتیبہ پہنچے تو اس نے اوراتیبہ مرزا کے ملازمین کے حوالے کر دیا۔ اور خود مرزا کا نوکر ہو گیا۔ مرزا نے اس کو اندجان کی حکومت عطا کی۔

اس کے بعد محمد بیگ سلطان محمود خاں کے پاس چلا گیا۔ انھوں نے مرزا خاں کو اس کے سپرد کیا۔ اور ویزک[عہ] کی حکومت بھی اسے عطا کی۔

میں نے جب کابل لیا۔ اس سے پہلے وہ ہندوستان کے راستے مکہ معظمہ روانہ ہوا اور راستہ ہی میں مر گیا۔ وہ فقیر منش کم سخن اور بے حیثیت آدمی تھا۔

خواجہ حسین بیگ ایک اور امیر، خواجہ حسین بیگ خوش مزاج اور سیدھا سادھا آدمی تھا۔ اس وقت کے رواج کے مطابق وہ شراب نوشی کے وقت تولوق (ایک قسم کا مغلئی نغمہ) خوب گاتا تھا۔

شیخ مزید بیگ ایک اور امیر شیخ مزید بیگ تھا میرا پہلا اتالیق وہی تھا۔ اس کے قاعدے قرینے

عہ مسٹر جان لیڈن کے ترجمے میں ایک فقرہ کا اضافہ ہے "اور سلطان احمد مرزا کا ملازم ہو گیا"

عہ ایک نسخہ میں ہے کہ "جب یہ خبر ملی کہ سلطان احمد مرزا کو دریائے چر کی لڑائی میں ادھمنی ہے۔ اس وقت حافظ محمد بیگ دولدائی اوراقیبہ کا حاکم تھا۔

عہ جزخ

بہت اچھے تھے۔ وہ بابر مرزا[1] کی خدمت میں بھی رہ چکا تھا۔ عمر شیخ مرزا کی سرکار میں اس سے بڑا امیر دوسرا کوئی نہ تھا۔ وہ فاسق آدمی تھا۔ اس لئے غلام بہت رکھتا تھا۔

علی مزید بیگ قوچین | ایک اور امیر، علی مزید بیگ قوچین تھا۔ اس نے دو دفعہ بغاوت کی۔ ایک دفعہ آخشی میں اور دوسری دفعہ تاشقند میں۔ وہ منافق، فاسق، نمک حرام اور بے کار آدمی تھا۔

حسین یعقوب بیگ | حسین یعقوب بیگ بھی ایک امیر تھا۔ صاف دل، خوش طبع، ہوشیار اور مستعد آدمی تھا۔ یہ شعر اسی کا ہے ؎

بازآ اے ہمائے کہ بے طوطی خطیت نزدیک شد کہ زاغ برد استخوان من

وہ بہت بہادر تھا اور اچھا تیرانداز تھا۔ چوگان کھیلنے میں اسے بڑی مہارت تھی اور کوڑی ذقن کے کھیل میں چھلانگ خوب لگاتا تھا[2]۔ عمر شیخ مرزا کی وفات کے بعد میرے ہاں مختار ہو گیا تھا۔ البتہ تھڑدلا، کم حوصلہ اور فتنہ پرداز بھی تھا۔

قاسم بیگ قوچین | قاسم بیگ قوچین بھی ایک امیر تھا۔ وہ اندجان کے لشکر کے قدیم سرداروں میں سے تھا۔ حسن بیگ کے بعد وہی میری سرکار میں مختار رہا۔ آخر عمر تک اس کے اختیار اور اعتبار بڑھتے گئے کم نہ ہوئے۔ وہ بہت بہادر آدمی تھا۔ ایک دفعہ ازبک کاشان[3] کے نواح کو لوٹ مار کر چلے۔ اس نے ان کا پیچھا کیا اور ان کو جا لیا۔ اور خوب مار ماری۔ عمر شیخ مرزا کے زمانے میں بھی وہ بڑا شمشیر زن تھا۔ یاسی کجیت[4] کی جنگ میں وہ گھمسان کی لڑائی لڑا۔ بھاگڑ اور مصیبت کے موقع پر جب میں نے کوہستان مسیخا[5] سے سلطان محمود خاں کے پاس جانے کا ارادہ کیا تو وہ مجھ سے علیحدہ ہو کر خسرو شاہ کے پاس چلا

[1] بابر مرزا ابن بایسنغر مرزا ابن شاہرخ مرزا ابن تیمور۔ بابر مرزا نہایت عقلمند شہزادہ تھا۔ ۱۴۵۷ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ کچھ دن تک خراسان کا حاکم رہا ہے۔

[2] بابر نے اس کھیل کا نام "خوک یلہ" لکھا ہے یعنی مینڈک کی طرح چھلانگ مارنا۔ یہ ایک کھیل تھا جو ہمارے ہاں کوڑی ذقن کے نام سے مشہور ہے۔

[3] دریائے سر کے شمال میں واقع ہے۔

[4] ۹۰۴ھ میں یہ جنگ ہوئی تھی۔

[5] ایک نسخہ میں اس کا نام کوہستان مسیخی لکھا ہے۔

گیا۔ ۹۰۸ھ[1] میں جب میں نے خسرو شاہ کے آدمیوں کو توڑا اور کابل جاکر مقیم کو گھیرا تو وہ پھر میرے پاس چلا آیا۔ میں نے دوبارہ رکھ لیا۔ اور پچھلی سی عنایت اور مہربانی کی۔

درۂ خوش میں جب میں نے ہزارہ ترکمانوں پر چڑھائی کی تو اس نے بڑھاپے میں جوانوں سے بڑھ کر کام کیا۔ میں نے اس کو اس کے صلے میں ملک بنگش دے دیا۔ اور کابل میں آکر اس کو ہمایوں کا اتالیق بنا دیا۔

زمین داور[2] فتح ہونے کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ مسلمان دیانت دار اور پرہیزگار آدمی تھا۔ ایسے کھانوں سے جن میں شک و شبہ ہو بچتا تھا۔ اس کی رائے اور تدبیر بہت عمدہ تھی۔ بڑا پُر مذاق آدمی تھا اَن پڑھ تھا۔ مگر عالی دماغ مزاح باز تھا۔

بابا قلی بیگ | بابا قلی بیگ بھی ایک امیر تھا۔ وہ شیخ علی بہادر کی اولاد میں سے تھا۔ شیخ مزید بیگ کے انتقال کے بعد اسی کو میرا اتالیق بنایا تھا۔

سلطان احمد مرزا نے جن دنوں اندجان پر لشکر کشی کی تو وہ سلطان احمد مرزا سے مل گیا اور اوراتیبہ مرزا کو دے دیا۔

سلطان محمود مرزا کے انتقال کے بعد جب وہ سمرقند سے نکلا اور بھاگ کر آرہا تھا[3]۔ اس وقت سلطان علی مرزا اوراتیبہ سے نکلا اور اس سے لڑا اور اسے شکست دے کر قتل کردیا۔

وہ اچھا منتظم تھا۔ اور اس کے پاس فوجی سامان نہایت عمدہ تھا۔ نوکروں کو اچھی طرح رکھتا تھا۔ وہ نہ روزہ رکھتا تھا۔ نہ نماز پڑھتا تھا۔ ظالم تھا اور کافروں جیسا تھا۔

میر علی دوست طغائی | میر علی دوست طغائی بھی ایک امیر تھا۔ وہ قوم ساغرچی میں سے تھا۔ میری نانی ایسن دولت بیگم کا رشتہ دار تھا۔ میں عمر شیخ مرزا کے زمانے ہی سے اس سے اکثر رعایت کرتا رہتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس سے کچھ کام نکلے گا۔ مگر جس زمانے میں وہ میرے پاس رہا۔ اس سے کوئی

---

[1] مطابق ۱۵۰۲ء عیسوی [2] یہ جگہ قندھار سے نوے میل مغرب کی طرف دریائے ہرمند کے سیدھے کنارے پر ادبیر کی جانب واقع ہے۔ [3] مسٹر جان لیڈن نے لکھا ہے "بھاگ کر میرے پاس آرہا تھا۔"

ایسا کام نہ نکلا۔ جیسا کہ خیال تھا۔

وہ سلطان ابو سعید مرزا کی خدمت میں بھی رہا تھا۔ اس کا دعوی تھا کہ میں جادوگر ہوں۔ وہ شکار کے سامان کا داروغہ تھا۔ اخلاق و اطوار بہت برے تھے۔ بخیل، فتنہ انگیز، خبطی، خودپسند، بدزبان اور ترش رو آدمی تھا۔

ویس لاغری | ویس لاغری سمرقند کا رہنے والا، توق چی قوم میں سے ایک امیر تھا۔ شیخ عمر مرزا کی آخری عمر میں وہ ان کا بہت مقرب ہو گیا تھا۔

مصیبتوں کے موقعوں پر اس نے میرا ساتھ دیا ہے۔ اس کی رائے اور تدبیر اچھی تھی۔ کسی قدر فتنہ انگیز ضرور تھا۔

میر غیاث طغائی | میر غیاث طغائی بھی ایک امیر تھا۔ وہ علی دوست کا چھوٹا بھائی تھا۔

سلطان ابو سعید مرزا کی سرکار میں مغلوں میں اس سے بڑا کوئی سردار نہیں تھا۔ سلطان ابو سعید مرزا کی مہر اسی کے پاس رہتی تھی۔

عمر شیخ مرزا کے آخری وقت میں ان کے بھی بہت منہ چڑھ گیا تھا اور ویس لاغری کا بہت دوست تھا۔ جب کاشان سلطان رضا خاں کو دے دیا۔ تو وہ اس وقت سے اپنی وفات تک خان ہی کی خدمت میں رہا[1]۔ خان نے بھی اس کو اچھی طرح رکھا۔ بہت ہنس مکھ اور بڑا ہجو باز تھا۔ اور بدکاری میں بیباک تھا۔

علی درویش خراسانی | علی درویش خراسانی سلطان ابو سعید مرزا کے زمانے میں خراسانی چیلوں میں داخل تھا۔ جب سلطان ابو سعید مرزا نے سمرقند اور خراسان پر قبضہ کیا تو اس کو دونوں جگہ کے چیلوں کا افسر بنایا۔ اسی لئے اس کو "امیر چہرہ ہائے سمرقند و چہرہ ہائے خراسان" کہا کرتے تھے۔

میرے سامنے اس نے سمرقند کے دروازے پر خوب حملے کئے تھے۔ بہادر آدمی تھا۔ نستعلیق خط اچھا لکھتا تھا۔ بہت خوشامدی اور بڑا خسیس تھا۔

قنبر علی مغل | قنبر علی مغل خواجہ سرا تھا۔ اس کا باپ اس ملک میں آنے کے بعد کچھ دن تک سلاخی کرتا رہا۔ اس لیے اس کا نام قنبر علی سلاخ مشہور ہو گیا۔

وہ یونس خاں کے ہاں آفتاب چی ہو گیا تھا۔ آخر امرا میں شامل ہوا۔ میں نے اس کے ساتھ

[1] سلطان محمود خاں نے جب ... خان پر تغلب کیا اور اس وقت سے محمود خاں کی وفات تک انہی کی خدمت میں رہا۔

بہت رعایتیں کیں۔ جب تک ترقی ملتی رہی۔ تب تک اس کا طریقِ انتظام اچھا رہا۔ جب کنی قابل ہوا جی چرانے لگا۔ بہت لسان اور فضول گو تھا۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جس میں یہ دونوں عیب ہوں وہ کم حوصلہ اور کوڑھ مغز بھی ہوتا ہے۔

۸۹۹ھ[1] ہجری کے حالات

والد کے مرنے کی خبر جب عمر شیخ مرزا کا انتقال ہوا۔ اس وقت میں اندجان کے چار باغ میں تھا۔ رمضان شریف کی پانچویں تاریخ منگل کے دن مجھے اندجان میں خبر ملی۔ میں گھبرا کر سوار ہوا اور جتنے ملازم میرے ساتھ تھے ان کو لے کر قلعہ کی طرف چلا۔[2]

شیرم طغائی کی محبت میں مرزا دروازے کے قریب پہنچا۔ تو شیرم طغائی جلاد مجھے عیدگاہ کی طرف لے چلا[3] اس کو شاید یہ خیال ہوا کہ سلطان احمد مرزا بہت بڑا بادشاہ ہے اور زبردست فوج کے ساتھ اس نے چڑھائی کی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ امرا مجھ کو اور ملک کو اس کے حوالے کر دیں۔ اس نے مناسب جانا کہ مجھے اوزکند[4] اور اس کے پہاڑوں کی طرف لے جائے۔ تاکہ ملک جائے تو جائے میں تو بچ جاؤں۔ اور اپنے ماموں الچہ خاں یا سلطان محمود خاں کے پاس پہنچ جاؤں۔

امراء کی الفت خواجہ مولانا قاضی نے (وہ سلطان احمد قاضی کے صاحبزادے اور شیخ برہان الدین قلیچ کی اولاد میں سے تھے۔ والدہ کی طرف سے ان کا سلسلہ سلطان ایلک قاضی سے ملتا ہے اور ان کے خاندان کو یہاں ملک بھر میں بزرگ مانا جاتا ہے اور شیخ الاسلام کا اعزاز بھی ان ہی کے خاندان میں رہا ہے۔ ان کا ذکر پھر بیان ہوگا۔ اور قلعہ میں جو دوسرے امراء تھے میرے چلے جانے کی خبر سنتے ہی خواجہ محمد وزری کو (یہ شخص بابریوں میں سے ہے اور عمر شیخ مرزا کا پرانا ملازم ہے۔ اور ان کی ایک بیٹی کا اتالیق بھی رہ چکا ہے) میرے پاس بھیج کر اطمینان دلایا۔ میں عیدگاہ تک ہی پہنچا تھا کہ یہ مجھ کو واپس لے آئے۔

تخت نشینی میں محل میں آکر اتر پڑا۔ خواجہ مولانا قاضی اور سب سردار میری خدمت میں حاضر ہوئے اور مشورے کے بعد ایک فیصلہ کر لیا۔ پھر قلعہ کی فصیل اور برج کو مضبوط بنایا اور سامان جنگ درست کرنے میں

---

[1] مطابق ۱۴۹۴ء عیسوی۔ [2] ایک نسخہ میں ہے کہ "میں قلعہ کو بچانے کے لئے چلا"۔ [3] ایک نسخہ میں ہے کہ "شیرم طغائی میرے گھوڑے کو پکڑ کر عیدگاہ لے چلا"۔ [4] اوزکند "ز" سے کوہستان الاتاغ کی جانب اوش کے شمال میں یہ مقام واقع ہے۔

مشغول ہو گئے۔

حسین یعقوب اور قاسم قوچین وغیرہ مرغینان کی طرف دھاوا مارنے گئے ہوئے تھے۔ دو ایک دن بعد آ کر وہ بھی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور سب کے سب متفق اور متحد ہو کر قلعہ بچانے میں لگ گئے۔

بڑے چچا کا حملہ | اس عرصہ میں سلطان احمد مرزا نے اوراتیپہ، خجند اور مرغینان لے لئے اور اندجان سے چار کوس کے فاصلہ پر قبا[1] کے مقام پر آ پہنچا۔

پہلا قتل | اس موقعہ پر اندجان کے مشہور باشندوں میں سے درویش[2] کافر کو اس لئے قتل کر دیا گیا کہ وہ غیر مناسب باتیں کہتا پھرتا تھا۔ اس انتظام سے تمام شہدے اور لفنگے سیدھے ہو گئے۔

عاجزی کا پیغام | میں نے خواجہ قاضی، اوزون حسن، اور خواجہ حسین کو سلطان احمد مرزا کے پاس بھیجا۔ اور کہلوایا کہ یہ ظاہر ہے کہ اس ملک میں آپ اپنا کوئی آدمی ضرور مقرر کریں گے۔ میں آپ کا خدمتگار بھی ہوں اور فرزند بھی ہوں۔ یہ خدمت فدوی کو عطا کی جائے تو مناسب ہے۔

گذارش ٹھکرائی گئی | سلطان احمد مرزا فقیر مزاج اور کم سخن آدمی تھا۔ مگر جو معاملات پیش آتے وہ بغیر امراء کی مرضی کے طے نہ ہوتے۔ امراء نے میری گذارش پر توجہ نہ کی۔ سخت جواب دیا اور آگے بڑھے۔

بگڑی بن گئی | اللہ تعالیٰ نے ہر موقع پر مری بگڑی کو اپنی قدرت کاملہ سے بے منت خلق بنایا ہے۔ یہاں بھی اس نے کئی اسباب ایسے پیدا کر دیے کہ دشمن اس طرف آنے سے تنگ۔ اور شرمندہ ہوا اور خالی ہاتھ واپس گیا

پل ٹوٹ گیا | ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ قبا میں جو ایک کالا دریا ہے۔ ایسی دلدل ہے کہ بغیر پل کے اس کو پار نہیں کیا جا سکتا۔ فوج زیادہ تھی۔ پل پار کرتے تت وہ ٹوٹ گیا۔ بہت سے اونٹ گھوڑے دریا میں ڈوب گئے۔

اس سے تین چار سال پہلے دریائے چرچق[3] سے اترتے وقت بھی ان لوگوں نے بھاری شکست کھائی تھی۔ نئے حادثہ نے وہ واقعہ یاد دلایا۔ اس لئے تمام لشکر پر وہم غالب آ گیا۔

---

[1] ایک نسخہ میں "محمود رزی" لکھا ہے۔ [2] قبا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اور اندجان کے مغرب کی طرف دریائے قبا کے کنارے پر ہے۔ ق پر زبر ہے۔ [3] ایک نسخہ میں اس کا نام "درویش گا" لکھا ہے۔

گھوڑوں میں وبا پھیلی | دوسرا حادثہ یہ ہوا کہ گھوڑوں میں ایسی وبا پھیلی کہ طویلے کے طویلے خالی ہوگئے۔ اس کے علاوہ مری فوج اور رعیت کو اتنا یک دل اور مستعد پایا۔ کہ جب تک جان میں جان ہے۔ تب تک جان دینے سے نہ گھبرائیں گے اور مرنے سے منھ نہ پھیریں گے۔

صلح کی بات چیت | ان وجوہ سے وہ پریشان ہوگئے اور آخر جب اندجان کو بس بھر رہ گیا تو درویش ترخان کو ہماری طرف بھیجا۔ ہمارے ہاں سے بھی حسن یعقوب کو بھیجا گیا۔ عیدگاہ کے قریب دونوں وکیل آپس میں ملے۔ صلح کی بات چیت طے کی اور واپس ہوئے۔

بڑے اموں کا حملہ | سلطان محمود خاں دریائے خجند کی طرف سے بڑھا چلا آرہا تھا۔ اس نے آتے ہی آخشی کو گھیر لیا۔ وہاں جہانگیر مرزا تھا۔ اور امراء میں سے علی درویش بیگ، قلی کوکلتاش، محمد باقر بیگ۔ اور دیوان خانہ کا داروغہ شیخ عبداللہ تھا۔

ویس لاغری اور میر غیاث کی غداری | ویس لاغری اور میر غیاث طغائی بھی وہیں تھے۔ یہ دونوں کے دونوں دوسرے امراء سے بدظن ہوکر کاشان چلے گئے جو ویس لاغری کا ملک تھا۔ ویس لاغری چونکہ ناصر مرزا کا اتالیق تھا۔ اس لئے ناصر مرزا کاشان میں رہتا تھا۔

جس وقت خان آخشی کے نواح میں داخل ہوا۔ اس وقت ان دونوں امیروں نے خان سے سازش کرلی اور کاشان حوالے کر دیا۔

میر غیاث توخان کے ساتھ رہا اور ویس لاغری ناصر مرزا کو لے کر سلطان احمد مرزا کے پاس چلا گیا وہاں ان کو محمد مزید ترخان کے سپرد کر دیا گیا۔

سلطان محمود خاں کی واپسی | محمود خاں نے آخشی پر کئی حملے کئے۔ مگر کچھ نہ بنا سکا۔ آخشی کے سرداروں نے اور فوج نے جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ اسی دوران میں سلطان محمود خاں بیمار ہوگیا۔ لڑائی سے بھی اس کا جی چھوٹ چکا تھا۔ اپنے ملک کی طرف لوٹ گیا۔

ابابکر کاشغری کا حملہ | ابابکر دوغلت کاشغری کسی سے نہ دبتا تھا اور کئی برس سے ختن اور کاشغر کا حاکم بنا بیٹھا۔ اس کو بھی اس ملک کے لینے کی ہوس ہوئی۔ اور کند کے پاس آکر اس نے ایک چھوٹا سا قلعہ بنا لیا اور لوٹ مار شروع کر دی

خواجہ قاضی اور چند امرا کا تقرر کیا گیا کہ کاشغری کی خبر لیں۔ جب یہ وہاں پہنچے تو اس نے دیکھا کہ میں اس فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس نے خواجہ قاضی کو اپنا سفارشی بنایا۔ سو حیلے حوالے کئے اور اپنا پیچھا چھڑا کر چل دیا۔

ساتھیوں کی جاں بازی کا اعتراف سچ یہ ہے کہ اس دوران میں جبکہ ایسے ایسے سخت واقعات پیش آئے۔ عمر شیخ مرزا کے پس ماندہ امرا اور سپاہیوں نے دلی اتفاق سے کام کیا اور بہادری اور جاں بازی میں کسر نہیں کی۔

والدہ کی فاتحہ ان جھگڑوں سے فرصت پانے کے بعد مرزا کی والدہ شاہ سلطان بیگم[1] اور جہانگیر مرزا محل کے لوگوں اور امرا کے ساتھ آخشی سے اندجان آئے۔ سب نے ماتم پرسی کی رسمیں ادا کیں۔ فقیروں کو آش اور کھانا تقسیم ہوا۔

ان کاموں سے فراغت کے بعد ملک کے نظم و نسق کی طرف توجہ کی گئی۔ (باقی آئندہ)

---

[1] شاہ سلطان بیگم، بابر کی دادی تھیں۔

ادبیات

غزل

از

(جناب الٓم مظفر نگری)

بڑھے توقیر ان کی اہلِ عالم کی نگاہوں میں
مذاقِ عجز پرور بھی اگر ہو کج کلاہوں میں

مآلِ اضطرابِ شوق کی لذت وہ پائے گا
جسے تسکین مل جائے محبت کی نگاہوں میں

وہ پہلے شوخیٔ ہر جلوہ سے پہروں اُلجھتے ہیں
سنبھل کر پھر قدم رکھتے ہیں اپنی جلوہ گاہوں میں

قدم خود لے گی منزل ان کے آکر خضرِ منزل کیا
مذاقِ خود روی پیدا تو ہو گم کردہ راہوں میں

نہ کیوں محفل کی ہر شے مستیوں میں غرق ہو ساقی
جھلکتے ہیں ہزاروں مے کدے تیری نگاہوں میں

سرِ محشر گنہگاروں پہ رحمت دیکھ کر ان کی
بڑی تشویش پیدا ہو گئی ہے بے گناہوں میں

ہے قائم گرمیٔ دیر و حرم جن سے وہ ہنگامے
نہیں پاتے ہیں اذنِ باریابی خانقاہوں میں

ازل کے دن ہی سے یہ ربطِ حسن و عشق قائم ہے
میں ہر دل ان کی نگاہوں میں وہ ہیں میری نگاہوں میں

سروں کے ساتھ وقتِ سجدہ دل بھی جھکتے رہتے ہیں
طریقِ بندگی یہ ہے وفا کی سجدہ گاہوں میں

جنہوں نے مدتوں کی مشق جلوہ طورِ الفت پر
وہ نظریں لے کے ہم آئے ہیں تیری جلوہ گاہوں میں

ہجومِ غم ہی کے پہلو میں تسکینِ مکمل تھی
ملا ساحل مری کشتی کو موجوں کی پناہوں میں

کہاں تک سلسلہ پہنچا ہے ناکامیٔ الفت کا
کوئی تاثیر اب باقی ہے نالوں میں نہ آہوں میں

وہ سب ہی قافلے ہیں بے نیازِ عشرتِ منزل
ازل سے جو رواں ہیں زندگیٔ غم کی راہوں میں

خداوندا! نہ جس پر مُہر ہو اشکِ ندامت کی
گنہ ایسا نہیں ہے کوئی بھی میرے گناہوں میں

الٓم دنیا میں رہ کر کس سے امیدِ وفا رکھتے
وہی ثابت ہوئے دشمن کہ تھے جو خیر خواہوں میں

"روحِ اقبال"

از

(جناب قمرؔ مرادآبادی)

مہ و انجم میں حسنِ معتبر تیرا ہے یا میرا
نظر میری سہی نورِ نظر تیرا ہے یا میرا

جہانِ آب و گِل میں شور و شر تیرا ہے یا میرا
یہ افسانہ بعنوانِ دگر تیرا ہے یا میرا

عدو کو جرأتِ تنقید کیوں دی ذوقِ سجدہ نے
جبیں میری ہے لیکن سنگِ در تیرا ہے یا میرا

دعائیں میری، نالے میرے، آہِ نارسا میری
مگر یہ تو بتا بابِ اثر تیرا ہے یا میرا

بتا یہ کس کا منشا ہے کہ میں محرومِ منزل ہوں
سفر میرا سہی، عزمِ سفر تیرا ہے یا میرا

مجھے کیوں بخش دی ہیں گردشِ ایام کی فکریں
کہ یہ ہنگامۂ شام و سحر تیرا ہے یا میرا

صدائے نالۂ دل پر خموشی کس کا شیوہ ہے
تو ہی کہہ دے کہ پتھر کا جگر تیرا ہے یا میرا

مذاقِ دید میرا، ہوش میرے بے خودی میری
ہجومِ برق و طوفانِ شرر تیرا ہے یا میرا

میں قفسِ جبرِ خاموشی، تو محوِ مصلحت کوشی
یہ فتوے کون دے کافر بشر تیرا ہے یا میرا

ترے احکام پر مہرِ صداقت ثبت کی میں نے
کسے معلوم تھا پیغام بر تیرا ہے یا میرا

قمرؔ وہ مجھ کو مل جاتا تو اتنا پوچھتا اس سے
کہ یہ سرمایۂ فکر و نظر تیرا ہے یا میرا

تبصرے

ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت از جناب آصف بن علی اصغر فیضی تقطیع کلاں ضخامت ۳۲ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت ۸ ر پتہ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۔

جناب آصف بن علی فیضی ملک کے مشہور مصنف ہیں ۔ انگریزی میں اسلامی قانون پر متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں ۔ موصوف نے ۱۹۵۳ء میں امریکہ میں اسلامیات پر جو ایک کانفرنس ہوئی تھی اس کے لئے ایک مقالہ بزبان انگریزی لکھا تھا ۔ یہ رسالہ اسی کا اردو ترجمہ ہے ۔ اصل رسالہ ہماری نظر سے نہیں گذرا ۔ لیکن اس کا پیشِ نظر ترجمہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے زیادہ واضح اور صاف نہیں ہے ۔ لایق مصنف نے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی مذہبی پالیسی کا سرسری تذکرہ کرنے کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی سے لے کر اب تک اس ملک میں جو مسلمان مفکر اور مشاہیر علماء پیدا ہوئے ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ مفکرینِ اسلام کا طریقِ فکر بھی بدلتا رہا ہے اور انھوں نے اس کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی تطبیق جدید حالات کے ساتھ کریں ۔ اس کے بعد ہندوستان کی موجودہ سیاسی تشکیل اور یہاں کے دستور کی سیکولر حیثیت پر روشنی ڈالی ہے اور یہ سوال اٹھایا ہے کہ اب کیا کرنا چاہیئے ؟ اگر بات یہیں تک رہتی تو نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا بلکہ بلاشبہ وقت کی ایک اہم ضرورت پر توجہ دلانے کی دعوت ہوتی ۔ امام ابو یوسف کا قول ہے کہ جو شخص اپنے زمانہ کے احوال سے واقف نہ ہو اس کے لئے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے ۔ اسی لئے بیدار مغز علماء اور روشن خیال سلاطینِ اسلام نے ہر دور میں اس کی کوشش کی ہے کہ وقت کے جدید مسائل و معاملات پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں غور و خوض کیا جائے اور ان کا ایسا حل تلاش کیا جائے کہ ایک طرف اسلام کی کسی اصل پر اس کی زد نہ پڑے اور دوسری جانب مسلمان جمود کا شکار ہو کر زندگی کی تگ و دو میں دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائیں یا کم

از کم وقت کے مطالبات کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی پیدا نہ کرسکیں۔ چنانچہ آج علمائے کرام کے ایک حلقہ میں فقہ کی تدوینِ جدید کا جو غلغلہ بلند ہے وہ درحقیقت اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ علاوہ بریں فقہ کے مسالکِ اربعہ میں سے فقہ حنفی کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز جس کے باعث اس کو عجم کے متمدن ممالک میں فروغ و عروج ہوا یہی ہے کہ وہ کبھی وقت کے نئے مسائل کا کامیاب حل تلاش کرلینے میں ناکام نہیں رہا۔

لیکن افسوس ہے کہ لایق مقالہ نگار نے بات یہیں تک محدود نہیں رکھی بلکہ اور آگے ترقی کرکے وہ سرے سے اسلام کے اصول اور اس کے بنیادی آئین و قوانین میں ہی کاٹ چھانٹ اور تراش و خراش کے قائل ہوگئے ہیں۔ چنانچہ شروع میں ہی لکھتے ہیں :-

"اب اس کی ضرورت ہے کہ شرعی اصول اور مذہب کے اس دعوی پر کہ خدا ہی قانون کا مصنف ہے تاریخی اور فلسفیانہ پہلو سے ناقدانہ نظر ڈالی جائے۔ اس تنقید میں اس امر کو واضح کرنا چاہیئے کہ سامی اقدام میں قانون کا منبع خاص طور پر خدا ہی کیوں سمجھا جاتا رہا۔ بعد کو اس کے کیا نتائج ہوئے۔ کس لئے اب دیگر اصول قانون۔ سیاسی نظریات اور بین الاقوامی تعلقات کے ذہنی ارتقار کے زیر اثر بتدریج اسلامی سوسائٹی میں مذہبی اور دنیاوی قانون کے مابین واضح امتیاز ہونا چاہیئے۔" (ص ۳)

"مقالہ نگار کو "اسلامی سوسائٹی میں مذہبی اور دنیاوی قانون کے مابین واضح امتیاز" پیدا کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اس کا جواب بھی خود انھیں کی زبان سے سُنیئے فرماتے ہیں

"راقم الحروف کو پورا یقین ہے کہ ایسے تمام انفرادی اور شخصی قوانین جو کسی قوم کی سماجی زندگی سے متعلق کسی قدیم اصول پر مبنی ہیں رفتہ رفتہ یا تو منسوخ ہوجائیں گے اور یا ان میں اتنی تبدیلی ہوجائے گی کہ قوانین کی ایک ایسی عام اسکیم کے ماتحت جو ہر شخص پر بلا لحاظ مذہبی اختلاف کے عائد ہو۔" (ص۲۵)

یہ امتیاز کیوں کر ہوسکتا ہے موصوف نے اس کا بھی جواب دیا ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے چند اصول بیان کئے ہیں جن میں سے پہلا اصول یہ ہے کہ "مذہب کے اصول و معتقدات کو قانون کے اصول و ضوابط سے الگ کیا جائے۔" (ص۲۷) اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مذہب کو صرف

عبادات تک محدود کر کے رکھ دیا جائے اور سماجی، اقتصادی، سیاسی اور دوسرے مسائل میں صرف ملکی قانون کی پیروی کی جائے تو ظاہر ہے کہ اسلام کا کیا ذکر کہ وہ تو دین اور دنیا دونوں ہی سے متعلق مکمل نظامِ زندگی کا نام ہے۔ دنیا کا کوئی زندہ مذہب بھی اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ کمال آتا ترک نے ٹرکی میں اس کا تجربہ کیا تھا لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ سرے سے مذہب ہی ختم ہو گیا۔ اور آج وہ مذہب وہاں پھر زندہ ہو رہا ہے۔ یہ تو کوئی بتائے کہ اس نے دنیوی اور سیاسی ترقیوں میں کون سا رخنہ ڈالا، جیساکہ ہم نے بتایا بے شبہ وقت کے جدید مسائل مثلاً بنیک کا سود، بیمہ، سرکاری قرضہ۔ قسطوں پر خریداری وغیرہ ان سب کا جواب اسلام کو دینا چاہیئے لیکن اسلام اس اصول کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ مذہب کو عام قانون سے الگ رکھا جائے ورنہ پھر مذہب کا وجود ہی باقی نہیں رہتا ہے غالباً آصف فیضی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ اگر آج ملک میں وراثت یا مبین الاقوامی شادی۔ یا شادی کے لئے بعض خاص خاص شرائط کا کوئی قانون بنتا ہے تو وہ صرف ہندوؤں کے لئے نہ ہو بلکہ اس کا اطلاق مسلمانوں پر بھی ہونا چاہیئے۔ اگر واقعی ان کا مطلب یہی ہے تو قطع نظر اس سے کہ کوئی مسلمان اس کو تسلیم نہیں کر سکتا سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہوا تو پھر سیکولرازم کی حقیقت کیا ہو گی؟ اور اس دردسری کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ایک غیر مذہبی قانون کو بے شک قبول کیا جا سکتا ہے لیکن شرط یہ ہی ہے کہ وہ کسی مذہبی اصول سے متصادم نہ ہو مثلاً انکم ٹیکس اور صنعتی و حرفتی قوانین نائنز ایکٹ۔ ایکویزیشن آف اموابیل پراپرٹی ایکٹ وغیرہ وغیرہ۔

جیساکہ شروع میں ہی کہا گیا ہے اس مقالہ کی زبان اور انداز بیان اس قدر الجھا ہوا ہے ——— ممکن ہے اُس کی وجہ یہ ہو کہ مصنف کھل کر اپنا مدعا ظاہر کرنے کی جسارت نہیں کر سکے اس لئے انھوں نے مجبوراً چبا چبا کر گفتگو کی ہے ——— کہ بعض جگہ تضاد بھی پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے بنیادی عقائد میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور نہ اس کی ضرورت ہے اور دوسری جانب وہ خدا کے وجود اور قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کے عقیدہ تک کو نظر ثانی کا محتاج قرار دیتے ہیں۔ (صلا۳) پھر موصوف نے شریعت اور علم الکلام

میں بھی التباس پیدا کر دیا ہے۔ شریعت نام ہے ان احکام و مسائل کا جو ایک انسان کی معاشی اور معادی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ احکام و مسائل مختلف قسم کے ہیں بعض فرض بعض واجب۔ اور بعض مستحب و مباح یا حلال حرام اور مکروہ ہیں۔ اس کے برخلاف علم الکلام نام ہے ان احکام کی نقلی و عقلی توجیہ کا جہاں تک توجیہ کا تعلق ہے تو بے شبہ جدید علوم و فنون کی روشنی میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ایک نیا علم کلام مرتب کریں اور اس میں جدید سائنس اور فلسفہ سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح یقین ہے کہ ہم اسلامی اصول حیات اور اس کی تعلیمات کو حق ثابت کرنے کے لئے زیادہ مؤثر، پائیدار اور قوی تر دلائل مہیا کر سکیں گے۔ لیکن جہاں تک شریعت کا یعنی اسلام کے ان احکام کا تعلق ہے جو قرآن و حدیث میں منصوص ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً قرآن نے وراثت کا، نکاح و طلاق کا، ماکولات مشروبات کا، شخصی حقوق کا، عبادات و معاملات کا جو قانون مقرر کر دیا ہے اور احادیث صحیحہ نے اس قانون کی جو تشریحات و تنقیحات متعین کر دی ہیں ان میں کوئی کسی قسم کی کتر بیونت یا ترمیم و تنسیخ نہیں کی جا سکتی۔ کیوں کہ یہ قوانین اسلام کے اصول موضوعہ ہیں اور ان میں تبدیلی کا حق سوائے بانی شریعت یعنی پیغمبر کے اور کسی کو نہیں ہے۔ ہاں بے شک اگر اسلام ایک جامع نظام زندگی اور ایک مکمل دین فطرت و انسانیت ہے تو اسے ہر مرحلہ پر یہ ضرور ثابت کرنا ہوگا کہ اس کی کوئی تعلیم اور اس کا کوئی قانون کسی بہتر سماجی، اقتصادی یا اجتماعی اصلاح کے مزاحم یا اس کے متناقض تو نہیں ہے۔ یہ کام علماء کے کرنے کا ہے اور انھیں لازمی طور پر کرنا چاہیئے۔ لیکن اسلام اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا ہے کہ چوں کہ کسی ملک کے مسلمانوں کو اس ملک کی دوسری قوموں کے ساتھ مل کر ایک عام سوسائٹی یا "متحدہ قومیت" بنانی ہے اس بنا پر مسلمان اپنے پرسنل لا سے دست بردار ہو جائیں۔ اور اندھادھند سوسائٹی کے عام قوانین کو اختیار کریں

اس بحث سے قطع نظر فاضل مصنف نے بعض کام کی اور مفید باتیں بھی کہی ہیں۔ مثلاً جدید علم الکلام کی ترتیب و تدوین۔ مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ۔ مذاہب کی تاریخی بنیادوں کا مطالعہ۔ سامی زبانوں کا مطالعہ اور ان کی مشترک لسانیت۔ نظریۂ تخلیق عالم کی از سر نو تشریح یہ تمام چیزیں وہ ہیں جن کی اس زمانہ میں اسلام کو ایک سائنٹفک حقیقت ثابت کرنے کے لئے بڑی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ مغل بادشاہوں کی مذہبی پالیسی کے بارہ میں انھوں نے یہ بڑی کھری اور کام کی بات لکھی ہے کہ "عام طور پر مغل بادشاہوں نے اپنی ہندو رعایا پر ہندو قانون عائد کیا اور مسلم رعایا پر اسلامی قانون۔ مسلمان بادشاہوں نے جو حنفی قاضی مقرر کئے ان کے ساتھ ہمیشہ پنڈت اور مفتی ہوتے تھے جو دھرم یا شریعت کے پیچیدہ مقدمات میں ان کی مدد کرتے تھے۔ (ص۴) اسی طرح اردو زبان کی نسبت اُن کا یہ ارشاد بہت قیمتی اور لائق قدر ہے کہ "مجھے یقین ہے کہ جس طرح اسلام کی ابتدائی تاریخ کا سمجھنا عربی زبان سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں ہے اسی طرح اسلامی نظر و فکر کی موجودہ رفتار کو سمجھنا اردو زبان سے واقفیت کے بغیر ناممکن ہے اس لئے کہ اس زبان میں مذہبی تالیفات فارسی یا ترکی سے زیادہ ہیں۔ (ص۳)

پھر یہ بھی مصنف کی بے تعصبی اور شرافت کی دلیل ہے کہ انھوں نے انتہا پسند جدید الخیال ہونے کے باوجود مولانا عبد الحئی فرنگی محلی اور مولانا شاہ اشرف علی رحمۃ اللہ علیہما جیسی قدامت پسند شخصیتوں کا ذکر بڑے ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ بہر حال اگر اس مقالہ کا فائدہ یہ ہوا کہ علمائے کرام محسوس کر سکے کہ اب ملک کے موجودہ حالات میں ہوا کا رخ کیا ہے اور ہمارا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اس وقت کس ذہنی کشمکش و

Registered No. D. 183

ندوۃ المصنفین کی ممبرشپ

۱- لائف ممبر کم سے کم ایک ہزار روپے یک مشت مرحمت فرمانے والے اصحاب اس حلقے میں شامل کئے جاتے ہیں، ایسے اربابِ ذوق کی خدمت میں بُرہان اور مکتبہ بُرہان اور ادارے کی تمام مطبوعات پیش کی جاتی ہیں، کتابوں کی جلد پر لائف ممبر کا نام نامی سنہری حرفوں سے ثبت کیا جاتا ہے۔

۲- معاونینِ خاص کم سے کم سو روپے سالانہ مرحمت فرمانے والے اصحاب حلقۂ معاونینِ خاص میں داخل کئے جاتے ہیں اور ان کی یہ اعانت عطیۂ خالص کے طور پر قبول کی جاتی ہے، ان حضرات کی خدمت میں بھی سال کی تمام مطبوعات اور بُرہان بغیر کسی معاوضے کے پیش کیا جاتا ہے۔

۳- معاونین اس حلقے کی سالانہ فیس تیس روپے ہے، معاونین کی خدمت میں سال بھر کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور بُرہان کسی مزید معاوضے کے بغیر پیش کئے جاتے ہیں۔

۴- معاونینِ عام معاونینِ عام کی سالانہ فیس بیس روپے ہے، ان کو سال کی تمام غیر مجلد مطبوعات دی جاتی ہیں اور بُرہان بلاقیمت دیا جاتا ہے۔

۵- احبّاء حلقۂ احبّاء کی سالانہ فیس دس روپے ہے، ان کی خدمت میں بُرہان بلاقیمت پیش کیا جاتا ہے اور ان کی طلب پر ایک فیس کے بدلے میں ایک سال کی غیر مجلد مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جاتی ہیں

قواعدِ رسالہ بُرہان

(۱) بُرہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں بُرہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلاقیمت بھیج دیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ دوسرے ملکوں سے گیارہ شلنگ (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر آنے۔

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کراکر دفتر بُرہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا